کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

سید کاظم رضا

کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

(افسانے، تراجم اور مضامین)

سید کاظم رضا

فکشن ہاؤس
۱۸۔ مزنگ روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
مصنف = سید کاظم رضا
مرتب = احمد ضیاء
پبلشرز = فکشن ہاؤس
18_ مزنگ روڈ' لاہور
فون 7249218-7237430
پروڈکشن = ظہور احمد خاں / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
کمپوزنگ = فکشن کمپوزنگ سنٹر' لاہور
پرنٹرز = اے۔ این۔ اے پرنٹرز' لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1999ء
قیمت = -/160 روپے

انتساب

اردو ادب کے خوش ذوق قارئین کے نام

مرتب:
احمد ضیاء

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ "کوئی نہ سر اٹھا کے چلے"

فہرست

تعارف	ڈاکٹر مبارک علی	7
سید کاظم رضا/ایک تاثر	احمد ضیاء	11
پبلشرز نوٹ		14
کلسری کلموہی		15
سراب		21
یخ بستگی کی رت		29
پس پردۂ گل		34
سفارش		46
زن بیزار		51
ساوتری		57
ہزاروں کا مال		63
درس نو		68
مہمان		73
یہ خاکی		78
مرکز ثقل		84
فاصلے		88
ایک پرانی کہانی		93
لاحاصل		100
ففتھ ڈائی مینشن		106
الارم		111
سوری بیٹے		115

کیکٹس	120
گل مہر	123
بابا کوکا شاہ	130
بارش	135
ورثہ	143
روشنی	147
شہر آرزو	156
احساس کا دریچہ	162
حصار ذات کا قیدی	166
"خدا پرست"	173
صبوحی کا ساتھی	174
قہقہہ	180
ناچو	186
حکم کا غلام	193
کوئی نہ سر اٹھا کے چلے	200
ایزیکا بیلچ	203
محبت کا سیارچہ	210
پیاس کا صحرا	219
اس کا گاؤں	234
تخلیقی عمل میں تجربہ کی اہمیت	243
چہار خواب ایک غلط چال	246
ساحر کی شاعری--- ایک رخ	252

تعارف

1960ء اور 1970ء کی دہائیوں تک حیدر آباد سندھ نے ادبی و ثقافتی ماحول کو برقرار رکھا۔ کالجوں میں ادبی انجمنیں ہوتی تھیں کہ جن کے تحت مشاعرے، تنقیدی نشستیں اور لکچر ہوا کرتے تھے۔ نہ صرف پاکستان کے دوسرے شہروں سے بلکہ ہندوستان سے بھی ادیب و شاعر آتے رہتے تھے۔ اس ماحول کو برقرار رکھنے میں یقیناً تعلیمی اداروں کا بڑا حصہ تھا کیونکہ ایک وقت تک ان ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو تعلیم کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ ان سرگرمیوں میں پیش پیش متوسط طبقے اور وہ بھی نچلے متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ امراء اور پیسے والے ان سرگرمیوں میں یا تو بہ حیثیت تماشائی کے شریک ہوتے تھے یا ان سے دور ہی رہتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ لوگ کہ جن کے پاس نہ ذرائع تھے اور نہ حکام بالا سے تعلقات، انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ادبی سرگرمیوں کو زندہ رکھنے میں صرف کر دیا۔ کبھی کبھی یہ سوال تو آتا ہے کہ وہ کون سا جذبہ تھا کہ انہیں سرگرم عمل رکھتا تھا؟ کچے گھروں میں رہنے والے، محنت و مزدوری کرکے بچوں کا پیٹ پالنے والے فائلوں میں ڈوبے کلرک اور چھوٹے چھوٹے کلاس روموں میں پڑھاتے اسکول ٹیچر جب اپنی ملازمتوں سے فارغ ہوتے تو دوستوں کی محفل میں آتے، اپنی نئی لکھی غزلیں سناتے، یا افسانے پڑھتے اور ہنسی خوشی اس جذبہ سے واپس گھر جاتے کہ انہوں نے ادب میں بے بہا اضافہ کر دیا ہے۔

حیدر آباد میں کئی ادبی مجلسیں اور انجمنیں تھیں۔ یہ بن تو جاتی تھیں، مگر مشکل ہمیشہ یہ آتی تھی کہ انہیں نشستوں کے لیے جگہ نہیں ملتی تھی۔ کبھی یہ کسی اسکول کی انتظامیہ سے درخواست کرتے، کبھی کسی آفس میں اس کا انعقاد کرتے۔ اگر موقع مل جاتا تو سال میں ایک آدھ مشاعرہ یا افسانہ کی نشست بھی منعقد کر لیتے تھے۔ ایسی مجلسوں میں سے ایک مجلس مصنفین تھی۔ ابتداء میں تو اس کا نام "تحریک" تھا مگر جب اصغر خاں نے "تحریک استقلال" سیاسی جماعت بنائی تو انہوں نے نام بدل کر "مجلس مصنفین" کر لیا۔ پروفیسر خالد وہاب اس

کے صدر تھے' اور ان کے پرجوش کارکنوں میں سے ایک کاظم رضا تھے۔

میں جب 1976ء میں جرمنی سے واپس آیا ہوں تو مجلس مصنفین اپنے شباب پر تھی۔ اپنی ادبی نشستوں کے لئے انہیں لطیف آباد یونٹ 7' میں میونسپل لائبریری ملی ہوئی تھی کہ جس کے لائبریرین خضر صاحب ادب کے دلدادہ تھے۔ یہاں لمبی میز کے ارد گرد کرسیوں کی خاصی تعداد تھی۔ ہفتہ وار نشست ہر جمعہ کو چھٹی والے دن ہوا کرتی تھی کہ جس میں حیدر آباد سندھ کے سبھی ممتاز شاعر و ادیب شریک ہوا کرتے تھے۔ کاظم رضا ان خاموش کارکنوں میں سے تھے کہ جو اس مجلس کی سرگرمیوں کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔

میرا خیال ہے کہ کاظم رضا نے کوئی زیادہ خوش حالی کے دن نہیں دیکھے۔ وہ حیدر آباد چمبرز آف کامرس میں ملازم تھے اس تنخواہ میں ان کا گزارہ مشکل سے ہوتا ہوگا مگر انہوں نے روپیہ کمانے کی تگ و دو کرنے کے بجائے ادب کی خدمت کو ترجیح دی۔ انہوں نے طبع زاد افسانے بھی لکھے ہیں اور ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان افسانوں کو انہوں نے مجلس مصنفین کی تنقیدی نشستوں میں پیش کیا۔ جو افسانے میں نے سنے' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے زندگی کو جن دکھوں اور اذیتوں کے ساتھ دیکھا ہے' وہ احساس ان کے افسانوں میں جھلکتا ہے۔ زندگی کے وہ ذاتی دکھ اور حالات کی کشمکش کا تجربہ' کہ جہاں امید کی روشنی گم ہوتی نظر آتی ہے۔وہ ان تمام اذیتوں اور دکھوں کو برداشت کرتے رہے کیونکہ تخلیق کا جذبہ کبھی کبھی اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ اس میں تمام غم اور فکریں ڈوب کر ختم ہو جاتی ہیں۔

میں اکثر حیدر آباد چمبرز آف کامرس کے سامنے سے گزرتا تو کبھی کبھی ان کے آفس میں چلا جاتا۔ میری ان سے بہت زیادہ بے تکلفی اور دوستی تو نہیں تھی' مگر ملنا جلنا ضرور تھا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ان سے ادب پر گفتگو ہوتی۔ اردو میں شائع ہونے والے ادبی رسالے ان کے پاس آتے تھے بلکہ اکثر رسالوں کو ان کے خریداروں تک پہنچاتے بھی تھے۔ اور نئے خریدار بناتے بھی تھے۔ آفس کے کام کے ساتھ ساتھ ادب کا ایسا ہی رشتہ تھا کہ جیسے حسرت موہانی کے لئے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

میں 1989ء میں لاہور چلا آیا۔ لیکن جب کبھی حیدر آباد جاتا تو ان کے بارے میں خبر مل جاتی تھی۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ سخت بیمار ہو گئے۔ اس ملک میں ان لوگوں کے لئے کہ جن کے پاس ذرائع نہ ہوں' بیماری بڑی مہلک ہوتی ہے کیونکہ پیسہ کی اہمیت صحت سے زیادہ

ہوتی ہے۔ میری آخری ملاقات ان سے چیمبرز کے آفس ہی میں ہوئی' ایک عرصہ بعد دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا لگا کیونکہ بیماری نے ان کو بدل کر رکھا دیا تھا۔ میں نے پوچھا کیا ہو رہا ہے تو کہا کہ سندھی کے کچھ افسانوں کا ترجمہ کیا ہے۔ میں نے کہا اگر مناسب سمجھیں تو مجھے بھجوا دیں میں فکشن ہاؤس سے چھپوا دوں گا۔ انہوں نے حامی بھر لی۔ مگر وہ افسانے بھجوائے نہیں۔

ایک دن حیدر آباد سے شکیل پٹھان کا فون آیا کہنے لگے کہ کاظم رضا کا انتقال ہو گیا۔ یہ سن کر میں خاموش ہو گیا۔ شکیل نے بتایا کہ آخر وقت میں بڑے پریشان رہے۔ چیمبرز نے بھی ملازمت سے فارغ کر دیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ دنیا ہے۔ ایک اور ادب کا مخلص خاموشی سے رخصت ہو گیا۔ شاید چند جاننے والوں نے اظہار افسوس کیا ہو گا' پھر خاموشی۔

اور یوں بھی اب حیدر آباد کا نقشہ بدل گیا ہے۔ نہ مجلس مصنفین ہے' نہ میونسپلٹی کی لائبریری' نہ خضر صاحب' اور نہ ہی کاظم رضا۔

اب لوگ یہی سوچتے ہیں کہ ادب کی خدمت کیوں کی جائے' کیوں نہ زندگی کو خوش حال بنایا جائے اور آخر اس میں خرابی بھی کیا ہے۔

جب احمد ضیاء نے جو ان کے ساتھ مجلس میں شریک تھے۔ مجھے بتایا کہ وہ کاظم رضا کے افسانوں کا ایک مجموعہ چھاپ رہے ہیں۔ تو مجھے خوشی ہوئی کہ اس بھری دنیا میں کوئی تو ہے کہ جس نے کاظم رضا کو یاد رکھا۔ مجموعہ چھپے تو شاید حیدر آباد سندھ اور اس کے باسیوں کو بھی کاظم رضا یاد آتے رہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی

ستمبر 1999ء لاہور

سید کاظم رضا/ایک تاثر

حکیم لقمان نے ایک مرتبہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "بیٹے زندگی کے میلے میں ایک سچا اور اچھا دوست ضرور تلاش کرنا کہ سچا دوست اس درخت کی مانند ہوتا ہے جو زندگی کی تیز دھوپ میں ہمیں سایہ بھی فراہم کرتا ہے اور شیریں پھل بھی دیتا ہے۔"

میرے والد نے تو مجھے اس قسم کی کوئی نصیحت نہیں کی لیکن انہوں نے یہ مہربانی ضرور کی کہ مجھے دوچار لفظ پڑھنے اور برتنے کی صلاحیت عطا کر دی۔

یہ ہی وجہ ہے کہ میں نے حکیم لقمان کی نصیحت پڑھی بھی اور اس پر عمل بھی کیا۔

میرے ایک' دو' تین سچے اور اچھے دوستوں میں سے ایک سید کاظم رضا بھی ہیں۔

یہ غالباً" 1969ء کے آخر کی بات ہے کہ ایک رات سید کاظم رضا اور انور کیف میرے غریب خانے پر تشریف لائے' باہم مشورے کے بعد ایک پروگرام ترتیب دیا۔

یہ پروگرام حیدر آباد کے نام نہاد اساتذہ اور جھوٹے شاعروں' ادیبوں کے خلاف ایک طرح کا اعلان جہاد تھا۔

سو میں نے "لبیک" کہا اور ہم سب نے مل کر تحریک کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک بعد میں مجلس مصنفین بنی اور آج بھی موجود ہے۔

ہمارے پروگرام میں پرانوں کی مخالفت ہی نہیں بلکہ نئے لوگوں کی حمایت بھی شامل تھی۔

مجھے خوشی ہے کہ آج حیدر آباد کے نئے لکھنے والوں کی ایک پوری کھیپ شعور کی دولت سے مالا مال ہے۔ اور خلوص دل کے ساتھ ادب کی تخلیق میں منہمک ہے۔

یہ سید کاظم رضا کی بے لوث دوستی اور خلوص کی ایک بڑی مثال ہے کہ حیدر آباد کے نئے لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد خواہ وہ ان کی تنظیم مجلس مصنفین میں شامل ہو نہ ہو ان کی محبت اور تعلق کی مداح ہے۔

سید کاظم رضا کی شخصیت کا یہ دلکش پہلو تھا کہ جب آج کی تقریب کے دعوت نامے

کے مسودے کی تیاری کا وقت آیا تو سرور بارہ بنکوی کا یہ شعر اس دعوت نامے کا سرنامہ بنا۔

"جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں"

زندگی سے عشق پر مجبور کر دینے والے سید کاظم رضا بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں۔

یوں تو انہوں نے بے شمار ترجمے بھی کیے ہیں' جن کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ اور انہوں نے دل کو چھو لینے والی شاعری بھی کی۔ لیکن یہاں میں صرف ان کے افسانوں اور افسانوں کے موضوعات پر بات کروں گا۔

اس مرحلے پر مجھے ان کا ایک افسانہ بڑی شدت سے یاد آ رہا ہے۔ جس کا عنوان تھا۔ "گل مہر"

کہانی کچھ یوں تھی کہ "شہر کی بلدیہ کے افسران ایک درخت پر برہم تھے جو ایک شخص کے دروازے پر تھا اور اس شخص کو بے حد عزیز تھا۔ بلدیہ والے اس درخت کی اہمیت اور افادیت سے بے نیاز اس کو کاٹنے کی فکر میں اور وہ اکیلا آدمی اس کو بچانے کی تگ و دو میں۔

اس افسانے میں سید کاظم رضا نے افسر شاہی اور اس کے کھوکھلے ذہن کی جس انداز میں نشاندہی کی ہے۔ انسان کی حس جمال کو اپنی آسودگی جاں کے لئے جس انداز سے لڑتے ہوئے دکھایا ہے۔ وہ اپنی جگہ بڑا ہی متاثر کن عمل ہے۔ اس افسانے میں سید کاظم رضا کا فن اپنے پورے عروج پر ہے۔

سید کاظم رضا نہ تو منٹو کی طرح بے باک قلمکار ہیں اور نہ ہی ان کے افسانے میں انتظار حسین کی طرح شہر گمشدہ کی تلاش کا عمل ہے۔

سید کاظم رضا کا اپنا ایک انداز اور انداز نظر ہے۔

وہ زندگی کو آدمی کو اور کائنات کو جس رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اسی رنگ میں پیش کر دیتے ہیں۔

سادگی ان کی تحریر کا خاصہ ہے اور برجستہ جملے ان کی تحریر کی خوبی ہیں۔

سید کاظم رضا نے جس عمر میں افسانے لکھے "اور لکھ رہے ہیں۔"

عام طور پر لکھنے والے' عشق اور عاشقی اور جاناں کے ہجر میں صفحات کے صفحات سیاہ

کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا ہے اور پڑھا ہے کہ کاظم رضا صاحب کے موضوعات ہمیشہ زندگی اور اس کے روزمرہ کے مسائل سے ہم آہنگ رہے ہیں۔ معاشرے میں ہونے والی بڑی بڑی ناانصافیاں اور گلی کوچوں میں پرورش پانے والی ذرا ذرا سی کمینگیوں کی نشاندہی ان کے موضوعات میں شامل رہی ہے۔

ہما ا معاشرہ رنگ رنگ کی برائیوں اور طرح طرح کے اوہام کا شکار معاشرہ ہے۔

سید کاظم رضا کے افسانوں کے کردار اسی معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ جہاں نفرتیں بھی ہیں اور محبتیں بھی' جہاں انسان خدائی دعویٰ بھی کرتا ہے اور جھوٹے خداؤں کے سامنے سجدہ ریز بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے قلم کی نوک سے معاشرے کے پکتے پھوڑوں کو چیرا بھی لگاتے ہیں اور زخموں کے لئے مرہم کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

ہر سچے اور بڑے فنکار کی طرح کاظم رضا کے موضوعات بھی زیادہ تر معاشرتی رہے ہیں۔

سید کاظم رضا نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس طلسم سامری کو توڑنے کی شعوری کوشش کی ہے جو آج سے نہیں صدیوں سے ہمارے ذہنوں اور ہماری فکر پر مسلط ہے۔

مجھے امید ہے کہ سید کاظم رضا کا فن ایک ترقی پسند فنکار کی طرح ہمیشہ انسان اور انسان کو درپیش مسائل کے لئے وقف رہے گا۔ اور وہ کائنات میں تلاش حق کا سفر ہمیشہ جاری رکھیں گے۔

احمد ضیاء

سید کاظم رضا کے ساتھ ایک شام
منعقدہ 12 جون 1983ء پریس کلب
نواب شاہ میں پڑھا گیا ایک مضمون

پبلشرز نوٹ

سید کاظم رضا مرحوم ایک باشعور اور ترقی پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ برصغیر کے ممتاز اور موقر ادبی جرائد میں ان کے افسانے ایک عرصہ تک شائع ہو کر اردو ادب کے قارئین سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔

وہ حیدر آباد سندھ میں رہتے تھے۔ حیدر آباد کے ادبی، سماجی اور ثقافتی حلقوں میں سید کاظم رضا کی خدمات کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔

اس کتاب کی اشاعت فکشن ہاؤس لاہور کے اس اشاعتی پروگرام کا ایک حصہ ہے جو وہ شاہکار اردو ادب کی اشاعت اور اس کی توسیع کے لئے رکھتا ہے۔

ہم اس کتاب میں شامل افسانوں کے مسودے مہیا کرنے پر سید کاظم رضا مرحوم کی بیگم کے بھی شکر گزار ہیں اور مرحوم کے دوست اور اس کتاب کے مرتب احمد ضیاء بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب مرتب کرکے اپنی دوستی کا حق خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

ہم خصوصی طور پر ممتاز تاریخ داں اور محقق ڈاکٹر مبارک علی صاحب کے بھی تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے سید کاظم رضا مرحوم کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تعارف تحریر فرما کر قارئین اور افسانہ نگار کی شخصیت کو زیادہ قریب کر دیا ہے۔

ظہور احمد خاں/ رانا عبدالرحمٰن

کلسری کلموہی

اس کی آنکھ کھلی تو دھواں دھار بارش ہو رہی تھی! اس نے آنکھیں مل کر دیکھا تو لالٹین کی ملگجی روشنی میں آنگن ایک چھوٹا سا تالاب نظر آیا جس میں خالی ڈبے' المونیم کی پتیلیاں' لوٹے اور بچوں کے کھلونے چھوٹی چھوٹی بے سہارا کشتیوں کی مانند ہچکولے کھاتے ہوئے تیر رہے تھے۔

"کمال ہے" اس نے موندی موندی آنکھوں سے آسماں کی تاریکیوں میں جھانکتے ہوئے سوچا۔ "یہاں کا موسم تو کبھی اتنا غیر یقینی نہیں ہوتا تھا' کب یہ بادل آئے کب بارش شروع ہوئی۔ اسے تو پتہ نہ چل سکا تھا۔ سونے کے لئے لیٹے تھے تو آسمان بالکل صاف تھا' دور دور تک بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا تھا۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اب یوں بارش کی لڑی لگی ہوئی تھی کہ شاید صبح تک ٹوٹنے کا نام ہی نہ لے۔ "واہ میرے مولا تیری شان نرالی ہے۔"

اس نے ایک طویل جماہی لی اور بستر پر دراز ہو گیا مگر اب اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ اپنی نیند پوری کر چکا تھا یا اس اچانک بے موسم کی بارش نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔

لمحہ بھر کو بجلی کا ایک کوندا لپکا اور تاریکی کا سینہ چیرتا چلا گیا۔ اس ایک لمحہ میں اس نے دیکھا کہ آنگن کے اس کونے میں رکھی ہوئی کبوتروں کی کابک شرابور ہو چکی ہے۔ وہ گیند کی طرح اچھل کر پلنگ سے زمین پر آ گیا۔ اور چھپا چھپ کرتا ہوا پانی کے تالاب میں بھاگتا چلا گیا۔ کابک بھاری نہیں تھی اس نے جلدی سے اسے اٹھایا اور اسی طرح بھاگتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ برآمدے کے محفوظ کونے میں کابک کو رکھ کر اس نے جلدی سے ڈھکنا کھولا۔ سب سے اوپر کے خانے میں کلسری کبوتری بند تھی۔ یوں اچانک رات گئے جگا دیئے جانے پر کبوتروں نے زور زور سے گٹک کر احتجاج کرنا شروع کر دیا مگر کلسری چپ چاپ اپنے خانے کے ایک کونے میں دبکی بیٹھی رہی اس نے ہاتھ بڑھا کر کبوتری کو پکڑا تو اس

ہوا کہ اس کا جسم کبھی کا بے جان ہو چکا ہے' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کلسری کے سر اور اکڑے ہوئے جسم کو دیکھتا رہ گیا موت اپنا وار کر چکی تھی۔ اسے کبوتری کے مر جانے کا جتنا افسوس تھا اتنا ہی اپنی تدبیروں کے ناکام ہو جانے کا رنج تھا۔ کبوتری کی جان بچانے کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ جب بلی اسے اپنی منہ میں دبا کر بھاگی تھی وہ اس کا پیچھا کرتا ہوا گھر سے باہر گلی میں نکل آیا تھا اور گلی کے اندھیرے میں کبوتری کے پھڑ پھڑانے کی آواز سے نشانہ لے کر بلی پر پتھروں کی بارش کرتا رہا تھا۔ اس عالم میں اگر کوئی اسے دیکھ لیتا تو شاید یہی سوچتا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے لیکن اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی۔ وہ بہرطور اپنی کلسری کبوتری کو بلی کے پنجے سے چھڑا لینا چاہتا تھا۔ ایک ثانیہ کے لئے بھی اس نے بلی کو ٹک کر بیٹھنے نہ دیا۔ اور آخر بلی کو اسی میں خیریت نظر آئی کہ کبوتری کو چھوڑ کر کسی تاریک گوشے میں چھپ جائے۔

کبوتری بلی کے منہ سے تو چھٹ گئی مگر خوف اور زخموں سے نڈھال ہو گئی تھی۔ رات میں کبوتری کے زخموں کی مرہم پٹی تو کیا ہوتی اس نے ہلدی اور کبوتر کی بیٹ آمیز کر کے اچھی طرح ان زخموں پر لگا دی۔ پھر وہ تمام رات اس نے جاگ کر کاٹ دی وہ بار بار اٹھ کر جاتا اور کابک کھول کر دیکھتا کہ کہیں کبوتری کا دم تو نہیں نکل گیا مگر وہ سہمی سہمی سی ایک کونے میں بیٹھی نظر آئی تو اسے کچھ اطمینان ہو جاتا۔ لیکن اس اطمینان میں بھی کس قدر دکھ شامل تھا۔ وہ سوچتا' اس وقت کبوتری کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہو گی مگر وہ اپنی تکلیف کا اظہار نہیں ہونے دیتی۔ بلی کی دہشت سے وہ سہم کر رہ گئی ہے۔

دوسرے روز وہ ایک ماہر کبوتر باز کے پاس گیا اور کبوتری کے لئے مرہم لے کر آیا اسی روز سے وہ زخمی کبوتری کی تندہی سے خدمت کر رہا تھا مگر زخموں میں افاقے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس کی فطرت کا یہ عجیب عنصر تھا کہ وہ گھر کے کسی بھی فرد کی تکلیف اور بیماری میں خود بیمار سے زیادہ بے چین ہو جاتا تھا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہی ہو گی کہ کسی نہ کسی طرح بیمار کو چین نصیب ہو جائے۔ بیمار کی دوا' غذا' سونے جاگنے اور دیگر تمام ضروریات کا اس شدت سے خیال رکھتا اس کی تیمار داری سے عاجز آ جاتے۔

کلسری کی موت پر اسے یوں لگا کہ جیسے کوئی عزیز اس جہاں سے رخصت ہو گیا' وہ گم سم اس کے مردہ جسم کو تکتا رہا---- پھر معاً" اس کے ذہن میں خیال کا ایک نیا دھارا پھوٹا اور اس کے احساسات کی رو اک اور ہی سمت میں مڑ گئی سوچا چلو یہ بھی کوئی برا نہیں

ہوا کہ کلسری مرگئی اس کے زخموں میں کسی قدر جلن اور تکلیف ہو گی---- پھر ان زخموں سے زیادہ اذیت ناک تو وہ دہشت تھی جو ایک دفعہ بلی کے منہ میں آ جانے کی وجہ سے اس کے چھوٹے سے دل پر بیٹھ گئی تھی' چلو اچھا ہوا وہ مرگئی "اس نے جیسے اپنے آپ کو دلاسہ دیا۔" وہ اگر زندہ رہتی تو ان اذیتوں سے کہاں چھٹکارا پا سکتی تھی۔ اس نے کبوتری کے اکڑے ہوئے جسم کو اس کے خانے میں رکھا اور ڈھکنا بند کر دیا۔

بادل ٹوٹ کر برس رہا تھا۔

وہ اٹھ کر اپنی چارپائی کی طرف بڑھا تو اس کی نگاہ نوشابہ پر آ کر ٹھہر گئی۔ نوشابہ اپنے پلنگ پر گٹھری بنی بیٹھی تھی اس کا چہرہ کسی اندرونی درد کی وجہ سے اینٹھا ہوا تھا' آنکھوں میں دیوانہ پن کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔ وہ اپنے پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے غیر فطری انداز میں سانس لے رہی تھی۔ اس کا جسم رہ رہ کر کانپ جاتا تھا اور وہ ہلکے ہلکے کراہ رہی تھی۔

نوشابہ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا اور سسکیوں سے رونے لگی۔

"یہ معاملہ ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "اچھا ہے آج اس قدر طوفانی موسم ہے۔ پاس پڑوس میں کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہو گی۔"

زندگی یہ رخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا' تنویر بھولا بھالا لڑکا نظر آتا تھا۔ اس نے بتایا تھا دنیا میں اس کا کوئی مونس و غم خوار باقی نہیں بچا ہے' ماں باپ' بہن بھائی سب ہی فسادات میں مر چکے ہیں اس وقت وہ چھوٹا سا بچہ تھا' ایک شریف خاندان نے اس کی پرورش کی تھی۔ میٹرک کے بعد اس نے ایک دفتر میں کلرکی کر لی تھی۔ اب بی۔ اے کرنے کے بعد نئے شہر میں نئی ملازمت تلاش کرنے کے لئے آیا تھا تنویر کی دکھ بھری داستان سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اسے اپنے ہمراہ گھر لے آیا۔

"تمہیں ملازمت دلانا تو میرے بس کی بات نہیں ہے؟" اس نے تنویر سے کہا تھا۔

"ہاں میرا گھر حاضر ہے' روکھی سوکھی جو ہم کھاتے ہیں' حاضر ہے۔"

"آپ کو تکلیف ہو گی' آپ یہ زحمت نہ کریں تو اچھا ہے۔" تنویر بولا۔

"یہ تم نے اچھی بات کہی" وہ بولا۔ "ہم پہلے ہی کونسے سکھ میں ہیں جو تمہارے آنے سے کوئی تکلیف ہو جائے گی۔ میں اگر اس وقت تمہارے لئے کچھ نہ کر سکا تو اپنے ساتھ بڑا

ظلم کروں گا۔ میرا ضمیر مجھے زندگی بھر ملامت کرتا رہے گا۔"

اچانک نوشابہ کی گھٹی گھٹی چیخ ابھری۔

"کیا بات ہے بیٹی۔" وہ مضطرب ہو گیا۔

"بابا۔۔۔۔!" وہ چلائی اور پھر اسے ہچکیاں بندھ گئیں۔

"گھبراؤ مت' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ لپک کر اپنی بیوی کے پلنگ کے پہنچا' اس کا شانہ ہلا کر اسے جگایا اور کہنے لگا۔ "اٹھو' نوشابہ بڑی تکلیف میں ہے اسے سہارا دو۔" پھر اس نے دھیمی آواز میں بیوی کو سمجھایا۔ "کوئی سخت بات مت کہنا۔ اس وقت اسے ہمدردی اور محبت کی ضرورت ہے۔"

نوشابہ کی ماں اسے سہارا دے کر کمرے کے اندر لے گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہ برآمدے میں مبہوت کھڑا رہ گیا۔

بارش بڑی یکسانیت سے برس رہی تھی۔

یہ کتنا انوکھا حادثہ تھا کہ آج اس کا ضمیر اس بات پر ملامت کر رہا تھا کہ اس نے ایک انسان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کیوں کیا۔ تنویر اس گھر میں رہتا رہا اور پھر ایک دن اچانک غائب ہو گیا۔ تنویر کے اس طرح غائب ہو جانے پر اسے تعجب بھی تھا اور تشویش بھی۔ وہ گھر کے ہر فرد سے کرید کرید کر پوچھتا مگر کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کیوں گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ اور جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا رقص کرنے لگا' اسے یوں لگا' جیسے ابھی ابھی بجلی گری ہو اور اس کا سب کچھ جلا کر راکھ کر گئی ہو۔

نوشابہ کے بطن میں تنویر کا بچہ پرورش پا رہا تھا۔

نوشابہ کتنی اچھی لڑکی تھی' سیدھی سادھی' بھولی بھالی معصوم جیسے کلسری کبوتری۔ اور اب اس کی معصومیت ہی اس کا آزار بن گئی تھی' بھولپن نے اسے ڈس لیا تھا' سادگی میں وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار گئی تھی۔

وہ نوشابہ کو دیکھتا تو جیتی جاگتی نوشابہ کے پس منظر میں ایک اور نوشابہ کا ہیولا ابھر آتا' پژمردہ' اداس اور دنیا کی ٹھکرائی ہوئی اس کے ماتھے پر ناکردہ گناہوں کے داغ جل رہے ہوتے' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے رواں ہوتے' وہ ہر طرف یاس سے تکتی' وہ جس طرف بڑھتی دھتکار دی جاتی۔ اس آنکھوں میں یاس کے سائے ہوتے' التجا کی شمعیں ہوتیں مگر وہ جس کے آگے ہاتھ پھیلاتی رہی۔ اس کی ہتھیلی پر انگارے رکھ دیتا اور وہ درد کی

شدت سے بلبلا کر رہ جاتی۔

پھر کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے ایک اور ہیبت ناک منظر آتا' محلے کے بچے اپنی جھولیوں میں پتھر بھرے اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں' ہر طرف سے اس پر پتھراؤ ہو رہا ہے۔ لوگ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں۔ "اسے دیکھو یہ ایک بے غیرت لڑکی کا باپ ہے' اس کے گھر میں ایک حرام کا بچہ پرورش پا رہا ہے---- حرام کا بچہ---- حرام کا بچہ۔" یہ صدائیں کھولتے ہوئے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں ٹکراتی۔ وہ اپنی کہنیوں کے درمیان اپنا سر چھپا کر پناہ کی تلاش میں بھاگتا مگر اسے کہیں بھی امان نہ ملتی۔ جسم پر سنگریزوں کی بارش ہوتی۔ کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ قطرہ قطرہ ٹپکتا رہتا۔ وہ دیوانہ وار چلا اٹھتا۔ "ظالمو! مجھے کیوں سنگسار کرتے ہو' میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" اور پھر وہ فیصلہ کرتا کہ اب اور کرب برداشت نہیں کرے گا' وہ نوشابہ کا گلا دبا دے گا۔ مگر وہ سامنے آتی تو اس کے حوصلے شل ہو کر رہ جاتے' نوشابہ آج بھی کبوتری کی معصوم اور بھولی بھالی تھی۔ کیا وہ اس لڑکی کی زندگی برباد ہو جانے دے۔ اس کے خیالات کا دھارا الٹے رخ بہنے لگا۔ اس سوال کا ہر مرتبہ اسے ایک ہی جواب ملا تھا---- "اس نے زندگی میں ابھی دیکھا ہی کیا ہے' اس کی زندگی کی حفاظت لازمی ہے۔"

وہ سوچ میں گم ہوتا تو اس کی نگاہوں میں کچھ سنجیدہ چہرے ابھر آتے تجربات کی جھریوں سے آراستہ چہرے۔ وہ زیر لب تبسم کے ساتھ اسے دیکھتے اور کہتے "اسے دیکھو یہ بھلائی کرنے چلا تھا۔ تنویر نے اسے وہ سبق دیا ہے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔" مگر وہ سوچتا کہ اگر تنویر اب بھی آ جائے تو وہ اسے معاف کر دے گا یوں چپ چاپ فرار ہونے کے بجائے اگر وہ اس سے سب کچھ کہہ دیتا تو وہ اس کی شادی نوشابہ سے کر دیتا۔ اب تو نوشابہ اس کے لئے ہی نہیں' اپنے لئے بھی ایک عذاب بن گئی تھی' دن بھر وہ دروازہ بند کئے کمرے میں پڑی رہتی۔ محلے والوں کے لئے وہ اپنی نانی کے گھر گئی ہوئی تھی---- ابھی تک کسی کو کانوں کان بھی اس حادثے کا علم نہ تھا۔ مگر ہر رات اسے اپنے سینے پر جھولتی ہوئی وہ تلوار نظر آتی جو کچے دھاگے کے سہارے لٹک رہی ہو۔ کسی بھی لمحے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح محلے بھر میں پھیل سکتی تھی۔ اور پھر اس کی شرافت' نجابت اور عزت سب بھسم ہو کر رہ جاتی۔ وہ سوچتا بچے کی پیدائش کے وقت تو یہ بات چھپائی جا سکتی ہے۔ مگر پھر کیا ہو گا---؟ پھر اسے خیال آیا کہ اس گھر کی ساری پریشانی' ساری سیاہ بختی اور نوشابہ کا سب سے بڑا

دشمن وہ بن بلایا مہمان ہے جو نوشابہ کی کوکھ میں پرورش پا رہا ہے۔ اور اگر یہی حقیقت تھی تو اس بچے کو اس خاندان کے مستقبل سے کیسے خارج کرے' اب اس کی بے خواب راتوں میں یہ سوال اس کا تعاقب کرتا رہتا۔

بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بند کمرے کے اندر سے نوشابہ کی دبی دبی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ زندگی کی تخلیق کے کرب میں مبتلا تھی ____ اور ادھر برآمدے میں وہ ایک ان جانے کرب سے ہراساں تھا۔

آسمان کی تاریکیوں سے ایک شرارہ ٹوٹ کر زمین کی طرف لپکا۔ اتنی زور کا کڑاکا ہوا کہ در و دیوار لرز گئے۔ کہیں قریب ہی بجلی گری تھی---- اور پھر اچانک بارش رک گئی۔

چند ثانیوں بعد کمرے کا دروازہ کھلا' نوشابہ کی ماں اپنے ہاتھوں میں گوشت کا لوتھڑا لئے باہر آئی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

اس نے گوشت کے لوتھڑے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بچی کے ننھے منے نازک سے گلے کو دبا دیا۔ زندگی کی ایک ننھی سی کرن لحہ بھر کو چمک کر لامحدود تاریکیوں میں ڈوب گئی۔

پھر وہ کھرپا اٹھا کر گیلے صحن میں نکل آیا۔ مگر نیم کی جڑ کے پاس پہلے ہی ایک گڑھا موجود تھا۔ بارش کے پانی سے زمین بیٹھ گئی تھی' اس نے بچی کو زمین کے پھیلے ہوئے آغوش میں دے دیا۔ پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا۔ وہ کابک سے کلسری کی لاش نکال لایا اور اسے بھی اس بچی کے پہلو میں لٹا دیا۔ جب وہ زمین ہموار کر چکا تو وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ ملنے لگا اور اس کے ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ کر گیلی مٹی اس چھوٹی سی قبر پر آنسوؤں کی طرح ٹپکتی رہی۔

سراب

"مبارک ہو!" بیگم انصاری نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ!" طارق نے ایک بڑے سے کپ کو سنبھالتے ہوئے مسز انصاری کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ نرم، گرم اور ملائم ہاتھ جیسے الجھے ہوئے ریشم کے تاروں کا گچھا۔

یکایک پنڈال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔

"یہ سب تمہارے پرستار معلوم ہوتے ہیں۔" بیگم انصاری نے کہا۔

طارق نے مڑ کر دیکھا، خوشی سے دمکتے ہوئے چہروں کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"یہ سب میرے دوست ہیں!" وہ بولا۔

"ہم تو آپ کے دوست ہی ہیں" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

طارق کو اپنے ہاتھ پر بیگم انصاری کی گرفت کچھ سخت ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک اجنبی چمک تیر رہی تھی۔ کچھ ایسی چمک جو ایک کتے کی آنکھوں میں اس وقت آ جاتی ہے جب وہ دور پڑی ہوئی کسی ہڈی کو تک رہا ہو۔ اور اس ہڈی تک پہنچنا اس کے بس میں نہ ہو۔

بیگم انصاری کی بات کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا، خوف کی ایک لہر سن سے اس کے جسم میں لہراتی چلی گئی، اسے محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے کی طرف دوڑتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ڈائس سے نیچے اتر آیا۔

دوسرا نام پکارا گیا تو اس نے سوچا "دیکھتا ہوں اس کے ساتھ، بیگم صاحبہ کیسے ملتی ہیں، یا انہیں مجھ میں کوئی خاص بات نظر آئی تھی۔۔۔۔"

دوسرا لڑکا ڈائس پر پہنچا تو انہوں نے اس کا انعام اس کے حوالے کیا۔ بد دلی اور بے رخی سے ہاتھ ملایا اور اگلا نام پکارے جانے کا انتظار کرنے لگیں۔

"تو یہ مجھی پر خاص توجہ تھی!" اس نے سوچا۔ "اور ابھی مجھے کئی انعام لینے کے لئے

ان کے پاس جانا پڑے گا۔" وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے پانی ہو گیا۔ "ان کو یہ بھی خیال نہیں کہ کتنی آنکھیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اگر کسی نے ان کی آنکھوں کی چمک کے مفہوم کو پڑھ لیا تو کیا ہو گا۔ ان کا کیا بگڑے گا۔ لڑکے میرا جینا حرام کر دیں گے۔ انہیں کیا معلوم کہ لڑکے ایسی باتوں کے کتنے متلاشی رہتے ہیں اور اگر ایسی کوئی چھوٹی سی بات ان کے ہاتھ آ جائے تو سوئی کا بھالہ بنانا ان کے لئے کونسا مشکل کام ہے؟"

اس نے اپنے ماتھے پر سے پسینے کے قطرے پونچھے اور ڈرتے ڈرتے ادھر ادھر دیکھا' کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا' ہر لڑکا اپنے حال میں مست تھا۔ تالیاں پیٹ رہا تھا' شور مچا رہا تھا اور بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ توصیف اس کی برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ لیکن اسے بھی اپنا ہوش نہیں تھا۔ "کیا مصیبت ہے چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے والا دوست بھی میری حالت سے بے خبر ہے۔ اس کے سامنے تو میں تہہ در تہہ کپڑے پہن کر بھی جیسے ننگا ہی رہتا ہوں۔ اف اسے بھی تو میری حالت کا علم نہیں ہے۔ مجمع میں آخر لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے؟ وہ اپنی انفرادیت کیوں کھو بیٹھتے ہیں؟"

"چلو باہر چلیں۔!" اس نے توصیف کا ہاتھ دبایا۔

"کیا بات ہے!" توصیف نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے!"

"پھر کیا وحشت ہے؟" "تمہارے انعام کون لے گا؟"

"کوئی لے لے گا---- میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

وہ دونوں باہر آ گئے---- اور پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پنڈال سے بہت دور نکل آئے۔ پنڈال میں اس کا نام بار بار پکارا جا رہا تھا۔

سٹی کالج میں ہفتہ طلباء بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ مباحثے' مشاعرے' مذاکرے کھیل کود اور دیگر تقریبات کے ذریعہ طلباء کو اپنی اپنی قیمت متعین کرانے کا موقع ملتا تھا۔ طارق کالج کا لاڈلا کھلاڑی تھا۔ کھیل کے میدان میں وہ ہمیشہ کالج کا نام اونچا رکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیا کرتا تھا۔ اس سال بھی اس نے بہت سارے انعام حاصل کئے تھے۔ مگر اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود وہ بچوں کی طرح بھولا بھالا تھا۔ کھیلوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو کا قرینہ اسے نہیں آتا تھا۔ کالج میں توصیف اس کا راز دار دوست

تھا۔

"کیا بات ہے طارق؟" توصیف نے رک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں!"

"کچھ نہیں! تو باہر کیوں چلے آئے ہو!"

"نہ معلوم کیوں مجھے وہاں وحشت ہونے لگی تھی" طارق نے کہا۔

توصیف نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "چلو کیفے ٹیریا چلتے ہیں۔ تم کچھ ٹھنڈا پانی پی لینا۔"

شیخ رفعت انصاری شہر کے بہت بڑے آدمی تھے۔ ان کے کئی کارخانے تھے جن میں ہزاروں کی تعداد میں مزدور کام کرتے تھے۔ ایک بہت بڑا زراعتی فارم تھا۔ اس کے علاوہ کتنی ہی ایسی جائیدادیں تھیں جن کا عام لوگوں کو تو کیا حکومت کو بھی علم نہیں تھا۔ وہ شہر کی کئی فلاحی تنظیموں کے چیئرمین تھے۔ بہت سے تعلیمی اداروں کو وہ اپنی جیب خاص سے امداد دیتے تھے۔ سیاست میں بھی ان کا خاصا عمل دخل تھا۔

بیگم انصاری انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں اپنے شوہر سے زیادہ نیک نام تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کی مخالفت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کچھ لوگ ان کے بارے میں جلی کٹی باتیں کرتے تھے۔ مگر شاید اس لئے کہ وہ بے انتہا خوبیوں کی خاتون تھیں اور خوبیوں کو لوگ کب خاموشی سے قبول کرتے ہیں کچھ لوگ ان سے اس لئے ہراساں تھے کہ وہ بہت خوبصورت اور باوقار خاتون تھیں۔ کچھ اس لئے جلتے تھے کہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود اب بے پناہ دولت کی مالک تھیں۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے تھے کہ انہوں نے محض دولت کی وجہ سے اپنی بھرپور جوانی کے عالم میں شیخ رفعت انصاری سے شادی کی ہے۔ ورنہ پچاس سالہ بوڑھے میں بیگم انصاری کو کیا خاص بات نظر آئی تھی؟ شادی سے پہلے بیگم انصاری ایک دو کی نہیں شہر بھر کے دانشوروں کی محبوبہ تھیں---- لوگ ان کا نام لے لے کر ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے شاعر ان پر نظمیں لکھتے تھے اور افسانہ نگار انہیں اپنے افسانہ کا مرکزی کردار بنا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ مگر انہوں نے شیخ رفعت انصاری کے ساتھ شادی کر کے سب کو ناامید کیا تھا۔ "اچھی صورت کے باوجود بڑی پھکڑ نکلی کسی نے جل کر کہا تھا۔

جلسے کے بعد مہمان خصوصی کے اعزاز میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ طارق ان

کی نگاہوں سے بچتا پھرا۔ اسے بھوک بھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ سب سے علیحدہ کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ رفتہ رفتہ ہر چیز اندھیرے کے گہرے غار میں اترتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے سوچا' اندھیرا کس قدر طاقتور ہوتا ہے' وہ کس قدر شاطرانہ انداز میں ہر چمکتی چیز پر اپنا تسلط جما لیتا ہے۔ اندھیرے کے غار میں اترنے والی کسی بھی چیز کو غالباً آخری لمحے تک یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس نے اندھیرے کو بخوشی قبول کر لیا ہے۔

"طارق۔۔۔۔" کسی نے اسے پکارا۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ اس کے پروفیسر تھے۔

"فرمایئے؟"

"بیگم انصاری تم سے ملنا چاہتی ہیں!" وہ بولے۔

اس نے بڑی بے چارگی سے پروفیسر صاحب کو دیکھا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

"طارق صاحب آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟" بیگم انصاری اسے دور سے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں!

طارق چڑ سا گیا۔ یہ محترمہ میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"کیا بات ہے؟ واقعی آپ بہت مضمحل سے نظر آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں آج آپ تھکے بہت ہیں!"

"شاید۔۔۔۔!"

"ابھی پروفیسر صاحب سے آپ کا ذکر ہو رہا تھا۔" بیگم انصاری نے کہا۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ آپ ان کے بڑے ذہین طالب علم ہیں اور بڑے اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

"جی میں تو بہت غریب آدمی ہوں!" طارق نے کہا۔

وہ ہنسنے لگیں۔ "واقعی آپ کی طبیعت کچھ خراب ہے۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولیں۔ "آج آپ نے اتنے بہت سے انعام حاصل کئے ہیں۔ کیا آپ کو ان کی کوئی خوشی نہیں ہے۔" وہ شاید اس کی کمزوری ٹٹول رہی تھی۔

"نہیں!" وہ بولا۔۔۔۔ "حالانکہ یہ میرا بچپن کا خواب تھا!"

"آپ کہیں ملازمت بھی کرتے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

تیر نشانے پر بیٹھا---

"جی نہیں!" طارق بولا۔ "والد صاحب کی زندگی میں تو ضرورت پیش نہیں آئی۔ لیکن اب تلاش میں ہوں تو کوئی مناسب جگہ نہیں ملتی!

"کیا کرتے تھے آپ کے والد صاحب؟"

"اسی کالج میں پروفیسر تھے!"

"ارے--- تو کیا تم پروفیسر یزدانی کے صاحبزادے ہو؟" بھئی میں انہیں بڑی اچھی طرح جانتی ہوں۔ شاید اسی لئے مجھے تمہاری شکل جانی پہچانی نظر آ رہی تھی۔" پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "پروفیسر صاحب تو ایک زمانے میں میرے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے مجھ پر بہت احسانات ہیں' آپ ایسا کریں کہ کل میرے غریب خانے پر تشریف لے آئیں۔ انصاری صاحب ایک جگہ کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میں ان سے آپ کا تعارف کرا دوں گی!"

"جی بہتر۔" اس نے بھیگی بلی بن کر کہا۔ وہ سوچنے لگا۔ "میں بھی کیسا پاگل ہوں۔ ان کے لئے کیسی کیسی باتیں سوچ لی تھیں۔ ڈیڈی ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے مگر ہے ابھی بچہ ہی!"

بیگم انصاری کا "غریب خانہ" نئی بستی کا سب سے خوبصورت بنگلہ تھا۔ اس بنگلے کی ایک ایک چیز کو بیگم انصاری نے اپنے ہاتھوں سے آراستہ کیا تھا۔ راہ چلنے والے اسے جی بھر کر دیکھنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور جنہیں کبھی اندر جانے کا اتفاق ہوا تھا وہ اس کی خوابیدہ طلسمی فضا میں گم ہو کر رہ جاتے تھے۔

گیٹ کے ایک ستون میں سنگ مرمر کی ایک تختی آویزاں تھی۔ جس پر شیخ رفعت انصاری کھدا ہوا تھا۔ گیٹ کے پٹ موسیقی کے آلات کی رنگین شبیہوں سے آراستہ تھے۔

وہ اندر داخل ہوا تو ایک ملازم اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا بیگم انصاری تشریف رکھتی ہیں؟"

بیگم انصاری تشریف رکھتی تھیں۔ ملازم نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اپنے آپ کو اکیلا پا کر وہ ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ ڈرائنگ روم کو بڑی نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس کی ہر چیز قیمتی ہی نہیں خوش مذاقی کی آئینہ دار بھی تھی۔

وہ اژدہے کے ایک مجسمے کو دیکھتا رہا جس نے ایک بھولے بھالے ہرن کے بچے کو اپنے حلقے میں جکڑ رکھا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں بیگم انصاری کے پورٹریٹ پر آ کر رک گئیں۔ وہ تصویر کے پردے میں سے بھی اسے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں کی کشش اسے بری نہیں لگی تھی تصویر کو دیکھتے دیکھتے یک لخت یہ راز اس پر ہویدا ہوا کہ بیگم انصاری بہت خوبصورت اور شاندار عورت ہیں۔ اور یہ کہ انہوں نے اپنے کنوار پن کا بانکپن ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔"

اتنے میں ہلکے ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر دروازے پر پڑے ہوئے پردے میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ بیگم انصاری اس کے سامنے تھیں---- سرو قامت گلابی ریشمی ساڑھی میں ملبوس' باوقار اور خیرہ کن---- وہ انہیں نظر بھر کر نہ دیکھ سکا اور ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

"تشریف رکھئے طارق صاحب!" وہ بولیں۔

وہ بیٹھ گیا۔

"معاف کیجئے مجھ سے بڑی بھول ہو گئی' میں نے آج آپ کو زحمت دی۔ انصاری صاحب کو ایک ضروری کام سے پنڈی جانا تھا۔ وہ آج صبح کی فلائٹ سے روانہ ہو گئے۔"

"کوئی بات نہیں' میں پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت جلدی میں ہیں کیا؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی خاص جلدی بھی نہیں ہے!"

"اور طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"تو پھر بیٹھئے' چائے آتی ہی ہو گی۔"

چائے ختم ہوتے ہوئے وہ ایک دوسرے سے بڑی حد تک بے تکلف ہو چکے تھے۔ شام آہستہ آہستہ اترتی چلی آ رہی تھی۔ مگر طارق کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اندھیرا دھیرے دھیرے اپنا تسلط جماتا چلا جا رہا ہے۔

پو پھوٹنے والی تھی جب وہ بیگم انصاری کے بنگلے کے عقبی دروازے سے باہر نکلا اس کا سر ہی نہیں جیب بھی بھاری تھی۔ بیگم انصاری نے بہت سارے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا---- "میں آپ کا بڑی بے چینی سے انتظار کروں گی۔"

وہ پیسے لینا نہیں چاہتا تھا۔

"رکھ بھی لو۔۔۔۔" وہ بولیں۔ "اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ آج سے ہم دونوں دوست ہیں۔ تم بے روزگار ہو' ظاہر ہے ضرورت ہو گی' اور ضرورت میں ایک دوست نہیں تو کون کام آئے گا!"

رات کا افسوں زدہ جال ٹوٹ رہا تھا۔ سحر طلوع ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہو گیا ہے؟" اس نے سوچا۔ "میں کبھی اتنا گرنا تو نہیں چاہتا تھا۔ سلمی کو اگر اس بات کا علم ہو جائے تو وہ میری صورت سے بھی بے زار ہو جائے گی۔ ہم نے کتنے سہانے سپنے دیکھے ہیں' اس کو میری ذات سے کیسی کیسی امیدیں ہیں۔ اس کا ہر لمحہ میرے انتظار میں گذرتا ہے۔ مگر میں کتنا کمینہ ہوں۔۔۔۔ اف میرے اللہ! میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ نجانے یہ سب کیونکر ہو گیا۔ میں ایک مکڑی کے جال میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ میں اب وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔۔۔۔ کبھی نہیں جاؤں گا۔"

کتنی ہی مرتبہ بیگم انصاری کے بلاوے آئے۔ کتنی ہی مرتبہ اس کے ذہن پر ان کے کمرے کی دیوانہ کر دینے والی خوشبو منڈلائی' کتنی ہی بار اس کے تخیل میں ان کے جسم کا لمس جاگا۔ کتنی ہی بار اس کو سرگوشیوں میں کوئی کہتا ہوا سنائی دیا۔ "طارق تم ڈورئس گرے " ہو سچ مچ کے ڈورئس گرے۔ "میں نے تمہیں لاکھوں میں منتخب کیا ہے۔ دیکھو تمہارے جسم کو میرے علاوہ کوئی اور نہ چھونے پائے" مگر وہ بیگم انصاری سے ملنے نہ گیا۔

لیکن آج پھر وہ بیگم انصاری کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔۔ گھنٹہ بھر سے زیادہ گذر چکا تھا۔ اب اس سے نرم صوفے پر بھی نہیں بیٹھا جا رہا تھا' وہ کئی مہینے کی مسلسل علالت سے اٹھا تھا۔ اور بے انتہا کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں' رخساروں کی ہڈیاں چمکنے لگی تھیں اور سارا جسم ہلدی میں رنگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بیماری میں گھر کا اثاثہ ہی نہیں بک چکا تھا۔ بلکہ اس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا۔

دروازے پر پڑے ہوئے پردے میں ارتعاش ہوا۔ بیگم انصاری ہی تھیں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوہو طارق صاحب تشریف لائے ہیں!" وہ بولیں۔ تشریف رکھئے کیسے زحمت گوارہ کی۔ "ان کے لہجے میں کئی مہینے کے انتظار کی تلخی آمیز طنز تھی۔"

"میں کئی مہینے سے بیمار تھا' اس لئے آپ کی طرف نہ آ سکا۔" وہ ان کے طنز کو پی گیا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے!"

"علاج ہو رہا ہے۔"

"ارے تو آپ نے کیوں تکلیف کی، مجھے حکم دیا ہوتا، میں حاضر ہو جاتی۔"

"مجھے شرمندہ مت کیجئے، میں اس وقت ایک ضرورت سے آپ کے پاس آیا ہوں۔۔۔۔" اس نے لمحہ بھر کر سوچا۔

"مجھے دو سو روپے کی بہت سخت ضرورت ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا یہ قرض بہت جلد ادا کر دوں گا۔ ہر جگہ سے ناامید ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ کو یاد ہو گا آپ نے اس دن کہا تھا نا! "آج سے ہم دونوں دوست ہیں اور دوست ہی ضرورت کے وقت دوست کے کام نہیں آئے گا۔ تو کون آئے گا؟" وہ جلدی جلدی کہتا چلا گیا۔ اور بات ختم کر کے ہانپنے لگا۔

بیگم انصاری خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔

"سنو مسٹر۔ میں نے جس طارق کو دوست کہا تھا، آپ وہ تو نہیں ہیں۔ میں ہڈیوں کے ڈھانچے سے تو پیار نہیں کر سکتی۔ اور۔ انہوں نے رکتے رکتے کہا۔۔۔۔ "اور جہاں تک امداد کا سوال ہے، میں بھیک دینے کی قائل نہیں ہوں۔"

وہ سرسراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کمرے میں ان کے جسم کی مہک معلق رہ گئی یا طارق کی آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہوئے نیلے پیلے دائرے۔۔۔۔!

یخ بستگی کی رت

سرما کا ایک بے مصرف سا دن تھا۔

بادلوں اور گرد کی ملگجی سی چادر آسمان پر تنی ہوئی تھی جس میں سے چھن چھن کر میلی سی دھوپ زمین پر برس رہی تھی۔ فضا میں ایک اندوہناک کیفیت گھل مل گئی تھی۔ سرد اور خشک ہوا زرد پتوں کو پیڑوں کی شاخوں سے اڑا کر اپنے ساتھ گم نام منزلوں کی طرف لئے جا رہی تھی۔

گلستان بلدیہ میں گھاس کے قطعات پر لوگ خزاں دیدہ پتوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بیٹھے ہوئے یا نیم دراز بڑی بے دلی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ سب کے سب میدان حشر میں جمع ہوں اور اب اپنے عزیزوں اور قرابت داروں کی پہچان سے بھی محروم ہو گئے ہوں---- وہ بڑی بے دلی سے بار بار ایک ہی جگہ بیٹھنے والی مکھی کو اڑتے ہوئے سگریٹ پھونک رہے تھے اور کھانس کھانس کر بدحال ہوئے جا رہے تھے یا پھر اونگھنے پر ہی اکتفا کر چکے تھے۔ وہاں زندگی کا اگر کچھ احساس ہوتا تو گلستان کے اس گوشے سے آتی ہوئی ہنستی کھیلتی آوازوں کے سبب سے جہاں کچھ بچے وسم کی بے رحم اداسی سے بے نیاز اپنے کھیل میں لگے ہوئے تھے۔

گلستان بلدیہ کی اس ٹھٹھری ہوئی فضا میں نوجوانوں کا ایک گروہ بھی ابھی تک زندہ تھا۔ آج چھٹی کا دن تھا۔ وہ سب کے سب ایک ہفتے بعد آنے والی چھٹی کے اس دن کے ایک لمحے کو بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہفتے بھر کے کام کی تھکا دینے والی یکسانیت سے فرار حاصل کر کے یہاں جمع ہو گئے تھے۔ آج وہ وقت کے ایک ایک لمحے سے لطف و مسرت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتے تھے۔ کبھی وہ کوئی بھونڈا سا لطیفہ سنا کر قہقہے لگانے لگتے اور کبھی وہ سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ آواز ملا کر کوئی گیت چھیڑ دیتے۔ وہ جانتے تھے کہ آزادی اور بے فکری کی یہ مہلت شام تک ہی ہے۔ دوسری صبح پھر ایک تھکا دینے والی یکسانیت اور پر مشقت کام کے آغاز کے ہمراہ طلوع ہو گی۔

نوجوانوں میں ایک سانولا سا لڑکا تھا۔ اس کا جسم زندگی کی حرارت سے تپ رہا تھا اور آنکھوں میں سادگی اور معصومیت کے ساتھ ساتھ ذہانت کا نور چمک رہا تھا۔ وہ ساتھیوں پر بار بار فقرے چست کر کے انہیں خوب ہنسا رہا تھا۔ اب اس کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ پاس سے گذرنے والوں پر بھی کوئی چنچل سا جملہ اچھال دیتا تھا۔

ایک بڑے میاں جن کے سر' ڈاڑھی اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے سفید کپڑوں میں ملبوس جب ان کے پاس سے گذرے تو فقرے باز لڑکے سے نہ رہا گیا' اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا---- "دیکھو بڑے میاں سیدھے قبر سے اٹھ کر چلے آ رہے ہیں۔"

بڑے میاں نے یہ جملہ سن لیا اور چڑ گئے۔ وہ اس لڑکے کو گالیاں دینے لگے۔

کوئی اور دن ہوتا تو شاید وہ اپنی اس حرکت پر نادم ہو جاتا مگر آج وہ ہنستا ہوا دوڑ کر بڑے میاں سے لپٹ گیا۔

"اوہو ہو---- چچا میاں آپ تو برا مان گئے---- آج سردی بہت ہے۔ آیئے ہمارے ساتھ گرم گرم چائے کا ایک کپ ہی پی لیجئے!"____

بڑے میاں نے نوجوان کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی مگر وہ انہیں اپنی گود میں اٹھا کر اپنے ساتھیوں کے حلقے میں لے آیا۔ اور تھرماس میں سے گرم گرم چائے انڈیل کر ان کے سامنے پیش کر دی۔ بڑے میاں سردی سے کانپ رہے تھے۔ گرم گرم چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں آیا تو وہ اپنی ساری ناراضگی کو بھلا دینے پر آمادہ ہو گئے۔

"ہمارے زمانے میں کوئی اس طرح بزرگوں پر فقرے بازی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔" بڑے میاں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ کا زمانہ؟ کونسا چچا میاں؟---- یہ کیا آپ کا زمانہ نہیں ہے؟----" ایک نوجوان نے ان سے پوچھا۔

"لاحول ولا قوۃ!" وہ جھنجلا گئے---- "یہ ہمارا زمانہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارا زمانہ وہ تھا جب ہم تمہاری طرح نوجوان تھے۔ اس زمانے میں ہم بزرگوں کے سامنے سر اٹھا کر نہ چل سکتے تھے۔ ہمیں ان کی عزت کرنا سکھایا جاتا تھا۔ گھروں پر ہی نہیں' انہیں حق حاصل تھا کہ اگر کبھی باہر سڑک پر یا بازار میں بھی کسی کو اخلاق سے گری ہوئی حرکت کرتے ہوئے دیکھتے تو اسے ٹوک دیتے اور اس زمانے میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی کسی بات کا

جواب دینے کی جرات کر سکیں!

"اف کس قدر وحشت ناک زمانہ تھا۔ آپ ایسے کیسے برداشت کر لیتے تھے۔ ایک دوسرا نوجوان بولا۔"

"وحشت ناک زمانہ!---- کیسے برداشت کر لیتے تھے!!" بڑے میاں نے حیرت سے اس نوجوان کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "صاحبزادے وحشت ناک زمانہ وہ نہیں تھا بلکہ یہ ہے جو آج ہمیں دیکھنا نصیب ہو رہا ہے---- ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم یہ دور دیکھنے کے لئے زندہ رہ گئے۔ ہمارے بزرگ بڑے خوش نصیب تھے جو پرسکون موت مر گئے---- ہمیں تو سکون سے مرنا بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ تم اس عبرت ناک دور کے مقابلے میں مجھ سے پوچھتے ہو کہ ہم اس دور کو کیسے برداشت کر لیتے تھے۔ کاش تم نے وہ دور دیکھا ہوتا، کتنا پرسکون اور اخلاص و محبت کا دور تھا۔ آج تو گلیوں میں، بازاروں میں، گھروں میں، ہوٹلوں میں، محفلوں میں ہر طرف مکر و فریب کے جال بچھے ہوئے ہیں۔ ننگی اور سفاک درندگی رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انسانیت کی تمام قدریں دم توڑ چکی ہیں---- آج انسان ہیبت ناک مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے اور اس مشین کو چلانے والے چند شیطان انسان کو موت کا رقص کرنے پر مجبور کئے ہوئے ہیں، مگر تم لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تم سوچ ہی نہیں سکتے کہ اس دوزخ کے مقابلے میں وہ دور جنت سے کم نہیں تھا"

"اچھا میں سمجھا----" فقرے باز نوجوان نے کہا---- "چچا میاں آپ اس دور کی بات کر رہے ہیں جب انسانوں کے لئے آسمان سے من و سلویٰ اترا کرتا تھا اور انسانوں کو سوائے چین کی بنسری بجانے کے اور کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔"

"بدقسمت تھے وہ لوگ جن پر من و سلویٰ اترا کرتا تھا۔" بڑے میاں نے کہا۔ "وہ خدا کی نعمتوں کے شکر گذار نہ رہ سکے۔ انہوں نے من و سلویٰ سے منہ موڑ کر کہا کہ ہمیں تو پیاز چاہئے، مسور کی دال چاہئے---- چنانچہ ان پر من و سلویٰ اترنا بند ہو گیا اور انسان اپنا رزق اپنے ہاتھوں سے کمانے پر مجبور ہو گیا ____ مگر میں اسی دور کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، میں صرف اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب چین کی بنسری تو خیر کوئی نہیں بجاتا تھا مگر مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی اس کی مزدوری مل جاتی تھی اور مزدوری بھی پوری ____ اتنی مزدوری کہ ایک خاندان باعزت زندگی گذارنے میں دشواری محسوس نہیں

کرتا تھا----!"

"آپ نے جب پہلی ملازمت کی تھی تو آپ کی تنخواہ کیا تھی؟----" ایک نوجوان نے جسے چند روز پیشتر ہی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی ملازمت ملی تھی پوچھا۔

"پانچ روپے!----" بڑے میاں نے کہا۔

"پانچ روپے!" یک لخت تمام نوجوانوں کے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔

"ہاں پانچ روپے!"____ بڑے میاں نے اطمینان سے کہا۔

"اس رقم میں آپ کا گذارہ ہو جاتا تھا----"

"بہت اچھی طرح سے---- بڑی عزت سے۔ بڑی شان سے!" بڑے میاں بولے۔ وہ پانچ آج کے پانچ سو روپیوں کے برابر تھے بلکہ اس سے بھی بہتر----!"

"ہاں شاید پانچ ہزار روپے کے برابر ہوتے ہوں گے!" نوجوان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے!----" بڑے میاں اس کے طنز کو سمجھ نہ سکے یا شاید بچکانہ حرکت سمجھ کر نظر انداز کر گئے---- "میں معاشیات کے اصولوں سے واقف نہیں ہوں' اور ہونا بھی نہیں چاہتا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا علم ہے جو انسان کی زندگی میں پیچیدگیوں کی کاشت کرتا ہے---- ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس زمانے میں پانچ روپے میں جتنی خوش حال زندگی ہم گذار لیتے تھے آج پانچ سو میں بھی ممکن نہیں---- اس زمانے میں لوگ مطمئن بھی تھے اور صحت مند بھی!---- آج تو نہ اطمینان ہی میسر ہے نہ کوئی صحت مند چہرہ ہی دیکھنے کو ملتا ہے!----"

"اور آپ کے خیال میں یہ بھی اس دور کا قصور ہے؟" نوجوان بولا۔

"اس دور کا قصور نہیں ہے تو پھر کس کا ہے؟----" بڑے میاں نے کہا---- "آج ہر چیز آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور اس مہنگائی کے باوجود کوئی چیز اصلی نہیں ملتی---- کہتے ہیں کہ اگر زہر لینے جاؤ تو بازار میں وہ بھی اصلی نہیں ملے گا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ ایک روپے میں ڈیڑھ سیر اصلی گھی ملتا تھا۔"

"ایک روپیہ میں ڈیڑھ سیر!----"

"ہاں---- اور ایک روپیہ من گندم----!"

"ایک روپیہ من گندم----؟"

"اور دو آنے یا دس پیسے گز لٹھا----"

"دو آنے گز لٹھا---- کیا کہہ رہے ہیں چچا میاں؟"

"ہاں دو آنے گز لٹھا اور وہ بھی بہترین جاپان کا۔"

"چچا میاں خواب کی باتیں تو نہیں کر رہے----؟"

"ہاں بیٹا----" بڑے میاں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اب تو یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہی نظر آتی ہیں۔!"

بڑے میاں اٹھ کر سر جھکائے چل دیئے---- کچھ فاصلے پر بیٹھا ایک شخص اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیا---- بڑے میاں جب گلستان بلدیہ کے بڑے دروازے کے باہر آ گئے تو اس نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا اور ان کے کان کے قریب منہ لے جا کر کہنے لگا---- "بڑے صاحب---- ذرا تھانے تک چلنے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے----"

"کیوں----؟" بڑے میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ سے پوچھ گچھ کرنی ہے----"

"مگر کس لئے----؟"

"اس لئے کہ آپ نوجوانوں کو گمراہ کرنے اور ان میں بے اطمینانی اور انتشار پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے!"

پسِ پردۂ گل

"کیا نام ہے؟"

"اورنگ زیب!"

"اورنگ زیب!" بیگم سلمان نے زیرِ لب دہرایا اور اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ گورا چٹا رنگ، صحت مند رس بھرا جسم، معصوم سا چہرہ اور بڑی بڑی خمار آلود سی آنکھیں---- لگتا تو مغلیہ خاندان سے ہی ہے۔" انہوں نے دل میں سوچا۔

"کیا کام کر لیتے ہو۔"

"جو کام آپ بتائیں گی بیگم صاحبہ، کروں گا۔"

"پہلے کہیں ملازمت کی ہے؟"

"نہیں----"

"خیر ٹھیک ہے---- کل سے کام پر آ جانا۔"

اور دوسرے روز سے وہ کام پر آ گیا۔

گھر پر ملازموں کی کمی نہیں تھی۔ سلمان نے ملازموں کی اچھی خاصی فوج جمع کر رکھی تھی---- بیگم سلمان جب اس محل نما بنگلے میں آئیں تو باری باری تمام خدمتگار سلام کرنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ایک خاص تنقیدی نگاہ سے ہر ایک کا جائزہ لیا۔ مگر ان میں سے ایک بھی اپنے کام کا آدمی نظر نہ آیا۔ اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے لئے ایک نئے ملازم کا وہ خود انتخاب کریں گی۔ کئی لڑکے ملازمت کے لئے ان کے سامنے پیش کئے گئے۔ مگر ان کے معیار پر پورے نہ اتر سکے۔ اورنگ زیب کو دیکھتے ہی انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں جس آدمی کی تلاش تھی وہ مل گیا ہے۔

سلمان ایک بڑے زمیندار تھے۔ اتنے بڑے زمیندار تھے کہ آج تک وہ خود بھی اپنی زمینوں کے حدود اربعہ سے واقف نہیں ہو سکے تھے۔ اور ایسی بے مقصد باتیں جاننے کی انہیں ضرورت تھی نہ خواہش۔ وہ بس یہ جانتے تھے کہ بنک میں ان کے نام کے کھاتے میں

ہر وقت اتنی رقم جمع رہتی ہے کہ ان کو اپنی بڑی سے بڑی خواہش کی تکمیل کے لئے کچھ سوچنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ سوچنا یوں بھی ایک تکلیف دہ عمل ہے اور دکھ جھیلنا ان کے مقدر میں تھا نہیں۔ باپ مرتے ہوئے ایک جاگیر چھوڑ گئے تھے اور کاتب تقدیر نے ہنس کھیل کر زندگی گزارنا ان کی تقدیر میں لکھ دیا تھا۔ تقدیر کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔ تقدیر کا لکھا حرف بہ حرف پورا ہو کر رہتا ہے۔ وہ بھی مجبور تھے اس مجبوری کو نبھانے کے لئے وہ آئے دن اپنے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ تلاش کرتے رہتے تھے کبھی گھوڑ دوڑ کا چسکا ہے تو کبھی قلم کے گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ کبوتر بازی سے طبیعت اکتائی تو رنڈی بازی شروع کر دی۔ طبیعت میں بڑا تلون تھا۔ کوئی روگ زیادہ عرصہ پالنے کے قائل ہی نہیں تھے۔ حد یہ ہے کہ اب تک انہیں جو بیویاں ملیں وہ بھی انتہائی مزاج شناس۔ ادھر سلمان کا ان سے دل بھرا وہ اللہ کو پیاری ہوئیں۔ پہلی بیوی پہلی تھی' کچھ زیادہ عرصہ جی لی۔ اس کے بعد تو دو بیویاں ایسی گزریں کہ بیچاریوں کو پورا محل دیکھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ گھونگھٹ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا ہی غضب ہو گیا۔ ان آنکھوں نے خدا جانے کیا دیکھا کہ ہمیشہ کے لئے مند گئیں۔

سلمان گھریلو قسم کے مرد ہرگز نہیں تھے۔ مگر گھر کی چہار دیواری میں ایک بیوی کی موجودگی کو وہ نہایت ضروری خیال کرتے تھے۔ ایک تو اس لئے کہ یہ ان کے آباؤ اجداد کی' روایت چلی آ رہی تھی دوسرے اس لئے بھی کہ اگر مکان میں نوکر چاکر ہوں' قیمتی فرنیچر ہو۔ آرائش کے جملہ لوازمات موجود ہوں تو کم از کم ایک بیوی کا ہونا بھی نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ نئی نویلی دلہن کی ناز برداریاں کون نہیں کرتا۔ سلمان بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ مگر وقت ایک سا نہیں رہتا۔ ادھر دلہن' دلہن بیوی بنی ادھر بے التفاتی کا سفر شروع ہوا۔ پھر تو یہ عالم ہو جاتا کہ سلمان اور بیگم سلمان کی خوابگاہوں کے درمیان جو ایک دروازہ تھا وہ ہفتوں نہ کھلتا۔ اور سلمان کی مرضی کے خلاف ان کی خوابگاہ میں کسی کو جھانک کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ دو ایک کو چھوڑ کر گھر کے پرانے سے پرانے نمک خواروں کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ ان کی خوابگاہ میں داخل ہونے کے کتنے راستے ہیں۔

جمیلہ اس محل نما بنگلے میں آنے والی چوتھی دلہن تھی اور اورنگ زیب کا کونسا نمبر تھا یہ شاید کوئی نہیں بتا سکتا تھا نوکروں کا کون شمار کرتا ہے۔

"تمہاری عمر کیا ہو گی' اورنگ زیب؟" ایک دن بیگم سلمان نے پوچھا۔

"سولہ یا سترہ برس بیگم صاحبہ!" اورنگ زیب نے جواب دیا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" وہ بولیں۔ "مگر تمہاری اٹھان اور تمہاری صحت بہت اچھی ہے تمہارے چہرے پر نظر نہ جائے تو کوئی تمہاری عمر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا۔"

اورنگ زیب نے اپنی کشادہ چھاتی اور پھٹی ہوئی آستین سے جھانکتی ہوئی بازوؤں کی مضبوط مچھلیوں کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔"

"نہیں---- بیگم صاحبہ!"

"تو اتنی عمر کیسے گزار دی۔ نہ پڑھا نہ کام کیا؟"

"بس بیگم صاحبہ، کھیلنے اور گھومنے پھرنے میں دن گزر گئے!"

"بہت خوش قسمت ہو۔" بیگم سلمان نے کہا۔

اورنگ زیب ان کی بات کا مطلب بھی نہ سمجھ پایا تھا کہ انہوں نے سوال کیا۔ "تمہارے خیال میں میری کیا عمر ہو گی؟"

اورنگ زیب نے پہلی مرتبہ انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"پتہ نہیں۔"

"تم سے زیادہ بڑی نہیں ہوں" وہ بولیں۔ "اور اس عمر میں اتنے دکھ جھیلے ہیں کہ بس!"

اورنگ زیب خاموشی سے ان کے چہرے کو تکتا رہا۔

"تمہارے خیال میں میں یہاں بہت خوش رہتی ہوں گی۔ مگر ایسا نہیں ہے، اس ماحول میں تو خوشیوں کا دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ یہ دولت، یہ بنگلہ، یہ کاریں یہ فرمانبردار ملازموں کی قطاریں، دبیز قالینوں اور بیش بہا آرائشی اشیاء سے مزین، خوشبوؤں میں بسی ہوئی یہ خوابگاہیں، یہ نرم گدیلے بستر---- مگر یہاں میرے دن ایسے گزرتے ہیں جیسے انگاروں پر چل رہی ہوں، کانٹوں کی سیج پر لیٹی ہوں۔"

بیگم سلمان کی آنکھوں میں آنسو چھلکے اور ان کے رخساروں پر بہنے لگے۔

"آپ---- آپ رو رہی ہیں!" اورنگ زیب حیرت سے پتھر بن گیا۔

"ہاں!---- اب رونا ہی میرا مقدر ہے۔" بیگم سلمان نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "شادی سے پہلے میں نے کیسے کیسے سہانے خواب دیکھے تھے، میں نے سوچا تھا، میرا

چھوٹا سا گھر ہو گا' محبت کرنے والا ایک شوہر اور ہنستا کھیلتا ایک گول مول صحت مند بچہ ہو گا اف میرے اللہ میری ایک تمنا بھی تو پوری نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر انہیں ہچکیاں سی لگ گئیں اور انہوں نے اپنی بانہوں میں اپنا سر چھپا لیا۔

اورنگ زیب کا دل ہمدردی سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیگم سلمان سے ہمدردی کے کچھ الفاظ کہے۔ ان کا سر اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لے۔ جیسے اس کی ماں اسے چپ کرانے کے لئے کرتی تھی۔ وہ بے اختیار ان کی طرف بڑھا۔ اس نے ان کی طرف ہاتھ پھیلائے مگر پھر اسے خیال آیا کہ وہ ان کا نوکر ہے اور اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ فضا میں معلق رہ گئے۔

"بیگم صاحبہ! آپ رو رہی ہیں۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں بڑے بھولے پن سے کہا۔

بیگم سلمان نے سر اٹھا کر اورنگ زیب کی طرف دیکھا۔ اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں گر گئیں اور اس کے سینے پر سر رکھ کر آنسو بہانے لگیں۔

"ہاں اورنگ زیب! اب یہ رونا تو زندگی بھر کا ہے" انہوں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے ماں باپ کی جان کو رو رہی ہوں۔ جنہوں نے دولت کے لالچ میں مجھے اس جہنم میں دھکیل دیا۔ اس جہنم میں جہاں ساری عمر جلتی رہوں گی۔"

پھر انہوں نے اورنگ زیب کے سینے پر سے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اور تمہیں معلوم ہے' میری ساری زندگی اب کتنی رہ گئی ہے صرف ایک دو سال---- یا شاید اس سے بھی کم۔ بہت کم۔"

"کیوں؟"

"اس لئے اس گھر کی یہی رسم ہے۔ مجھ سے پہلے جو لڑکیاں اس گھر میں دلہن بن کر آئیں تھیں۔ وہ اتنے ہی عرصہ زندہ رہیں۔ خدا جانے وہ خود مر گئیں یا انہیں مار دیا گیا۔ اس راز سے پردہ اٹھانے والا کوئی نہیں ہے۔"

اورنگ زیب کا ذہن ایک کھلنڈرے لڑکے کا ذہن تھا۔ یہ ساری باتیں اس کے لئے بڑی عجیب و غریب تھیں۔ وہ گم سم سا ہو کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے اور بیگم سلمان کو کس طرح تسلی دے۔ اس کے دل میں ان کے لئے ہمدردی کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ مگر اسے اپنے جذبات کے اظہار پر قدرت نہیں تھی۔ وہ ان کے لئے خطرات سے

بھی ٹکرا جانے کے لئے تیار تھا۔ مگر وہ اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر اس کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اور بیگم سلمان کی روتی ہوئی آنکھیں اورنگ زیب کی جگمگاتی ہوئی آنکھوں کی روشنی میں اس چہرے کی کتاب میں لکھی ہوئی متلاطم جذبات کی عبارت کو پڑھ رہی تھیں۔

بیگم سلمان نے آنسو پونچھ دیئے۔

"تمہیں شاید یہ بات عجیب سی لگے۔" بیگم سلمان نے کہنا شروع کیا۔ "مگر یہ حقیقت ہے کہ میں تمہیں اپنا ملازم نہیں اپنا ہمدرد اور دوست سمجھتی ہوں۔" بیگم سلمان اورنگ زیب کے استعجاب کی پرواہ کئے بغیر کہتی رہیں۔ "تمہیں معلوم ہے اس گھر میں ملازموں کی کمی نہیں تھی۔ مگر وہ سب کے سب..... سلمان صاحب کے ملازم تھے۔ مجھے ان کی طرف سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ میں نے سوچا اس گھر میں کوئی میرا بھی ہمدرد و غمگسار ہو۔ چنانچہ میں نے تمہارا انتخاب کیا۔ تم سمجھ دار ہو اور طاقتور ہو۔ مجھے یقین ہے تم میری حفاظت کر سکتے ہو۔"

اورنگ زیب کو یوں لگا۔ جیسے اچانک اس کی عمر سترہ سال سے ایک دم ستائیس سال ہو گئی ہو یا شاید سینتیس سال۔ اس کا سینہ فخر سے پھول گیا اس نے ایک دفعہ پھر اپنی پھٹی ہوئی آستین میں سے جھانکتی ہوئی مضبوط بازوؤں کی مچھلیوں کو دیکھا اور اس مرتبہ اس کا سر جھکا نہیں کچھ اور بلند ہو گیا۔

"آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" اورنگ زیب نے کہا۔ "میں جب تک اس گھر میں موجود ہوں آپ کو کوئی خطرہ نہیں۔ میں آپ کی حفاظت کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔"

"شکریہ اورنگ زیب۔" بیگم سلمان نے دزدیدہ نگاہی کے ساتھ کہا..... مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ تم میرے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈالو۔ بس اتنی بات یاد رکھو کہ تم گھر بھر کے لئے نوکر ہو اور میرے دوست۔ اپنی آنکھیں کھلی رکھو تو مجھے فوراً آگاہ کر دو۔"

اورنگ زیب کا وہ سارا دن ایک بے چینی کے عالم میں گزرا اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ان واقعات کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی کسی کو بتا دے مگر راز داری کا احساس ہونٹوں پر مہر لگائے ہوئے تھا۔ وہ کبھی اپنی میلی اور پھٹی ہوئی قمیض کو دیکھتا جس میں بیگم سلمان کے آنسو جذب تھے کبھی اپنے ہاتھوں کو حیرت سے تکتا جو بیگم سلمان کے بالوں کے معطر لمس

سے آشنا ہوئے تھے۔ آج وہ اپنے آپ کو بہت توانا' سب سے علیحدہ اور بہت اہم سمجھ رہا تھا۔

اس روز کے بعد بیگم سلمان اس کے خیالات کا محور بنتی چلی گئیں۔ ان کے ماتھے پر شکن ابھر آتی تو جیسے کائنات کی ہر چیز پر خزاں کا راج ہو جاتا اور اگر وہ خوش ہو کر مسکراتیں تو ہر طرف پھول ہی پھول کھل اٹھتے۔ وہ ان کے اشارے کا منتظر رہنے لگا۔ گھر کے ہر فرد سے اس کا رشتہ ٹوٹتا گیا اور اس کے احساس' جذبات اور خیالات کی پوری دنیا بیگم سلمان کے نرم و نازک پیکر میں سمٹتی چلی گئی۔

بیگم سلمان نے ایک دن اسے بہت سے روپے دیئے اور کہا کہ وہ اپنے لئے کچھ اچھے اور نئے کپڑے خرید لے۔ اس نے لینے میں تامل کیا تو انہوں نے کہا۔ "رکھ لو۔ دوستی میں سب چلتا ہے۔"

پھر ایک دن بیگم سلمان نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ ابھی ابھی غسل خانے سے نکلی تھیں اور کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہوں نے بلاوز پہن تو لیا تھا۔ مگر اس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب پلٹنے لگا تو انہوں نے آواز دی۔ "ادھر آؤ۔ ذرا بلاؤز کے بٹن تو لگا دو۔"

اورنگ زیب نے بٹن بند کرنا شروع کئے تو اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کا ہاتھ ان کے جسم سے مس نہ ہونے پائے۔ اس پر بھی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور بٹن بار بار پھسل جاتا تھا۔ وہ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ہنس پڑیں۔ "تمہارے چھو لینے سے میرا جسم میلا نہیں ہو جائے گا۔" انہوں نے کہا اور اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن میں حمائل کر دیئے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس نے دیکھا کہ بیگم سلمان کا چہرہ اور اس کا چہرہ بہت قریب قریب آگئے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ سر سے پاؤں تک لرز گیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے کی طرف دوڑ رہا ہو۔

بیگم سلمان نے سر پیچھے کی طرف ڈھلکا کر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ "ایسی گھبراہٹ بھی کیا۔ تم میرے ملازم تھوڑی ہو۔"

ایک دن بیگم سلمان نے ایک چھوٹا سا پیکٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔ "ذرا یہ ندیم صاحب کو دے آؤ۔" وہ ندیم کا پتہ پوچھ کر چلا گیا۔ راستے پر اس نے ندیم کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں لیکن جب وہ اس سے ملا تو اسے حیرت ہوئی۔ وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ بیگم

سلمان کے اس کے علاوہ کسی دوسرے نوجوان مرد سے تعلقات نہیں ہو سکتے۔ ندیم نوجوان ہی نہیں خوبصورت بھی تھا۔ صورت شکل سے پڑھا لکھا بھی نظر آتا تھا۔ مگر گھر کے حالات سے معلوم ہوتا تھا کہ مالی حالت اچھی نہیں ہے۔

اورنگ زیب واپس آیا تو اس نے پوچھا۔

"ندیم صاحب کون ہیں؟"

"یہ ہمارے دور کے عزیز ہیں۔" بیگم سلمان نے کہا۔

"اس پیکٹ میں کیا تھا؟"

"کچھ روپے تھے۔ مگر تم کیوں یہ پوچھ رہے ہو' کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"نہیں تو۔"

"انہوں نے تمہیں کچھ کہا ہے؟"

"نہیں کچھ بھی نہیں---- بس یونہی پوچھ رہا تھا۔"

"تو چھوڑو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولیں "میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے وقتاً" فوقتاً" ہماری امداد کی ہے۔ آج کل وہ بے روزگار اور پریشان ہیں تو ان کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔"

سرما کی سرد' خنک اور گرد آلود ہوائیں چل رہی تھیں۔ موسم پر بے کیفی کا عالم طاری تھا۔ لوگ دوپہر کی ملگجی دھوپ میں اونگھ رہے تھے۔ اورنگ زیب پر بیزاری کا عالم طاری تھا کہ بیگم سلمان کا بلاوا آ گیا۔

بیگم سلمان اپنے کمرے میں نرم گرم بستر میں دبکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور کہنے لگیں۔ "آج طبیعت بہت بوجھل ہے۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا تو تمہیں بلا لیا۔ میں تمہارے آرام میں تو مخل نہیں ہوئی۔"

"میرا آرام آپ سے زیادہ اہم تو نہیں۔" بیگم سلمان کے التفات نے اسے باتیں کرنا سکھا دیا تھا۔

"کیا تم واقعی ایسا سمجھتے ہو؟"

"آپ کو شک ہے؟"

"نہیں اورنگ زیب! تم پر شک کرنے کا تو یہ مطلب ہو گا کہ مجھے اپنی ذات پر بھی بھروسہ نہ رہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم میرے لئے کتنے اہم ہو۔"

"اور آپ میرے لئے؟"

"میں تمہارے کس کام آ سکتی ہوں!"

"میں آپ سے کسی بدلے کا طلب گار بھی تو نہیں۔"

"یہ تمہارا احسان ہے۔"

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو' یہ بتایئے آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک نہیں۔ سارے بدن میں درد ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی دبا دے!"

"لایئے میں دبا دوں۔"

"تم۔۔۔۔؟"

"ہاں۔"

"اچھا دبا دو۔"

کچھ اس کی اپنی خواہش تھی کچھ بیگم سلمان کا حکم کہ پنجوں اور پنڈلیوں سے ہوتے ہوئے اس کے ہاتھ بیگم سلمان کی رانوں تک پہنچ گئے۔ اس کے ہاتھ قابو میں نہیں تھے یا کپڑا اتنا چکنا تھا کہ بار بار اس کے ہاتھ پھسل جاتے تھے!

بیگم سلمان کے جسم کا لمس اس کی ہتھیلیوں سے چڑھتا ہوا اس کے ذہن پر خمار بن کر چھا گیا اس کے ہاتھ لحاف کے اندر چھپے ہوئے تھے وہ اپنے ہاتھوں کو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کے ہاتھ بیگم سلمان کے جسم کے تمام نشیب و فراز دیکھ رہے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس کے سر کو اپنے چہرے پر جھکا لیا۔ اور اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے ٹکرا دیا۔ بیگم سلمان کے ہونٹ گرم تھے اور سرور خیز! اس جسم میں شرارے سے پھوٹنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ انہیں اپنی بانہوں میں لے لے اس نے انہیں اپنے سینے سے لگایا اور بھینچ لیا۔

"اورنگ زیب دیکھو کوئی آ نہ جائے۔" اسے خواب میں بیگم سلمان کی آواز سنائی دی۔

"کوئی نہیں آتا۔"

"نہیں اورنگ زیب یہ میری عزت ہی نہیں زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

اورنگ زیب انہیں چھوڑ کر علیحدہ ہو گیا۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔" اس نے سر جھکا کر کہا اور کمرے سے باہر جانے لگا۔

"سنو۔" بیگم سلمان نے اسے پکارا۔

وہ ٹھٹکا اور پلٹ کر بیگم سلمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں معاف تو کر دیتی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے تمہاری کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔"

اورنگ زیب کو یوں لگا جیسے ایک بھاری پتھر جو یکلخت اس کے دل پر آن گرا تھا' ہٹ گیا ہو۔

وہ سارا دن اس کا خوابوں میں بیت گیا۔

شام ہوئی تو اس کے سارے خواب بکھر گئے۔ سلمان صاحب کی طرف سے اسے اطلاع ملی کہ اس کی ملازمت ختم ہو گئی ہے۔ اسے خیال آیا کہ دیواروں کے کان ہی نہیں آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ وہ دوڑتا ہوا بیگم سلمان کو یہ خبر سنانے کے لئے گیا۔

بیگم سلمان نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ تمہاری ملازمت ختم ہونے والی ہے۔"

"مگر میں آپ کو اس گھر میں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

مجبوری ہے۔ تم اپنی جان خطرے میں مت ڈالو۔ میری زندگی اب زیادہ دن کی نہیں ہے مگر تمہیں زندہ رہنا چاہئے۔ مجھ سے ملنا چاہو تو رات کو جب سڑک سنسان ہو جایا کرے تو تم دیوار کود کر اندر آ سکتے ہو۔ میں اپنے عقبی دروازہ تمہارے لئے کھلا چھوڑ دیا کروں گی۔"

اورنگ زیب جب بیگم سلمان کی خوابگاہ کا عقبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اسے یہ دیکھ کر قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ بیگم سلمان اس کے انتظار میں جاگ رہی ہیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھی اس کی طرح بے چین ہوں گی۔

اس روز بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔ اور رات گئے تک شہر کی سنسان سڑکوں پر بے مقصد گھومتے رہنے کی وجہ سے سردی ان کی ہڈیوں تک اتر گئی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا بیگم سلمان اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئیں۔ وہ ان کی چھاتیوں میں منہ چھپا کر ایک بھولے بھالے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندہ نہیں رہ سکتا۔"

بیگم سلمان نے اسے اچھی طرح لحاف سے ڈھک دیا۔ اس کے ماتھے کو' گالوں کو ہونٹوں کو بوسے دینے لگیں۔

"اورنگ زیب میں بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ یہ تین چار دن ایسے گزرے ہیں کہ لگتا ہے صدیاں بیت گئی ہیں۔ ہر شب شام سے صبح تک تمہارا انتظار کرتی تھی۔"

"میں روز آ جایا کروں گا۔"

"نہیں اورنگ زیب تمہاری زندگی اتنی سستی نہیں کہ اس طرح خطرے میں ڈالو۔"

"تمہارے بغیر زندگی کس کام کی؟"

"میں تمہیں حاصل کرنے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ اورنگ زیب تمہیں کیا معلوم کہ تم میرے لڑکپن کے خوابوں کی تعبیر ہو۔ اس زمانے میں جس مرد کے خواب دیکھا کرتی تھی، تم ہو بہو وہی ہو۔"

اورنگ زیب نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"آؤ کہیں بھاگ چلیں۔" اس نے کہا۔

"بھاگ چلیں۔" بیگم سلمان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بھاگ تو چلیں مگر سلمان بہت دولت مند ہیں اور دولت کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔ ہم آخر کہاں تک بھاگیں گے؟"

"طلاق لے لو۔"

"طلاق۔ اونہہ۔" بیگم سلمان نے زہر خند کے ساتھ کہا۔ "وہ کہتے ہیں اس گھر میں جو لڑکی آتی ہے۔ اس کا جنازہ ہی اس گھر کی ڈیوڑھی سے باہر نکلتا ہے۔ جیتے جی تو اسے ان کی مرضی کے خلاف باہر قدم نکالنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

اورنگ زیب نے مضبوطی سے بیگم سلمان کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

"آج انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔" بیگم سلمان نے کہا۔

"پھر۔۔۔۔؟" اورنگ نے بیتابی سے پوچھا۔

"آج وہ تنہا تھے۔ جب کوئی دوسری لڑکی نہیں ملتی تو انہیں میرا خیال آتا ہے۔ مگر آج میں نے ان کی خواہشات کا شکار ہونے سے انکار کر دیا۔"

"پھر۔۔۔۔؟"

"پھر۔۔۔ تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہئے تھا۔ انہوں نے میرے بال پکڑ کر میرے منہ پر طمانچے مارے اور دھکے دیتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکال دیا۔ وہ شراب کے نشے میں ایسے بدمست تھے کہ ان سے اپنا آپ سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ ورنہ شاید اس کمرے میں آج تمہیں میرے بجائے میری لاش ملتی۔ اور اس پر بھی تمہارے علاوہ کوئی دوسرا آنسو

بہانے والا نہ ہوتا۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ میری زندگی کے دو چار دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔"

"نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔" اورنگ زیب تڑپ اٹھا۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا اس سے پہلے کہ تمہاری زندگی پر آنچ آئے میں اس کا گلا دبا دوں گا۔"

"تو کیا تم اسے قتل کرو گے؟"

"ہاں۔"

"ہو تو سکتا ہے۔" بیگم سلمان نے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے کہا۔ "آج وہ نشہ میں ایسا دھت ہے کہ اسے اپنی سدھ بدھ ہی نہیں اور آج اس کی خوابگاہ کا دروازہ بھی کھلا رہ گیا ہے۔ مگر میرا خیال ہے تم یہ چھری لے لو۔" بیگم سلمان نے اپنے تکئے کے نیچے سے ایک چھری نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ "میرے پاس اور کچھ تو ہے نہیں اپنی حفاظت کے لئے یہ چھری رکھ کر چھوڑی تھی۔"

بیگم سلمان اپنی خوابگاہ کے دروازے تک اس کے ساتھ آئیں۔ نکلنے لگا تو وہ بولیں۔ "ڈر تو نہیں لگے گا؟ میں تمہارے ساتھ چلوں؟"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔"

انہوں نے ایک مرتبہ پھر اورنگ زیب کو اپنے آپ سے لپٹا لیا اور سرگوشی میں کہنے لگیں۔ اس عذاب سے میری جان بچ جائے گی تو تمہارے ساتھ شادی کر لوں گی۔ اور چھوٹا سا مکان لے کر اس میں تمہارے ساتھ رہنے لگوں گی۔ وہاں تم ہو گے' میں ہوں گی اور ہمارے بچے ہوں گے۔"

پھر ایک الوداعی بوسے کے ساتھ وہ کہنے لگیں۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں اس سرد رات میں تمام ملازم اپنے لحافوں میں چھپے بے خبر سو رہے ہوں گے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے گی۔"

اورنگ زیب سلمان کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ مدھم نیلی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ بے خبر سو رہے ہیں۔ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا ان کے بستر کے قریب پہنچا اور ایک ہاتھ ان کے منہ پر رکھ کر چھری سے ان کا سینہ چھلنی کر دیا۔ ایک چیخ ابھری۔ ایک فوارہ سے ابلا اور وہ خون میں شرابور ہو گیا۔

وہ جلدی سے پلٹا مگر سلمان کی خوابگاہ کا دروازہ باہر سے بند تھا اور باہر بیگم سلمان دیوانہ وار چلا رہی تھیں۔ چور۔ چور۔ چور

اورنگ زیب پلٹ کر تیزی سے دوسرے دروازے کی طرف بھاگا مگر وہ بھی بند تھا۔ کھڑکیوں کی موٹی موٹی سلاخیں اس سے زیادہ طاقتور تھیں۔ وہ ایک دروازے سے دوسرے دروازے اور ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی کی طرف بھاگتا رہا۔ اس کا سانس پھول گیا اور پھر اسے یوں لگا کہ یکلخت زمین الٹی گھومنے لگی ہو اور وہ چکرا کر دھڑ سے فرش پر گر گیا۔

دوسرے روز پرسے کے لئے آنے والوں سے کہہ رہی تھیں۔ ''کیا زمانہ آگیا ہے۔ دو چار روز ہوئے انہوں نے کسی بات پر ناراض ہو کر اسے ملازمت سے نکال دیا تھا آج اس نے انہیں قتل کر دیا۔ اب کس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ انہوں نے تو کبھی اپنے ملازموں کو ملازم سمجھا ہی نہیں۔

پرسے کے لئے آنے والوں میں ندیم بھی تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لے کر سارا بنگلہ دکھایا اور کہنے لگیں۔ ''اب یہ بنگلہ اور اس کی ہر چیز میری ہے اور اب تمہارے اور میرے درمیان دنیا کی کوئی طاقت حائل نہیں ہو سکتی۔

سفارش

"ڈاکٹر صاحب تشریف رکھئے نا!" ڈاکٹر رحمٰن کو پہچان لینے کے بعد وہ ایک دم ان کے لئے جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈاکٹر رحمٰن بیٹھ گئے تو معاً" اس نے یہ سوچا کہ اتنی دشواریوں کے بعد حاصل کی ہوئی جگہ اس نے کیوں چھوڑ دی----

وہ آج اپنے آپ سے ضد کرنے پر اتر آیا تھا۔ وہ چاہتا تو اس سے ایک گھنٹہ قبل گھر پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ آج بس میں بیٹھ کر گھر جائے گا۔ یہ شاید اس بات کا ردعمل تھا کہ اسے مدتوں سے بس میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی مشکل سے ملتی تھی چنانچہ آج جب اس کے لاشعور نے اسے یہ بات سمجھائی تو وہ اس سے فوراً" متفق ہو گیا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ جب بس کا انتظار کرنے والوں کی قطار میں آ کر شامل ہوا تو لوگ زیادہ نہیں تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ آگے نہیں تو بس میں کہیں پیچھے کی سیٹوں پر تو بیٹھنے کی جگہ ضرور ہی مل جائے گی مگر جب بس آئی تو نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آ کر قطار میں شامل ہو گئے اور جس وقت وہ بس میں داخل ہوا تو تمام سیٹیں پر ہو چکی تھیں۔ اس نے نہایت بے بسی سے ایک ایک سیٹ کو گھور کر دیکھا مگر بس میں اب ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں بچی تھی وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کرے کنڈکٹر سے لڑے یا ان لوگوں کو گالیاں سنائے جو ادھر ادھر سے آ کر قطار میں شامل ہو گئے تھے اور اب بڑے مزے سے پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے دونوں ہی باتیں بیکار تھیں۔ وہ چپ چاپ بس سے نیچے اتر آیا۔ اس نے سوچا۔ "اب جب نئے سرے سے قطار بنے گی تو میں اس قطار کا پہلا فرد ہوں گا۔ اب میں دیکھوں گا کہ کیسے کوئی مجھ سے پہلے بس میں داخل ہوتا ہے۔" وہ کھڑا دیکھتا رہا اور لوگ اپنے آپ کو بس میں ٹھونستے رہے۔ جیسے جیسے لوگ بس میں داخل ہوتے تھے اس کا غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ بھوک، پیاس اور سخت دھوپ اور اس پر یہ احساس کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے حق میں کڑواہٹ سی گھلتی ہوئی محسوس کی۔ اس نے ایک نظر بس پر بیٹھے ہوئے

مسافروں کو دیکھا اور پھر منہ پھیر کر حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔

بس رینگتی ہوئی سامنے سے گذر گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس طویل قطار کے بہت سے لوگ بس میں سوار ہونے سے رہ گئے تھے اور اس طرح از سرنو ایک چھوٹی سی قطار بن گئی تھی۔ جو لحہ بہ لحہ طویل سے طویل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خود اس قطار کا پہلا فرد تھا۔ اس خیال سے وہ مطمئن تھا کہ اب بس آئے گی تو وہ اس میں داخل ہونے والا پہلا فرد ہو گا۔

قطار کا پہلا فرد ہونے کی حیثیت سے وہ جتنا مسرور اور مطمئن تھا اتنا ہی اپنے آپ کو پابند بھی محسوس کر رہا تھا۔ دھوپ میں کھڑے رہنے کی وجہ سے پیاس لگنے لگی تھی لیکن وہ سامنے کے ہوٹل تک جا کر پانی کے دو گھونٹ نہیں پی سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک لحہ کے لئے بھی اس نے اپنی جگہ چھوڑی تو دوبارہ حاصل نہیں کر سکے گا۔

وقت گذرتا گیا اور قطار طویل تر ہوتی گئی۔

پھر ذرا دیر بعد ایک بوڑھا لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا آیا۔ اور اس کے آگے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے یہ دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے پھر کسی نے اس سے اس کا حق چھین لیا ہو' وہ ہر بات سہ سکتا تھا مگر یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ قطار میں کوئی اس کے آگے آ کر کھڑا ہو جائے۔

"بابا۔ ادھر جاؤ پیچھے۔" اس نے قطار کے آخری سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا تم پہلے چڑھ جانا بس میں۔ میں بوڑھا....."

"میں کہتا ہوں' پیچھے جاؤ----" اس نے بوڑھے کی بات کاٹتے ہوئے کہا ____ وہ بڑبڑاتا ہوا قطار کے آخری سرے کی طرف چل دیا۔ اور جب وہ لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا قطار میں سب سے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا تو اس کے ضمیر نے ملامت کرنا شروع کر دیا "تم نے برا کیا---- یہ تم نے برا کیا---- وہ تمہارے سہارے اگر بس میں سوار ہو جاتا تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔ اب بیچارے کو جگہ ملے نہ ملے' خدا جانے کب تک کھڑا رہنا پڑے۔"

"سب ٹھیک ہے---- سب ٹھیک ہے۔" اس نے اپنے ضمیر کی آواز کو کچل دیا: "میں نے اگر اسے لوٹا دیا تھا تو کسی اور نے بھی تو اسے اپنے آگے جگہ نہیں دی۔ یہاں کون کسی کے دکھ کا احساس کرتا ہے۔"

اور جب بس آئی تو وہ اس میں سوار ہونے والا پہلا شخص تھا۔

اپنی پسند کی جگہ بیٹھا تو ایک انجانی فتح کے احساس سے ایک لطیف سی مسکراہٹ اس کے خشک ہونٹوں کو تر کر گئی۔ اس ایک تبسم کے لئے وہ ایک گھنٹہ تک دوپہر کی دھوپ میں جلتا رہا تھا ذرا ذرا سی مسرتوں کے لئے کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

اور اب بس اتنی بھر گئی تھی کہ ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں رہی تھی۔

اس کے پاس کھڑے ہوئے ایک مسافر نے اس سے کہا۔ "آپ ذرا ادھر سرک جایئے بخار کی وجہ سے میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے بیٹھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ مل جائے گی۔" مگر سنی ان سنی کر کے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"اونہہ بیٹھنے کے لئے کیسے کیسے بہانے تراشتے ہیں۔" اس نے اپنے آپ سے کہا مگر اسی لمحہ سے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے منہ پر ایک زور دار طمانچہ رسید کر دیا ہو۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنی جگہ اسے دے دی تھی اور جب وہ وہاں بیٹھا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کا جسم سچ مچ بخار سے تپ رہا ہے۔ اس کے ذہن کو پھر ایک جھٹکا سا لگا۔

"مجھے یہ کیا ہو گیا ہے آخر؟" اس نے سوچا۔ "آج میں اس قدر بداخلاقی اور کم ظرفی کا مظاہرہ آخر کیسے کر رہا ہوں؟"

بس چلنے ہی کو تھی کہ ایک صاحب بھاگتے ہوئے آئے اور بس میں سوار ہو گئے۔ اسے پہلی ہی نظر میں کچھ یوں لگا جیسے وہ انہیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہو۔ مگر کہاں؟---- اسے یاد نہیں تھا اور وہ یاد کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بس چلنے لگی تو وہ باہر دیکھنے لگا مگر ذہن نے پھر سوال کیا۔ یہ بھورے بالوں والے سنہرے فریم کی عینک لگائے آخر ہیں کون صاحب؟ "کون ہیں؟" ____ "کون ہیں؟" کی خاموش صدائیں اس کے ذہن کے دروازے پر دستک دیتی رہیں۔ وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور پھر ذہن کا دروازہ اچانک کھل گیا' بجلی کا کوندا سا لپکا اور یادوں کی رہگذر میں دور تک اجالا پھیل گیا۔

اس کے تصور میں ڈاکٹر رحمٰن کا چھوٹا سا خوبصورت سا بنگلہ ابھر آیا۔ اس روز وہ پہلی مرتبہ ان کے پاس ایک کتاب لینے کے لئے گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کال بیل کا بٹن دبا دیا تھا اور پھر ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر رحمٰن ایک ہاتھ میں سنہری عینک لئے دوسرے ہاتھ سے

اپنے بھورے بالوں کو سنوارتے ہوئے نمودار ہوئے تھے۔ اس نے اپنا تعارف کرا کے انہیں تکلیف دینے کا مقصد بیان کیا۔ وہ خاموشی سے اندر چلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں اس کی مطلوبہ کتاب تھی۔ انہوں نے ایک لفظ کہے بغیر کتاب اس کے حوالے کر دی اور جب وہ شکریہ کہہ کر واپس جانے کے لئے مڑا تو انہوں نے کہا۔ "دیکھو کتاب کو احتیاط سے پڑھنا۔ ہو سکے تو اس پر کور چڑھا لینا۔"

اور اچانک اسے یوں لگا جیسے ڈاکٹر رحمٰن اسے بیوقوف سمجھتے ہیں اسے اس بات کا بھی افسوس ہوا کہ ڈاکٹر رحمٰن اس کے ساتھ بہت سرد مہری سے پیش آئے۔ اس سے بیٹھنے تک کو نہیں پوچھا یہ اس کی طبیعت پر کچھ ایسی ناگوار گذری تھی کہ اس نے وہاں کبھی نہ آنے کا عہد کر لیا تھا۔ اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس روز انہوں نے ذرا بھی اخلاق کا مظاہرہ کیا ہوتا تو وہ ان کے لئے جگہ چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا مگر اب وہ انہیں نظر انداز کر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

یادوں کا کارواں چلتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر وہ ڈاکٹر رحمٰن کے بنگلے میں کھڑا تھا۔ اس مرتبہ وہ کتاب لوٹانے کے لئے آیا تھا اور جب اس مرتبہ کال بیل کا بٹن دبایا تو ڈرائنگ روم کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ اور آدھا ہی کھلا رہ گیا تھا۔ جب اس کی نگاہیں اٹھیں تو وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ دروازے میں ایک نیلی آنکھوں والی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے رخسار پر گلابی غبار سا اڑتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک سرخ گلاب کا پھول اپنے بالوں میں سجا رکھا تھا۔ سیاہ بالوں میں سرخ پھول اسے اتنا اچھا لگا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا۔

ڈاکٹر صاحب ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کون۔ بابا---- بابا تو گھر پر نہیں ہیں!"

"میں یہ کتاب واپس کرنے آیا تھا۔"

"جی بہت اچھا----!"

ایک خوبصورت ہاتھ جس میں ایک سیاہ چوڑی کے سوا کچھ نہ تھا اس کی طرف بڑھا۔ اس نے کتاب بڑی آہستگی سے اس نازک ہاتھ میں تھما دی۔ اور لوٹ آیا----

بنگلے سے باہر نکلتے ہوئے گیٹ پر لمحہ بھر کے لئے رک کر اس نے نیلی آنکھوں اور لانبے لانبے سیاہ بالوں والی لڑکی کو دیکھنا چاہا مگر وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

اور آج پھر وہ نازک سی کومل سی لڑکی مجسم سوال بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "کیا میرے بابا کو جگہ نہ دو گے؟"

وہ ہڑبڑا کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ڈاکٹر رحمٰن سے کہنے لگا---- "آیئے ڈاکٹر صاحب تشریف رکھئے نا----!"

زن بیزار

بہت بڑی عمارت ہے' مگر بڑی ہی نحوست زدہ! چھوٹے چھوٹے تاریک اور سیل خوردہ کمرے' روشنی کا انتظام ہے نہ ہوا کا گزر۔ باہر سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے پھٹکار برس رہی ہے۔

آپ ہوٹل میں داخل ہوں تو آپ کو اپنے دائیں اور بائیں چھوٹے چھوٹے ڈربے نما کمروں کی قطاریں نظر آئیں گی۔ دائیں طرف پہلے اور دوسرے کمرے میں ہوٹل کے منیجر کا دفتر اور گھر ہے' اس کے سامنے کی قطار میں دو تین کمرے ہوٹل کے ملازمین کی رہائش اور باورچی خانے کے لئے مخصوص ہیں کمروں کی دو رویا قطاروں کے درمیان چند میزیں اور ان کے گرد کرسیاں پڑی ہوئی ہیں' یہ گویا ڈائننگ ہال ہے' اس منزل کے بقیہ کمرے جو اس قدر تاریک ہیں کہ چوبیس گھنٹے بجلی جلائے رکھنی پڑتی ہے۔ ہوٹلوں میں مستقل قیام کرنے والے کرایہ داروں کی جنت ہیں' ان کمروں کا کرایہ حیرت انگیز طور پر کم ہے' یہ الگ بات ہے کہ ان کمروں سے ملحق غسلخانہ ہے نہ بیت الخلاء۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے ان کمروں کے کرایہ داروں کی آسانی کے لئے ایک کونے میں چند غسلخانے اور بیت الخلاء تعمیر کروا دیئے ہیں۔ ہوٹل کے اصل نقشے میں ان کے لئے گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ مگر ہوٹل کی انتظامیہ کو نیک نامی بھی درکار تھی اور فیض کے اسباب بنوانا بھی مقصود تھے' اس لئے کمروں کی دو رویا قطاروں کے درمیان ان کے لئے جگہ نکالی گئی تھی۔

استاد کا کمرہ بیت الخلاء سے ملحق تھا اور پڑوس تعفن سے مہکتا رہتا تھا' انوار مجھے ان کے پاس لے کر گیا تو میرے لئے چند لمحے بیٹھنا بھی محال ہو گیا' میں نے چپکے سے انوار کے کان میں کہا۔

"استاد یہاں کیسے رہتے ہیں؟"

"استاد کو یہ خوشبو بہت پسند ہے!" انوار نے زور سے جواب دیا۔

میں گھبرایا کہ استاد کہیں اس ناشائستہ گفتگو پر کبیدہ خاطر نہ ہو جائیں' مگر وہ ٹال گئے۔

بڑی شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے۔ ''اچھا! اچھا۔ بہت بدمعاش ہو گئے ہو۔

''استاد یہ میرے دوست ہیں جاوید!'' انوار نے میرا تعارف کرایا۔

''کیا لکھتے ہیں؟'' استاد نے جھٹ سے پوچھا۔

''شریف آدمی ہیں۔ کچھ نہیں لکھتے!'' انوار بولا۔

''پھر تمہارے دوست کیسے ہیں!'' استاد نے کہا۔

''کیونکہ میں بھی شریف آدمی ہوں!'' انوار نے کہا۔

استاد کا چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری تھا'

میں نے استاد سے پوچھا---- مگر استاد نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہم دونوں دفتر کے ساتھی ہیں۔''

''اور آپ ہیں استاد۔'' انوار نے استاد کا تعارف کرانا شروع کیا۔ ''بہت بڑے ادیب' محقق' تنقید نگار' مدیر اور ایک عظیم المرتبت شاعر!''

میں واقعی رعب میں آ گیا۔ میں نے عرض کیا۔ ''آپ کے نیاز حاصل کر کے بے پناہ مسرت ہوئی!''

استاد نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور خاموش رہے۔

استاد کا کمرہ بے ترتیبی کا شاہکار تھا' کسی کو بے ترتیبی کی تصویر دکھانی مقصود ہو تو اسے استاد کا کمرہ دکھانا ہی کافی ہے۔ کتابیں' تنقید اور تبصرے کے لئے آئے ہوئے رسالے احباب' پرستاروں اور فنکاروں کے خطوط' میلے کپڑے' سڑے ہوئے موزے' قلم دوات' گوند دانی اور الم غلم یوں ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں' جیسے کسی نے ان تمام اشیاء کو کچرا سمجھ کر ڈھیر لگا دیا ہو اور استاد اس پھول کی طرح تھے جو کچرے پر کھل کر مرجھا گیا ہو۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک کتاب اٹھائی' ایک جگہ سے کھولی تو دو موٹے موٹے کھٹمل گہری نیند سے چونکے اور حواس باختہ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ میں نے گھبرا کر کتاب پھینک دی۔

''کیا ہوا----؟'' استاد نے پوچھا۔

''کھٹمل تھے اس میں!'' میں نے کہا۔ استاد نے ''ہوں!'' کہا اور خاموش ہو گئے استاد کا اطمینان دیکھ کر مجھے اپنی بوکھلاہٹ پر شرمندگی سی ہونے لگی۔ کھٹمل ہی تو تھے بلائے بے درماں تو نہ تھی'

ہوٹل سے نکلے تو میں نے انوار سے پوچھا۔ "تو یہ تمہارے استاد ہیں۔"

انوار قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "میرے کیا دنیا بھر کے استاد ہیں۔ جگت استاد۔ مانتے سب ہیں ان کی استادی!"

"ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے!"

"پتہ نہیں لوگ کہتے ہیں کہ ان کے بیوی بچے بھی ہیں!"

"تو یہ ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟" مجھے استاد پر بڑا ترس آ رہا تھا۔

"ان کے ساتھ بنتی نہیں!"

"کیوں----؟" انوار نے دہرایا اور ہنسنے لگا۔ اور ہنستے ہنستے کہنے لگا۔ "اس لئے کہ استاد ہیں "زن بیزار"____ عورت کے سائے سے بھی دور بھاگتے ہیں----!"

"میں بہت سنجیدہ ہوں انوار----"

"میں بھی مذاق نہیں کر رہا ہوں-!" انوار نے جواب دیا۔

پھر ایک دن استاد سے سر راہے ملاقات ہو گئی' مجھے روک کر کہنے لگے "مجھے ایک ملازم کی تلاش ہے۔ تمہاری نظر میں کوئی مناسب آدمی ہو تو اسے مجھ سے ملا دو۔

"استاد آپ کو کیسا ملازم چاہئے!" میں نے پوچھا۔

"نویں دسویں جماعت کا طالب علم ہو تو اچھا ہے' ڈاک خانے سے ڈاک لا دے' پریس میں رسالے کا میٹر دے آئے' بینک سے چیک کیش کرا لائے گویا اسی نوعیت کے چھوٹے موٹے کام ہیں' دو تین گھنٹے کے لئے روزانہ آ جایا کرے تو کافی ہے' باقی وقت مزے سے اپنی تعلیم پر صرف کرے۔"

"میری نظر میں ایک ایسا لڑکا ہے!" میں نے کہا۔

"مگر ایک شرط ہے!" استاد بولے۔ "نوک پلک سے آدمی کا بچہ لگتا ہو۔"

"آپ کو پسند آئے گا۔" میں نے کہا۔

"تو بس ٹھیک ہے۔" استاد نے کہا "میں اس کی فیس بھی معاف کرا دوں گا اور ہو سکا تو کتابیں بھی مفت میں دلوا دوں گا۔"

احسان سے میری ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی' میں ایک دوست کے انتظار میں تھا اور شام کے اخبار میں فرار' اغوا اور جنسی جرائم کی چٹ پٹی خبروں سے دل بہلا رہا تھا کہ کسی نے پوچھا۔ "میں یہاں بیٹھ جاؤں۔" میں نے نگاہیں اٹھائے بغیر ہی کہا۔ "بیٹھو۔"

تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ "ایک چائے پلا دیجئے۔" میں نے اخبار پر سے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا رنگ سانولا اور نقوش سادہ تھے۔ اس کے دائیں گال پر ایک بڑا سا بھدا سا تل تھا' وہ تل اگر نہ ہوتا تو شاید نگاہوں کو کچھ بھلا لگتا۔ لیکن اب اسے کسی بھی زاویئے سے جاذب نظر نہیں کہہ سکتے تھے ہاں اس کی سیپیوں کی طرح چمکیلی آنکھوں میں ایک کشش تھی جو صحت مندی اور پاکیزگی کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے' ایک معصومیت تھی جو اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ وہ زندگی کی فریب کاریوں میں ابھی ملوث نہیں ہوا ہے۔ ایک ایسا بھولپن تھا جسے دیکھتے ہی خباثت اپنا جال بچھانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

میں نے چائے منگا دی تو اس نے بتایا کہ وہ ملتان سے یہاں ملازمت کی تلاش میں آیا ہے۔ وہ باعزت طور پر کام کرنا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی پڑھائی جاری رکھنا چاہتا ہے۔

احسان کو استاد سے ملایا تو وہ بہت خوش ہوئے! انہوں نے اس کا انٹرویو لینے سے پہلے ہی چائے اور ڈھیر سارے بسکٹ منگا لئے۔ اور پھر انہوں نے اس کا انٹرویو لئے بغیر ہی اسے ملازمت پر رکھ لیا۔

کوئی ہفتے بھر بعد میں احسان کے بارے میں پوچھنے کے لئے گیا۔ استاد مجھے دیکھتے ہی ابل پڑے---- "وہ تو بہت بیہودہ ثابت ہوا' انتہائی خود سر اور بے ایمان!"

"کیا ہوا استاد؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ایک جگہ اسے رقم لینے کے لئے بھیجا تھا" استاد نے بتایا "وہاں سے پیسے لئے اور چٹ کر گیا۔ مجھ سے کہا وہ صاحب ملے ہی نہیں۔ بعد جب اس حرکت کا علم ہوا اور میں نے اس سے باز پرس کی تو لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اسے نکال دیا ہے۔"

مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ "ہو سکتا ہے استاد وہ صاحب جھوٹ بول رہے ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" استاد نے کہا۔ "کوئی بات تھوڑی ہی ہے' برس ہا برس کا لین دین ہے۔"

اس روز شام تک میں احسان کو تلاش کرتا رہا۔ اور جب وہ مجھے ملا تو مجھے اپنے غصے پر قابو نہ رہا۔ میں نے اسے بے بھاؤ کی سنا ڈالیں۔

وہ بہت تھکا ہوا تھا' اس کے چہرے پر نقاہت کے ہلدی پتی ہوئی تھی بات کرنا بھی اس کے لئے دشوار تھا۔

"آپ اتنا ناراض کیوں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

میرے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ "بہت بھولے بنتے ہو۔ تم نے سوچا تھا کہ میں شاید تمہیں تلاش نہ کر سکوں گا۔ اور تم استاد کی رقم آسانی سے ہضم کر لو گے۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔ کونسی رقم۔ استاد نے مجھے ایک پیسہ نہیں دیا پھر اس نے اپنی قمیض کا دامن اٹھا کر اپنا پیٹ ننگا کر دیا۔ اس کا پیٹ کمر سے چپکا ہوا تھا۔ "میں نے تین دن سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ میرے پاس پیسے ہوتے تو کیا میں انہیں اپنے کفن کے لئے رکھتا۔"

میں لمحہ بھر میں سر سے پاؤں تک پسینے میں نہا گیا۔

"پھر انہوں نے تمہیں ملازمت سے کیوں نکالا۔" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے تو نہیں نکالا میں خود چھوڑ آیا۔"

"کیوں۔"

"کیوں۔۔۔۔!" اس نے دہرایا اور اس کا بدن ہچکیوں سے کانپنے لگا۔

"مجھے بتاؤ آخر بات کیا ہے۔" میں نے اس سے دریافت کیا۔

اس نے آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "پہلے وعدہ کریں کہ میں جو کچھ آپ کو بتاؤں گا آپ کسی سے نہیں کہیں گے۔"

میں نے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔ "تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو!"

"میرے گال پر یہ تل ہے نا؟"

"ہاں! ہاں! تو پھر کیا ہے۔"

"یہ تل استاد کو بہت پسند تھا۔" اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس مسکراہٹ میں کتنے رنگ تھے' طنز تھا' تمسخر تھا' شکوہ تھا' اور احساس بیچارگی تھا۔

"استاد کہتے تھے وہ بولا۔ "مجھے اس تل کا بوسہ دے دو میں ہنس کے ٹال دیتا۔۔۔۔ مگر اس روز انہوں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر مجھے دبوچ لیا ____ میں بڑی مشکل سے وہاں سے نکل کر بھاگا ہوں۔"

اس نے بڑی رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"مجھے ایسی ملازمت نہیں کرنی۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں مرجاؤں گا مگر ایسی ملازمت ہرگز نہیں کروں گا۔ ایسی ملازمت کرنی ہوتی تو اپنا گھر چھوڑ کر اتنی دور کیوں آتا وہیں شہزادہ بن

کر کیوں نہ رہتا۔"

میں نے احسان کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ اس کی سیپیوں کی طرح چمکیلی آنکھوں میں ایک ایسی کشش تھی جو صحت مندی اور پاکیزگی سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک معصومیت تھی جو اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ زندگی کی فریب کاریوں میں ابھی ملوث نہیں ہوا ہے۔ ایک ایسا بھولپن تھا جسے دیکھتے ہی خباثت اپنا جال بچھانے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

ساوتری

ناصر کمرے میں سے گذر کر صحن میں داخل ہوا اس نے دیکھا کہ سامنے نیم کی گھنی چھاؤں میں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی مصالحہ پیس رہی ہے۔ اس کے پاس ہی ڈیڑھ دو سال کا چھوٹا سا گول گپنہ بچہ پلاسٹک کی گڑیا سے کھیل رہا ہے۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا کہ کہیں کسی غلط جگہ تو نہیں آگیا۔ مگر نوراں بی بی نے فوراً ہی کہا۔ "چلے آؤ' کیوں رک گئے ہو؟" وہ آگے بڑھ گیا۔

مکان چھوٹا اور صاف ستھرا تھا' ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی' جس گھر میں نیم کا درخت ہوتا ہے اس میں عموماً کوڑا کرکٹ بہت ہوتا ہے۔ نیم کی پتیوں اور نمکولیوں کا کوڑا اور اس پر کوؤں اور دوسرے پرندوں کی لائی ہوئی ہڈیوں' روٹی کے ٹکڑوں' گلے سڑے پھلوں اور ان کی بیٹ کا کوڑا مگر صحن میں اس وقت ایسا کوڑا بھی نہیں تھا' نیم کی جڑ کے پاس لکڑی کی گھڑونچی پر دو کچی گھڑیاں رکھی ہوئی تھیں' اسے بہت زور کی پیاس لگ رہی تھی' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"اگر اجازت ہو تو ایک گلاس پانی پی لوں۔"

"ایک گلاس نہیں دو گلاس پیجئے۔"

اس نے لڑکی کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ستارے رقص کر رہے تھے۔ اس نے پانی پیا اور پاس ہی پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"انہیں اندر کمرے میں بٹھاؤ' نوراں۔" وہ بولی۔ "میں ذرا یہ کام نمٹا لوں۔"

نوراں اسے کمرے میں پہنچا کر بولی۔ "اچھا اب میں چلتی ہوں!"

"کہاں۔۔۔۔؟" اس نے پوچھا۔

"میں اب یہاں کیا کروں گی؟"

"اچھا۔۔۔۔" وہ ہنس دیا۔ "جیسے تمہاری مرضی!"

اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پاس پاس دو پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ اور ان پر

صاف ستھرے بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں سنگھار میز رکھی تھی' اس نے سنگھار میز کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ دھوپ اور لو میں چل کر آنے کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ماتھے اور چہرے کو رومال سے صاف کیا' دل کو ڈھارس بندھائی اور چھت کا پنکھا کھول کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

نوراں بی بی کو وہ بہت دنوں سے جانتا تھا' وہ بے اولاد تھی۔ عمر ڈھل گئی تھی اور اولاد کی آس دم توڑ چکی تھی۔ شاید اسی محرومیت نے اسے دائی کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا وہ لانبے قد اور گٹھیلے جسم کی عورت تھی' کبھی خوبصورت بھی رہی ہو گی اس کے سینے میں بڑا درد مند دل تھا' وہ ہر ملنے والے کے مسئلہ کو اپنا ذاتی مسئلہ بنا لیتی تھی۔

ناصر کی یونانی دواؤں کی دوکان تھی' نوراں اس کی دوکان پر دوائیں خریدنے کے لئے آیا کرتی تھی۔ ایک دن دکان میں کوئی دوسرا گاہک نہیں تھا۔ وہ اس سے پوچھنے لگی۔

"تمہاری شادی ہو گئی ہے!"

"نہیں ابھی نہیں۔" ناصر نے جواب دیا۔

"تو پھر شادی کرو گے---- میرا مطلب ہے سچ مچ کی نہیں ویسی ہی؟" وہ بولی۔

"ویسی کیسی؟ گڈے گڑیوں والی؟" ناصر نے پوچھا۔

"نہیں رے---- جیسے سمجھتے ہی نہیں' گھنٹہ دو گھنٹہ کی شادی۔"

"نہ بابا---- نا" اس نے گھبرا کر کہا۔ اس کا کنوارا ذہن اس بے باکی پر شرما کر رہ گیا۔

نوراں جب بھی اس کی دوکان پر آتی اور اسے موقعہ ملتا وہ اپنی پیشکش دہراتی۔

"ارے دیکھ تو چل کے۔ ایسی فس کلاس ہے کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔" اور آج آؤ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جا کر دیکھ تو لے گا ہی۔

"آپ بور تو نہیں ہو رہے؟"

اس نے نگاہیں اٹھا کے دیکھا وہ دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے لہجے یا چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کسی اجنبی مرد سے باتیں کر رہی ہے ایسا لگتا تھا جیسے ناصر کو وہ برسوں سے جانتی ہو۔

"میں ذرا مصالحہ بھون لوں بس' اتنے آپ ریڈیو لگا لیجئے---- یا لیجئے گڈو سے کھیلئے۔ آپ کو بچے پسند ہیں!---- یہ بہت اچھا بچہ ہے' رونا تو جانتا ہی نہیں۔

اور اس نے بڑھ کر گڈو کو اس کی گود میں بٹھا دیا۔ وہ جب اس کے قریب آئی تو اس

کے ہاتھوں میں سے ہلدی اور پیاز کی بو آ رہی تھی۔ اسے لمحہ بھر کو احساس ہوا کہ یہ عورت کوئی غیر نہیں اس کی اپنی بیوی ہے۔ اس کی گود میں بیٹھا ہوا وہ گول گپہ بچہ بھی اس کا ہی ہے' اور اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کا مالک بھی وہی ہے۔

"آپ آرام سے لیٹ جایئے نا۔" اس کے لہجے میں اس قدر اپنائیت اور بے تکلفی تھی جیسے وہ جنم جنم سے اس کو جانتی ہو۔

وہ لیٹ گیا اور اس نے بچے کو اپنے پیٹ پر بٹھا لیا۔ بچے نے اس کی جیب میں سے قلم نکال لیا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور جب کوئی مصرف سمجھ میں نہ آیا تو اسے اپنی ناک اور منہ میں دینے لگا۔ اسے بچے کی بے تکلفی بہت اچھی لگی۔ وہ بچے کے پیٹ میں گدگدیاں کر کے اسے ہنسانے لگا۔

باورچی خانے سے مصالحے بھننے کی سوندھی سوندھی مہک آ رہی تھی---- اس کے پیٹ پر بیٹھا ہوا ایک خوبصورت اور صحت مند بچہ کھلکھلا کر ہنس رہا تھا' اسے یاد آیا کہ ایسا ہی کوئی خواب اس کی بے چین روح نے دیکھا تھا یہی وہ سکون اور طمانیت تھی جس کی آرزو اس کے سینے میں جاگتی رہتی تھی۔

"ارے یہ تو آپ سے یوں بے تکلف ہو گیا' جیسے آپ ہی کا بیٹا ہو۔" اس نے کہا۔

"یہ تمہارا بچہ ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"ہاں----!" اس نے دوسرے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے' تمہارے شوہر بھی ہوں گے۔"

"ہاں ہیں۔"

"انہیں کوئی اعتراض نہیں کہ....."

"اعتراض کیوں نہیں ہو گا' مگر انہیں پتہ کیسے چل سکتا ہے؟"

"اور اگر پتہ چل جائے!"

"نہیں چل سکتا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"خیر مگر کیا تمہارا ضمیر یہ گوارہ کر لیتا ہے کہ تم....."

"آپ چاہتے کیا ہیں!" اس نے ناصر کی بات کاٹ کر کہا۔

"کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ضمیر کی آواز سنوں اور آپ کو دھکے دے کر باہر نکال دوں یا شور مچا کر محلے والوں کو جمع کر لوں اور ان سے کہوں کہ یہ شخص میری عزت

پر حملہ کرنے کی نیت سے میرے گھر میں گھس آیا ہے تاکہ آپ کو پکڑ کر وہ پولیس کے حوالے کر دیں۔

اس نے سہم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نہیں تھے مگر اس کی آواز میں تلخی گھلی ملی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے گفتگو کو غلط جگہ سے شروع کیا ہے وہ یہاں پند و نصائح کے دفتر کھولنے کے لئے تو نہیں آیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے؟" اس نے پوچھا۔

"کیا میری بات بری لگ گئی۔"

"نہیں تو۔۔۔۔" ناصر نے جواب دیا۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے' مجھے اس قسم کی بات کہنے کا کوئی حق نہ تھا۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ" اس نے کہنا شروع کیا۔

"میرا شوہر بہت خوبصورت ہے' بہت ہی خوبصورت آدمی ہے' میں شادی سے پہلے بھی اس پر مرتی تھی' وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ مگر شادی کے بعد نہ معلوم اسے کیا ہو گیا' وہ اب ایک اور عورت کے چکر میں ہے صبح گھر سے نکل جاتا ہے اور رات گئے گھر میں گھستا ہے یہ بچہ بیچارہ بھول گیا کہ اس کا باپ کون ہے۔ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں تو مجھے جھڑک دیتا ہے مجھے پریشان مت کرو' تھکا ہوا ہوں' میں سونا چاہتا ہوں۔" وہ کمبخت واقعی اسے اتنا تھکا دیتی ہے "پتہ نہیں اسے اس عورت میں کیا نظر آیا۔ میں کہتی ہوں آخر مجھ میں کیا کمی ہے؟"

اس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ خوبصورت جوان اور پھر اب تو وہ ایک ماں تھی۔

گڈو دودھ پیتے پیتے سو گیا تھا' اس نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اٹھ کر دروازے بند کر دیئے اور کھڑکیوں پر پردے ڈال دیئے۔ کمرے میں دھند سی چھا گئی۔ اس نے دونوں چارپائیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنا جمپر اتارا تو اچانک اس کی سڈول چھاتیاں اچھل کر سامنے آ گئیں اس کا رنگ گورا تھا' ناف کے اوپر داہنی طرف ایک بڑا سا تل تھا جس پر ملائم ریشمی بال اگ رہے تھے۔ اس کی مرمریں چھاتیاں جن کے رنگ میں نیل سا گھلا ہوا تھا' دو حیرت زدہ آنکھوں کی طرح اسے تک رہی تھیں۔

ناصر کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے ابھر آئے' وہ بری طرح بوکھلا گیا گھبراہٹ میں جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے ریڈیو آن کیا اور اسٹیشن کی تلاش میں سوئی گھمانے لگا۔

اس کی گھبراہٹ پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف پھیر لیا اور مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے کوئی گھبرائے ہوئے سہمے ہوئے بھولے بھالے بچے کو چھیڑنے کے لئے کرتا ہے۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا اور بے اختیار اس کے جسم کو اپنے بازوؤں میں لے کر بھینچ لیا---- ایک لمحہ جو لمحہ بھر میں گذر گیا اسے نوجوان لڑکے سے بھرپور مرد بنا گیا۔ اور جب وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑا ہوا اپنے کپڑے اور بکھرے ہوئے بال ٹھیک کر رہا تھا تو مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا بھی جاتا تھا وہ ابھی تک بستر پر دراز تھی اور اس نے اپنے بدن کو ایک چادر سے چھپا رکھا تھا۔

"تم سوچ رہے ہو گے کہ میں بہت خراب عورت ہوں۔ ہاں تم یہی سوچ رہے ہو گے' تمہاری جگہ اگر کوئی دوسرا مرد ہوتا تو وہ بھی یہی سوچتا۔ مردوں میں یہی تو خود غرضی ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ عورت کے سینے میں بھی دل ہوتا ہے۔" پھر جیسے وہ ناصر سے مخاطب ہوئی۔

"کیا مجھے زندگی گذارنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میرا شوہر میری طرف نظر بھر کر نہ دیکھے تو میں کیا کروں؟---- میں آوارہ نہیں ہوں اور میں نے آج تک کسی آوارہ مرد کو اپنے جسم کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دی!"

وہ چپ چاپ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اپنی انگلیوں سے اس کے ہونٹوں کو سہلانے لگا۔ پھر وہ بولا۔

"اب مجھے اجازت دو۔"

وہ جیسے خواب سے چونک گئی' اس نے اپنا ہاتھ چادر کے باہر نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اچھا خدا حافظ۔" وہ بولی۔ "اب کب آؤ گے؟"

"جلد ہی----"

ناصر نے اس کا نازک اور ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں

جھانک کر شرارت سے مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھیں مندھی جا رہی تھیں۔ جیسے اسے ٹوٹ کر نیند آ رہی ہو۔

پھر ناصر نے اپنی جیب میں سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکالے اور اس کے ہاتھ میں تھما دیئے وہ نوٹ کا لمس محسوس کرتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے ناصر کی طرف یوں اچھال دیئے جیسے وہ نوٹ نہیں جلتا ہوا انگارہ تھے۔ اس نے غصے سے دہکتے ہوئے ناصر کو دیکھا۔

اور پھر بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم نے آخر مجھے سمجھ کیا لیا ہے'---- تمہارے خیال میں میں کوئی طوائف ہوں کہ تم میری قیمت چکانے چلے ہو۔"

ہزاروں کا مال

"آخر مان ہی گئے نا----؟"

"جی----!" اس نے شرما کر کہا اور مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"بس اتنی سی بات تھی۔" میں نے کہا۔ "اور تم اسے چھپا رہے تھے جیسے محبت نہیں کوئی بہت بڑا گناہ کر رہے ہو۔ سنو محبت گناہ نہیں اور لوگ صرف اپنے گناہوں کو چھپاتے ہیں!"

"جی۔" اس نے کچھ اس انداز سے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو میری سمجھ میں خاک نہیں آیا اس لئے میں نے موضوع بدل دیا۔

"بھئی ایک بات ہے یعقوب میں تمہارے انتخاب کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا واقعی تمہاری وہ بہت خوبصورت ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"رجیاں۔"

"رضیہ! ہاں رضیہ تمہاری واقعی بہت خوبصورت اور بہت شریر بھی۔"

یعقوب کے چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ بھی رضیہ کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پاتا کیونکہ میرے اور اس کے درمیان کئی پردے حائل تھے۔ میں حالانکہ بہت جلد بے تکلف ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ان پردوں کو ہٹاتے ہوئے ہچکچاتا تھا اسے ہر وقت کا احساس رہتا تھا کہ وہ ہمارے گھر میں ایک نوکر کی حیثیت سے رہتا ہے۔ میں جب اس سے کہتا "بھئی یعقوب تم اگر نوکر ہو تو ماموں صاحب کے ہو میرے نہیں میرے لئے تم میرے دوست ہو۔" تو وہ ہنس دیتا جیسے میں نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ وہ کہتا۔ "نہیں شاہ جی! نوکر تو نوکر ہی ہوتا ہے۔ دوست نہیں ہو سکتا۔"

گرمیوں کی تعطیلات میں مجھے ماموں صاحب بلا لیتے تھے ان کا یہ چھوٹا سا گاؤں دراصل مجھے بہت ہی پسند تھا۔ قریب ہی سے پاکپٹن کینال بہتی ہے اور اس کے کنارے پر لگے

ہوئے درختوں کے گھنے سائے میں بے پناہ سکون اور خاموشی ہوتی ہے میں اپنے لکھنے پڑھنے کا سامان اٹھا کر ہر روز یہاں چلا آتا تھا اور پھر جب سائے بڑھتے بڑھتے شام کی سیاہی میں مدغم ہو جاتے تھے تو میں اپنی کتابیں سمیٹ کر گھر لوٹ آتا لیکن اس بار یعقوب کی موجودگی نے میرا معمول بدل دیا تھا۔ اب میں اکثر اس کے ساتھ ساتھ یونہی بیکار ادھر ادھر پھرتا رہتا۔

یعقوب سیدھا سیدھا دیہاتی لڑکا تھا۔ بھرے بھرے بازوؤں اور موٹی موٹی بھدی سی انگلیوں والا لڑکا۔ وہ میری انگلیوں کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔ "شاہ جی! تمہاری انگلیاں کیسی ہیں۔ پتلی پتلی لمبوتری سی!" اور میں اسے بتاتا کہ میں قلم کے گھوڑے دوڑاتا ہوں اور وہ پھاوڑا چلاتا ہے ہم دونوں کے کام مختلف ہیں اس لئے ہماری انگلیوں کی ساخت بھی مختلف ہے۔ وہ بڑے غرور سے اپنے بھرے بھرے بازوؤں پر نظر ڈالتا اور خاموش ہو جاتا۔

یعقوب عام نوکروں کی طرح بد دیانت نہیں تھا۔ وہ گھر کی ہر چیز کو اپنی سمجھ کر حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ کبھی کسی کام سے غافل نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے کسی کو اس سے شکایت نہیں ہوتی تھی۔ ماموں صاحب کے بچوں سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ چھوٹے بچے ہر وقت اسے پریشان کرتے رہتے تھے اس کے کپڑے کھینچتے' اس کے بال نوچتے لیکن اس کے ماتھے پر کبھی شکن تک نہ آئی اور بڑے پیار سے ان سے پیچھا چھڑا لیتا۔ وہ مجھ سے کہا کرتا۔ "شاہ جی نوکر ہمیشہ نہیں رہتے مجھے بھی پتہ نہیں کب جانا پڑے مگر میں سوچتا ہوں کہ ان بچوں کو کیسے بھلا سکوں گا قسم خدا کی مجھے اپنے بہن بھائیوں سے جیادہ ان بچوں سے پیار ہو گیا ہے۔

میں اس سے بہت جلد بے تکلف ہو جانا چاہتا تھا شاید اس لئے کہ وہاں اس کے علاوہ میں کسی کو نہیں چاہتا تھا لیکن وہ بہت محتاط تھا۔

اس روز ہم بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے یعقوب اپنے گاؤں کی باتیں کر رہا تھا کہ سامنے سڑک پر ایک لڑکی اپنے بیلوں کو ہانکتی ہوئی گذری۔ یعقوب اسے دیکھ کر ایک دم کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "شاہ جی بھینس پیاسی ہے اسے پانی پلا لاؤں بس ابھی آیا۔" پہلے دن تو میں اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی لیکن جب تین چار روز تک ایسا ہی ہوتا رہا تو مجھے یقین سا ہو گیا کہ یہ وقت کی پابندی اور ان دونوں کا ہمراہ تالاب پر جانا بے مقصد نہیں ہے اور ایک دن جب وہ اس لڑکی کو دیکھ کر بھینس کھول لایا تو میں نے کہا۔ "آج میں بھی چلوں گا' یعقوب!"

"تالاب پر شاہ جی؟" پریشانی اس سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"ہاں کیا حرج ہے۔ یہاں بھی تو بیکار پڑا ہوں۔" وہ خاموش ہو گیا۔ تالاب پر وہ لڑکی

پہلے سے موجود تھی۔ میں ذرا ان سے دور بظاہر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے میری تمام توجہ سبز سبز، کھیتوں کے پرے گاؤں کی طرف آتے ہوئے بیلوں کی اڑائی ہوئی گرد میں الجھی ہوئی ہے ذرا دیر تو وہ میری موجودگی کی وجہ سے اپنے آپ کو مجبور اور پابند سا سمجھتے رہے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میری توجہ ان کی طرف نہیں ہے تو انہوں نے آہستہ آہستہ باتیں کرنی شروع کر دیں۔ پھر یعقوب نے بھینس پر پانی پھینکتے پھینکتے اس لڑکی پر پانی اچھال دیا پانی اس کے چہرے اور سینے پر گرا اس نے بازو اٹھا کر آستین سے چہرے کا پانی خشک کیا اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو دیکھا اور شرما کو دوپٹہ کھینچ لیا آہستہ سے کچھ کہا اور جواباً یعقوب پر پانی اچھال دیا یعقوب نے دوبارہ اوک میں پانی لیا۔ لیکن ابھی پھینکنے نہ پایا تھا کہ میں نے پکار کر کہا۔ "کیوں بھئی پلا چکے پانی اور اس کی اوک سے پانی گر گیا۔"

میں نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر پوچھا۔ "یعقوب یہ تمہارے کپڑے کیسے بھیگ گئے؟" تو اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا بھینس جب دم ہلاتی ہے بہت چھینٹیں اڑتی ہیں اس سے کپڑے بھیگ جاتے ہیں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "یہ بھینس کی دم کی اڑائی ہوئی چھینٹوں سے بھیگے ہوئے کپڑے تو نہیں یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے اپنے اپنے نازک نازک ہاتھوں سے پانی پھینکا ہو۔" اور اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا جیسے کسی معصوم دوشیزہ کو کسی نے بھری محفل میں اس کے پیا کا نام لے کر ستانا شروع کر دیا ہو۔

لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے میں سب کچھ جانتا ہوں اس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اسے اس لڑکی سے محبت ہے۔ میں اسے بہتیرا یقین دلاتا کہ میں اس کی راہ کا روڑا نہیں بن جاؤں گا جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا اس کی مدد کروں گا۔ لیکن نہ معلوم کیوں وہ اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا کتنی عجیب بات ہے لوگ یہ ماننے کے باوجود کہ محبت جرم یا گناہ نہیں محبت کا اقرار نہیں کرتے حالانکہ یہ راز چھپائے نہیں چھپتا۔ شراب کہیں بھی لک چھپ کر کیوں نہ پی جائے آنکھوں کا خمار چغلی کھا ہی جاتا ہے۔

بعض اوقات یعقوب اتنی سنجیدگی سے انکار کر دیتا کہ مجھے خیال آتا کہ میرا شک محض غلط فہمی تو نہیں لیکن آخر ایک روز میرا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔

اس روز میں صبح ہی نہر کے کنارے چلا آیا تھا۔ ماحول پر خاموشی مسلط تھی اچانک فضا میں نقرئی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میں نے دیکھا رضیہ کھیت کی ڈول پر کھڑی بے تحاشا ہنس رہی

ہے اور یعقوب ہاتھ میں درانتی لئے اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے یعقوب نے اسے پاس بلایا لیکن وہ وہیں کھڑی ہوئی ہنستی رہی۔ یعقوب اس کی طرف بڑھا تو وہ بھاگ کر دور جا کھڑی ہوئی' اچانک یعقوب چلا اٹھا۔ "رجیا چاچا پھیروج!"

"کہاں؟" رضیہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا اور یعقوب نے ایک دم اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ رضیہ ذرا دیر اپنے آپ کو رہائی دلوانے کے لئے کسمائی لیکن یعقوب کے مضبوط بازوؤں میں اس کا نازک سا' کومل سا بدن مچل کر رہ گیا۔

اس روز جب میں نے اس سے تمام واقعہ کا تذکرہ کیا تو وہ انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگا "شاہ جی کسی سے جکر مت کرنا۔ میری اجت کا معاملہ ہے۔ اور مجھ سے جیادہ اس کی اجت کا سوال ہے میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ یہ بات مجھ تک ہی محدود رہے گی۔

رفتہ رفتہ یعقوب نے رضیہ کے متعلق ہر بات مجھے بتا دی کس طرح پہلی ملاقات ہوئی اور کس طرح یہاں تک نوبت پہنچی۔ اب رضیہ بھی مجھ سے خاصی بے تکلف ہو گئی تھی۔ جب کہیں مل جاتی تو ادھر ادھر کی دو ایک باتوں کے بعد یعقوب کے متعلق پوچھ لیتی۔ میں اس سے پوچھ لیتا "کیوں بھئی رضیہ شادی کا کب ارادہ ہے؟" اور اس کے رخسار غروب آفتاب کا منظر پیش کرنے لگتے۔

رضیہ میانے قد کی سانولی سی لڑکی تھی۔ بچپن میں نکلی ہوئی چیچک کے چند ایک داغ ابھی تک اس کے چہرے پر نمایاں تھے مگر وہ داغ اس کی خوبصورتی پر داغ نہ تھے بلکہ چاند کے داغوں کی طرح خوبصورت اور حسن افزا تھے اس کی فرح دبھائی آنکھیں مجھے بہت پسند تھیں۔ اور اس کے بات کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے پھول اور کلیوں کی بارش ہو رہی ہو۔

تکلفات کے رہے سہے پردے جو میرے اور ان کے درمیان حائل تھے۔ رفتہ رفتہ اٹھتے گئے۔ جہاں کہیں وہ دونوں ملتے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہتے۔ میں کھڑا دیکھتا رہتا۔ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے کبھی لڑتے جھگڑتے روٹھ جاتے اور پھر ایک دوسرے کو منا لیتے۔ میری موجود ان کی کسی بات میں حائل نہیں ہوتی تھی۔ یعقوب اسے اپنے توانا بازوؤں کے ہالہ میں لے کر چوم لیتا' اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپا کر زمین پر بیٹھ کر رونے لگتی۔ یعقوب اسے مناتا رہتا مگر وہ روتی رہتی پھر ایک دم قہقہہ لگاتی ہوئی بھاگ جاتی اور فضا میں ستار کے چھیڑے ہوئے تاروں ایسا مترنم ارتعاش پھیل جاتا۔

رضیہ کی غیر موجودگی میں وہ مجھ سے رضیہ کے متعلق ہی باتیں کرتا رہتا۔ اس دن وہ

پوچھنے لگا۔ "رجیاں خوبصورت ہے نا شاہ جی۔" میں نے رضیہ کی خوب تعریف کی۔ وہ بہت خوش ہوا کہنے لگا۔ "اچھا شاہ جی ایک تاویج لکھ دو۔"

مجھے بہت تعجب ہوا کہ رضیہ کی باتیں کرتے کرتے اسے تعویذ کیوں یاد آ گیا۔ میں نے کہا اول تو میں تعویذ لکھنا نہیں جانتا پھر تعویذ تمہیں کس لئے چاہئے۔

"نہیں شاہ جی!" وہ کہنے لگا۔ "تم سید ہو تم تاویج لکھ سکتے ہو۔ مجھے رجیاں کے لئے ایک تاویج لکھ دو!" مجھے اور بھی زیادہ تعجب ہوا۔ میں نے پوچھا۔ "رضیہ کو تم سے محبت ہے وہ تم سے ملتی ہے، تم سے شادی کرنے کا اس نے میرے سامنے اقرار کیا تھا۔ پھر آخر تم کیا چاہتے ہو!"

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب پراسرار سی چمک آ گئی کہنے لگا۔ "شاہ جی میں اسے بھاگ چلنے کے لئے کہتا ہوں لیکن وہ کسی طرح رجامند نہیں ہوتی۔ اگر میرے ساتھ چلی جائے تو شاہ جی قسم خدا کی ہجاروں کا مال ہے۔ ہجاروں کا!"

درس نو

عارف آج دیر سے اسکول پہنچا تھا۔

وہ جب اسکول کے احاطے میں پہنچا تو دعا ہو چکی تھی' لڑکے اپنی اپنی کلاسوں میں جا چکے تھے اور کسی کسی کمرے سے حاضری لینے کی آوازیں بھی آنا شروع ہو گئی تھیں مگر اس کے کلاس ٹیچر ابھی نہیں آئے تھے۔

عارف کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ سیدھا اپنی سیٹ پر گیا۔ جلدی سے اپنا بستہ ڈیسک کے اندر رکھ دیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا جیسے اس کے سر پر کوئی بہت بھاری بوجھ تھا جو اتر گیا ہو۔

"کیا بات ہے عارف؟" "اس کے بنچ کے ساتھی طارق نے اس سے پوچھا۔ آج بہت بوکھلائے ہوئے ہو۔"

"کچھ بھی نہیں!" عارف نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا "تمہارے لئے ایک ایسی چیز لایا ہوں کہ دیکھو گے تو بس دیکھتے ہی رہو گے۔"

"دکھاؤ۔" طارق نے کہا۔

"اوں ہوں! ابھی نہیں۔ انٹرویل میں!"

عارف ایک ہونہار طالب علم تھا۔ بھرا بھرا صحت مند جسم' ہنستی کھیلتی ذہین آنکھیں مسکراتا ہوا معصوم چہرہ' محنت اور تجسس کا عادی ذہن۔

انٹرویل ہوا تو عارف اور طارق کلاس سے باہر نہیں گئے۔ دوسرے لڑکے جب گرتے پڑتے ایک دوسرے سے الجھتے کمرے سے باہر چلے گئے تو طارق نے کہا۔ "اب دکھاؤ!"

"دکھاتا ہوں بھائی!" عارف نے کہا۔ "ایک شرط ہے مگر کسی کو پتہ نہ چلنے پائے۔ ورنہ میری شامت آ جائے گی!"

"تم مجھے ایسا سمجھتے ہو تو مت دکھاؤ۔" طارق روٹھ گیا۔

"نہیں ایسی بات تو نہیں ہے۔" عارف نے جلدی سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرنے کی کیا بات ہے' کیا چرا کر لائے ہو؟"

"ہاں چرا کر ہی تو لایا ہوں۔۔۔۔ بھائی جان کی الماری میں سے۔" عارف پھر لال بھبوکا ہو گیا۔

"خیر دکھاؤ تو۔۔۔۔ ہمارے علاوہ یہاں کون ہے!"

عارف نے بستے کے اندر سے چھپی ہوئی ایک کتاب نکالی جس کی جلد پر اخبار کا کاغذ چڑھا ہوا تھا۔ کتاب دیکھ کر طارق کو بڑی مایوسی ہوئی۔ کتاب میں ایسی رازداری کی کیا بات ہو سکتی ہے؟ اس نے جلدی جلدی چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس نے کتاب کے پہلے ہی صفحے پر ایک جٹا دھاری سنیاسی کی تصویر دیکھی ایک ورق پلٹا تو بڑے بڑے حروف میں لکھا کتاب کا نام ان کے سامنے آ گیا۔ "اصلی کوک شاستر۔"

"دیکھا۔" عارف نے بڑے فاتحانہ انداز میں طارق کو دیکھتے ہوئے کہا۔

طارق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر اس کتاب میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ عارف کے اوسان خطا ہو جا رہے ہیں۔ کتاب کا اگر "مبادیات کیمیا۔" کی جگہ "اصلی کوک شاستر" ہے تو اس میں رازداری برتنے کی اور اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

طارق کو مزا نہیں آ رہا تھا اس نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "تو یہ ہے جو لائے تھے میرے لئے!"

عارف کا سارا مزا کرکرا ہو گیا اس نے طارق کے چہرے پر ناامیدی کی پرچھائیاں دیکھیں تو جلدی سے کتاب کے بہت سے صفحے پلٹ دیئے ایک پٹاخہ چھوٹا۔ طارق ہکا بکا رہ گیا۔ ان کے سامنے ایک عورت کی تصویر تھی جو ناف تک بالکل برہنہ تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔ "اطالوی عورت۔" طارق ابھی تصویر کو پوری طرح دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ عارف نے کتاب بند کر دی۔ الطاف کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا ان کے پاس آیا اور ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ اسے اپنے راز میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر طارق نے کہا۔ "الطاف بھی اپنا دوست ہے' یہ کسی سے کہے گا تھوڑی!" اور پھر ایک ایک دو دو کر کے جو لڑکے کمرے میں آتے رہے وہ اس راز میں شریک ہوتے گئے۔ عارف اور طارق اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے تھے اور ان کے گرد عشاق

لڑکوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سانس روکے بے حس و حرکت کتاب کے اوراق کو گھور رہے تھے گویا کسی نے اگر جنبش کی تو یہ سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ ورق پلٹا جاتا تو گویا منظر تبدیل ہو جاتا تھا اور ہر بار ان کے نگاہوں کے سامنے تحیر کی ایک نئی دنیا آ جاتی تھی۔ اب آخری تصویروں سے گزر کر عورتوں اور مردوں کی دوہری تصویروں پر آ گئے تھے۔ یہ عجیب تصویریں تھیں۔ اپنی جیتی جاگتی زندگی میں انہوں نے کبھی یہ منظر نہ دیکھے تھے۔ انہیں اس بات کا ایک مبہم سا احساس ضرور تھا کہ انسانی تعلقات کا ایک رخ ایسا بھی ہے جو ہمیشہ ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ ان کا فطری تجسس انہیں اس بات پر اکساتا بھی تھا کہ وہ کسی طرح اس پراسرار دنیا کے رموز سے واقفیت حاصل کر لیں مگر انہیں کامیابی نصیب نہیں ہوتی تھی اور آج جب انسانی تعلقات کا وہ رخ ان کے سامنے آ گیا تھا تو ان کا ایک عجیب عالم تھا۔ وہ احساسات کی ایک ان دیکھی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔

وقت سبک روی سے گزرتا چلا گیا۔ ان میں سے کسی کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ کلاس روم میں ہیں اور چند لمحوں کے بعد انٹرویل ختم ہونے والا ہے---- وہ اس وقت چونکے جب کوئی بالکل ان کے سروں پر آ کر دھاڑا۔

"یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے----!" انہوں نے پلٹ کر دیکھا ان کے ماسٹر صاحب تھے۔ پھر بوکھلاہٹ انہیں اپنی اپنی سیٹیں بھی یاد نہ رہیں۔ عارف پر تو جیسے بجلی گر پڑی۔ اسے میز پر رکھی ہوئی کتاب چھپانا بھی یاد نہ رہا۔

"ہوں!" ماسٹر صاحب نے کتاب اٹھاتے ہوئے۔ "اچھا تو یہاں یہ تماشا ہو رہا تھا انہوں نے کتاب کے دو چار ورق الٹے پلٹے اور پھر ایک دم چیخ کر کہا۔ "کون لایا ہے اس کتاب کو؟"

کمرے میں موت کی سی خاموشی تھی۔

"میں پوچھتا ہوں یہ کتاب کون لایا ہے؟"

خاموشی!

"کیا میری آواز تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ رہی ہے۔"

خاموشی!!

"اکرام تم بتاؤ۔"

"جناب مجھے تو نہیں معلوم۔"

"صغیر تمہیں معلوم ہے۔"

"نہیں سر۔"

"اکبر تم بتاؤ۔۔۔۔!"

"سر مجھے نہیں معلوم!"

"ہوں۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے تم سب کی ملی بھگت ہے اور اس لئے تم سب ہی سزا کے مستحق ہو' مانیٹر' جاؤ اسٹاف روم میں سے میرا ڈنڈا لے کر آؤ۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر پوری کلاس کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ایک بھی لڑکا ایسا نہیں تھا جس کی آنکھوں میں جھانک کر وہ اندازہ کر سکتے۔ ہر لڑکے کا سر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی اس کے سینے کو مس کر رہی تھی۔

مانیٹر ڈنڈا لے کر آگیا تو انہوں نے کہا۔ "میں تم سب کو سزا دینا نہین چاہتا۔ اگر تم یہ بتا دیتے کہ یہ کتاب کون لے کر آیا ہے تو میں باقی تمام لڑکوں کو معاف کر دیتا۔ خیر تم سب کو سزا دینا بھی مشکل کام ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اور پوری کلاس کو شام تک کے لئے مرغا بنا دیتا تو اور بھی زیادہ آسان ہے میں اب بھی اس لڑکے کو معاف کر سکتا ہوں جو یہ بتا دے کہ یہ کتاب یہاں کون لایا تھا؟"

پوری کلاس کے جھکے ہوئے سروں میں سے ایک سر بلند ہوا اس نے پچاس جھکے ہوئے سروں کو دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ بلند کر دیا۔

"شاباش! ہاں بتاؤ۔۔۔۔" ماسٹر صاحب نے کہا۔

"جی۔۔۔۔ جی۔۔۔۔ یہ کتاب۔۔۔۔

"ہاں بتاؤ۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں' تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"جی یہ کتاب میں لایا تھا۔" عارف نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"تم۔! تم لائے تھے یہ کتاب!" ماسٹر صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور ڈنڈا لے کر عارف کی طرف لپکے۔ "تمہیں تو میں ایک اچھا لڑکا سمجھتا تھا!"

"مگر ماسٹر صاحب!" عارف نے جلدی سے کہا۔ "آپ نے تو کہا تھا کہ آپ معاف کر دیں گے!"

"ہاں کہا تھا' مگر تمہارے لئے نہیں' تم نہیں بچ سکتے' مجھے بیوقوف بنا کر بچنا چاہتے ہو' میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کر سکتا' پوری کلاس کا ستیاناس کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہیں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ پوری کلاس میں ایک دو لڑکے اور آ جائیں تو پھر تو ان کے اخلاق ان کے کردار کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

"سر غلطی ہو گئی ہے' معاف کر دیجئے اور پھر آپ نے کہا تھا۔۔۔۔۔

"بک بک مت کئے جاؤ۔۔۔۔ ہاتھ لاؤ۔۔۔۔ ہاتھ لاؤ ادھر!"

اور جب عارف نے ہاتھ بڑھایا تو ان کا سیاہ ڈنڈا اس کی بے داغ ہتھیلی پر ہی نہیں جسم کے ہر حصے پر برسنا شروع ہو گیا۔ اس پر بھی غصے کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو انہوں نے اس کو مرغا بنا دیا۔ پھر ایک لمبا سانس لے کر انہوں نے اپنے شاگردوں کو بتانا شروع کیا کہ وہ کس قدر گندی اور مخرب الاخلاق کتاب ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اپنی کلاس کو پڑھایا نہیں۔ ان کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ وہ بددلی سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر پیر اٹھا کر میز پر رکھ لئے ایک دو جماہیاں لیں اور آخر وہی کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگے رفتہ رفتہ کتاب میں ان کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ انہیں اس بات کا خیال ہی نہیں رہا کہ وہ کلاس روم میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک ایک نگاہ ان پر جمی ہوئی ہے۔

عارف مرغا بنے یہ سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی یہ کتاب اتنی گندی ہے جتنی ماسٹر صاحب نے بتائی ہے تو یہ بھائی جان کی الماری میں کیوں رکھی ہوئی تھی؟ بھائی جان تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ ان کی سب ہی تعریف کرتے ہیں' پھر یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ کتاب بھی گندی ہو سکتی ہے۔ اسے تو بچپن ہی سے کتاب کا احترام کرنا سکھایا گیا تھا۔ اس بات پر بھی بڑی الجھن ہو رہی تھی کہ اگر وہ ساری باتیں جو اس کتاب میں لکھی ہوئی تھیں گندی تھیں تو انہیں لکھنے ہی کی کیا ضرورت تھی اور سب سے بڑا پچھتاوا اسے اس بات کا تھا کہ اس نے سچ کیوں بولا۔

مرغا بنے بنے اس کی کمر اور گھٹنوں میں درد شروع ہو گیا تھا اور پاؤں لرزنے لگے تھے اس سے اب یہ اذیت برداشت نہیں ہو رہی تھی اس نے رحم طلب نگاہوں سے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا لیکن وہ اس سے بے نیاز کتاب کے اوراق میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دفعتاً" اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور اس نے فیصلہ کیا۔ وہ کان چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور پھر جب وہ اپنی سیٹ کی طرف بڑھا تو ماسٹر صاحب نے چیخ کر کہا "عارف کہاں جاتے ہو؟"

عارف جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے پلٹ کر ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجلاہٹ کے بڑے گہرے رنگ تھے جیسے وہ کہنا چاہتا ہوں ____ "ماسٹر صاحب آپ یہ کتاب پڑھئے' میں اپنا سبق پڑھتا ہوں'۔۔۔۔ نیا سبق۔"

مہمان

کیفے اقبال سے نکلے تو احسان رخصت ہو گیا اور میں پھر تنہا رہ گیا۔

یوں تو احسان میرا ایک ایسا دوست ہے جس کی موجودگی میں بھی تنہا رہتا ہوں۔ وہ آتا ہے تو ہمیشہ اپنے ساتھ باتوں کا اتنا ذخیرہ لاتا ہے کہ میں سنتے سنتے تھک جاتا ہوں مگر وہ کہتے کہتے نہیں تھکتا اور جب اس کی باتیں ختم ہو جاتی ہیں تو وہ ہاتھ ملا کر رخصت ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کی موجودگی سے تنہائی کا احساس ہٹ جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ریڈیو کے سامنے بیٹھے رہنے سے اکیلے ہونے کا احساس نہیں رہتا۔

اس شام میں بے حد اداس تھا۔ جوں جوں شام اترتی آئی تھی میری زندگی کا عظیم ترین المیہ اپنی نگاہوں میں سموئے میری طرف تکتی ہے۔ تو رنج کے کثیف سائے مجھے حراست میں لے لیتے ہیں اور تنہائی لمحہ بہ لمحہ پھیلتی ہوئی آگ کی طرح میری طرف بڑھتی ہے۔ ایسے لمحات میں مجھے کسی نہ کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو مجھے ان کربناک لمحات سے نجات دلا سکے۔

اور اس شام جب مجھے احسان ملا تو میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ وہ دو تین ہفتوں سے نہیں ملا تھا مجھے یقین تھا کہ مجھے سنانے کے لئے اب اس کے پاس باتوں کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہو گا۔

ہم دونوں کیفے اقبال میں آ کر بیٹھ گئے۔ اس نے ڈرامائی انداز میں اپنی داستان شروع کی۔ لوگ کہتے ہیں اور کچھ جھوٹ بھی نہیں کہتے ہیں کہ اس کے دماغ پر اداکاری کا بھوت اس نہج سے سوار ہوا ہے۔ کہ اس کی ہر بات میں اداکاری کا گمان ہوتا ہے۔ وہ چلتا ہے تو ڈرامائی انداز میں، کھاتا ہے تو ڈرامائی انداز میں اور بولتا ہے تو ڈرامائی انداز میں---- وہ ایک ہفتہ کراچی رہ کر آیا تھا جہاں بیک وقت دو لڑکیاں اور وہ ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے اور اب اسے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی کہ ان میں سے کس کو اپنے لئے منتخب کرے۔ وہ ان لڑکیوں کے ساتھ گذرے ہوئے واقعات سنا رہا تھا۔ اور میں

سوچ رہا تھا کہ اس کے عشق میں بھی ڈرامائیت برقرار رہی---- یعنی وہی ڈرامہ کی مخصوص تکون!

اور پھر اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اسے بٹھاتا رہ گیا۔ مگر اب اس کے پاس باتیں ختم ہو گئی تھیں۔

احسان چلا گیا تو میں نے سوچا۔ "اب؟"

مجھے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا' میں کہہ رہا تھا کہ یادوں کے وہ دیپ جنہیں میں اپنے پیچھے سلگتے ہوئے چھوڑ آیا ہوں۔ کہیں پھر نہ لو دے اٹھیں۔

میں دور تک احسان کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو میں آہستہ آہستہ شاہین سنیما کی طرف چلا آیا شاید کوئی نئی پکچر لگی تھی کیونکہ اس دن معمول سے کچھ زیادہ ہی بھیڑ تھی۔ آخری شو کی بکنگ ہو رہی تھی' میں بھی ایک طویل قطار کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ قطار جب آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی تو میں نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا---- "کونسی فلم چل رہی ہے----"

"بابو!" انہوں نے مجھے حیرت سے تکتے ہوئے کہا۔

"کیسی ہے----؟" میں نے پوچھا----

"بس ٹھیک ہی ہے" وہ شاید دوبارہ دیکھنے آئے تھے' شیکسپیئر کے ایک ڈرامہ سے کہانی چرائی ہے۔

میں جب کھڑکی کے پاس پہنچ گیا تو ٹکٹ لئے بغیر ہی ایک طرف ہٹ گیا میرے پیچھے کھڑے ہوئے ایک صاحب نے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا---- "کیا آپ ٹکٹ نہیں لیں گے۔"

"نہیں۔" میں نے کہا---- "میں تو وقت گذارنے کے لئے لائن میں کھڑا ہو گیا تھا----"

شاہین سنیما سے نکل کر میں ایک اندھیری سڑک پر چل پڑا۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند نکل کر کبھی کا ڈوب چکا تھا۔ اور اب سڑک پر اندھیرا یوں برس رہا تھا کہ چند قدم کے فاصلے کی چیز بھی نظر نہیں آتی تھی میں آہستہ آہستہ اس طرح قدم اٹھا رہا تھا کہ میرے جوتے کی ایڑھی مسلسل سڑک سے رگڑ کھا رہی تھی۔ میں سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کشوں کے درمیان اپنے خیالات سے الجھ رہا تھا کہ کسی نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا وقت ہوا ہے بابو۔۔۔۔؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا وہ چھوٹے سے قد کا انسان تھا۔ بظاہر وہ بچہ نظر آتا تھا۔ لیکن آواز اور چہرے پر اگی ہوئی خود رو داڑھی سے اس کی عمر کا صحیح تعین نہ ہوتا تھا۔۔۔ میں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور روشنی میں گھڑی دیکھی۔ سوا نو بجے تھے۔ میں نے اسے وقت بتا دیا۔

"کہیں دور سے آ رہے ہو معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔"

"نہیں تو۔۔۔۔؟" میں نے کہا۔۔۔ "میں تو ابھی کیفے اقبال سے اٹھ کر آیا ہوں۔"

"تو بابو کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو' بڑے تھکے تھکے قدم اٹھا رہے ہو۔۔۔۔"

"ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے گول مول سا جواب دیا۔ "اور تم کہاں سے آ رہے ہو۔"

"میں تو بہت دور سے آ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "تلک چاڑی سے۔ دن میں دو مرتبہ مجھے تلک چاڑی تک جانا اور آنا پڑتا ہے۔"

"اوہ میرے دل میں اچانک اس کے لئے رحم کا جذبہ بیدار ہو گیا۔۔۔۔"

"تم بس سے کیوں نہیں آتے جاتے۔۔۔۔؟"

"اتنی گنجائش نہیں بابو!" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ "ایک دوکان پر ملازم ہوں۔ ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ اس گرانی کے زمانے میں کیا ہوتا ہے۔ اتنے پیسوں میں۔"

"اوہ! واقعی ساٹھ روپے تو تھوڑے ہیں۔۔۔۔ ساٹھ روپیوں میں تو گذارہ ہونا بھی مشکل ہے۔ اور پھر تمہارے بیوی بچے بھی ہوں گے۔"

"بیوی تو مر گئی' کوئی چار سال ہوئے۔ ایک لڑکی ہے۔ جمیلہ چودہ پندرہ سال کی عمر ہے۔ وہ بھی سمجھو اب جوان ہو گئی ہے۔ زمانہ برا ہے۔ اس کی شادی کی فکر کھائے جاتی ہے۔ کیوں ٹھیک کہتا ہوں نہ بابو جی۔۔۔۔؟"

"ٹھیک ہے!" میں نے کہا۔۔۔ "شادی کر دو کوئی مناسب سا لڑکا دیکھ کے۔"

"لڑکوں کی تو کوئی کمی نہیں بابو' اللہ پاک نے اسے صورت ہی ایسی دی ہے چاند سی جو دیکھے ہے پسند کرے ہے۔ مگر اپنی طرف سے انتظام نہیں۔۔۔۔ دو چار کپڑے تو ہوں۔"

"ہاں۔۔۔۔!" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"ساٹھ روپیوں میں سے کچھ بچانا بڑا مشکل ہے مگر پھر بھی جون توں کچھ بچاتا ہی ہوں۔

جمیلہ کی ماں کے کڑے سو روپئے میں گروی رکھے ہیں- دو سو کا مال ہے ____ سو روپئے ہو جائیں تو انہیں چھڑا لوں- سوچتا ہوں کہ انہیں بیچ کر اس فرض کو بھی پورا کر دوں-"

"ٹھیک ہے-" میں نے بے خیالی سے کہا----

"جمیلہ کو جو دیکھے ہے بابو پسند ہی کرتا ہے' بچپن ہی سے سب کو اس پر پیار آتا ہے- اور پھر اب تو جوان ہو گئی---- محلے کے لوگ بھی دشمن ہو گئے ہیں- سمجھو کل تک جو دوست تھے- اب وہی دشمن کی نگاہ سے دیکھتے ہیں----"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے گھر کے راستے سے بچھڑ کر بہت دور نکل آیا ہوں- سامنے کچھ ٹاٹ چٹائیوں کے پردوں اور گارے کی بنی ہوئی جھگیاں نظر آ رہی تھیں- جن میں کہیں کہیں چراغ روشن تھے ورنہ چہار سو اندھیرا ہی اندھیرا ٹھاٹھیں مار رہا تھا- ہم ذرا آگے بڑھے تو کتوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا- میں ٹھٹک گیا-"

کتوں سے ڈرتے ہو بابو جی "اس نے لجاجت سے کہا-" یہ کتے بھونکتے ہی بھونکتے ہیں کاٹتے نہیں---- بالکل یہاں کے لوگوں کی طرح---- وہ بھی بس بھونکنا ہی جانتے ہیں کسی کو کاٹ وہ بھی نہیں سکتے-

"کیوں بابو----؟"

"مجھے کیا معلوم!" میں نے کہا- "میں یہاں پہلے کبھی نہیں آیا----" تو چلو آج چلے چلو----!

"نہیں بس اب میں گھر جاؤں گا- گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے-"

"ارے آؤ بابو----" اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور تقریباً گھسٹتا ہوا لے چلا---- "یہاں سے میرا گھر دور نہیں ہے- گھر کیا سر چھپانے کا ایک ٹھکانہ ہے- بس گھر تھوڑا ہی کہتے ہیں اسے خیر تھوڑی دیر بیٹھنا اور ایک پیالی چائے بھی پینا آپ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں سو آرام بھی مل جائے گا-

"میں نہ معلوم کیوں انکار نہ کر سکا----"

ہم ٹیڑھی میڑھی اور تنگ گلیوں سے گذرتے گئے- جن میں جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور گندے پانی کی نالیاں بہہ رہی تھیں-

راستے میں ایک آدمی ملا- وہ ٹھٹک گیا اور ہمیں دیکھ کر کہنے لگا---- "ابے فضلو! یہ کون ہیں تیرے ساتھ!"

"ایک مہمان ہیں!"

"اچھا تیرے بڑے مہمان آتے ہیں!" اس نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔ فضلو کو اس کی بات اچھی نہ لگی----

"کتا ہے کتا!" فضلو نے کہا۔ اور اپنے گھر تک اس کو گالیاں دیتا چلا گیا۔

فضلو کا گھر ایک کچے کمرہ پر مشتمل تھا۔ کمرے میں ایک پرانی سی لالٹین جل رہی تھی۔ جس کی چمنی دھوئیں سے ساری کی ساری کالی ہو چکی تھی۔ دیواریں سفیدی سے پتی ہوئی تھیں اور ایک دیوار پر "تبت سنو" کا ایک کلنڈر لٹک رہا تھا۔ جس میں نیلو اس انداز سے بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کی سرکش چھاتیاں اس کے بلاؤزر میں سے جھانک رہی تھیں۔ کمرے میں دو پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ میں ایک پلنگ پر بیٹھ گیا اور چائے کے انتظار میں نیلو کی تصویر کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔

جمیلہ چائے لئے کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس کی عمر چودہ پندرہ تو نہیں مگر انیس بیس سال ضرور تھی۔ وہ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی جتنی فضلو نے اس کی تعریف کی تھی رنگ سانولا' بال البتہ بہت لمبے لمبے تھے۔ اتنے لمبے کہ اس کی چوٹی کولہوں سے نیچے تک آتی تھی اور آنکھوں میں جیسے ستارے رقص کر رہے ہوں---- جوانی سے بدن گدرایا ہوا تھا۔ میں نے نظر بھر کر جمیلہ کو دیکھا اور ٹرے میں سے پیالی اٹھا کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

میں نے چائے ختم کی تو فضلو نے برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"جمیلہ بہت اچھی لڑکی ہے' ہے نا بابو؟" وہ بولا آپ کو خوش کر دے گی پیسوں کی آپ فکر نہ کیجئے جو من میں آئے دے دیجئے۔"

"دس پندرہ بیس----"

یہ کہتے کہتے وہ لالٹین اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔

یہ خاکی

ٹرین کھٹا کھٹ کی تال پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔

میرے سامنے کی نشست پر بیٹھے ہوئے دیہاتی نے اپنی جیب میں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور اس میں سے آخری سگریٹ نکال کر ہونٹوں تلے دبایا' خالی ڈبیا کو فرش پر پھینکا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھ سے ماچس مانگنے لگا۔ میں نے ماچس دی تو خیال آیا کہ خود میں نے بھی تو بہت دیر سے سگریٹ نہیں پی ہے۔ میں بھی سگریٹ جلا کر ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔

خاموشی بدستور مسلط رہی۔

اس کمپارٹمنٹ میں آمنے سامنے کی سیٹوں پر ہم پانچ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم ریل کے ڈبے میں نہیں' کسی قید خانے میں بند ہوں اور جلد ہی کوئی فرار کی راہ تلاش نہ کر سکے تو صبح ہوتے ہی سولی پر لٹکا دیئے جانے والے ہوں۔ ذرہ ذرہ دیر بعد ہم ایک دوسرے کے چہروں پر بات کرنے کی آمادگی کے آثار تلاش کرتے اور ناکام ہو کر کسی بے نام نقطے پر نگاہیں جما کر سوچ میں گم ہو جاتے۔

بدلتے ہوئے موسم کا تذکرہ چھیڑ کر میں نے ایک مرتبہ خاموشی کے اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ میں نے کہا۔ "آج سردی اچانک کتنی بڑھ گئی ہے!" اور پھر لوگوں کے چہروں کو جواب کے انتظار میں تکنے لگا مگر میری بات پر کسی نے توجہ نہ دی۔ بنیا صفت شخص نے میری طرف دیکھا' ماتھے پر شکنیں ڈال کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور "ہوں" کہہ کر چھت میں لگے ہوئے بجلی کے پنکھے کو دیکھنے لگا۔

سردی واقعی بہت بڑھ گئی تھی' کمپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیوں کے شیشے گرا دیئے گئے تھے مگر میں پھر بھی اپنی سیٹ پر سکڑتا جا رہا تھا اور کھڑکی کے سرد شیشے سے آنکھیں لگائے باہر دیکھ رہا تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے کھیت پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے درخت اور ٹیلیگراف کے کھمبے چاند کی زردی مائل روشنی میں نہائے ہوئے تھے انہیں دیکھ کر جسم میں سردی کی رو

لہراتی چلی جاتی تھی۔ اور سردی کا احساس زیادہ ہونے لگتا تھا مگر میں کمپارٹمنٹ میں چھائی ہوئی خاموشی سے بھی اکتا گیا تھا۔ اور باہر کے مناظر میں اپنی اکتاہٹ کا مداوا تلاش کرنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔

میرے سامنے کی سیٹ پر وہ دیہاتی بیٹھا ہوا تھا اس نے آدھی سگریٹ پی کر آدھی سگریٹ بجھا کر کان میں لگا لی تھی اور اب میلے سے کھیس کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر' میری طرح شیشے سے آنکھیں لگائے باہر دیکھ رہا تھا اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کون کہاں سے سوار ہوا' اور کہاں اترا۔ اس کی منزل شاید ابھی دور تھی اور وہ یہ دیکھ لینا چاہتا تھا کہ راستے میں کہاں کیسی فصل ہوئی ہے۔ تاکہ اپنے گاؤں والوں کے سوالوں کا جواب دے سکے وہ کوئی لوک گیت بھی گنگنا رہا تھا مگر آواز اتنی دھیمی تھی کہ بول میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

دیہاتی کے پاس اونی سوٹ میں ملبوس ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے ان کے ہاتھ میں اردو کی ایک موٹی سی کتاب تھی کتاب ایک ہی جگہ سے کھلی ہوئی تھی اور انہوں نے اب تک اس کا ایک ورق بھی نہیں پلٹا تھا۔ انہوں نے کئی مرتبہ کتاب کو پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر دو چار سطور کے بعد ہی ہر مرتبہ ہمت ہار بیٹھے تھے اور کتاب کو گود میں رکھ کر کسی سوچ میں غرق ہو گئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کتاب یا تو فلسفہ پر ہے یا ایم۔ اسلم کا کوئی شاہکار ناول۔

پھر ایک مولانا صاحب تشریف رکھتے تھے جن کے ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں کی ایک بڑی سی تسبیح تھی وہ گنگنانے کے سے انداز میں کسی وظیفہ کا ورد کر رہے تھے اور تسبیح کے دانے کھٹا کھٹ ایک طرف سے دوسری طرف گر رہے تھے۔ ان کے کاندھے پر مدینہ منورہ کا کڑھا ہوا ریشمی رومال پڑا ہوا تھا اور سر پر کھجور کی ٹوپی۔

میری سیٹ پر ایک بنیا صفت انسان نیم دراز تھا۔ ان کے کپڑوں میں سے آتی ہوئی ہلدی اور دھنیے کی بو سے یہ اندازہ لگا لینا مشکل نہ تھا کہ وہ پرچون کی دوکان کا مالک ہے وہ منہ پھاڑ کر بار بار جمائیاں لے رہا تھا اور مسلسل آتی ہوئی ڈکاریں اس کی بے تحاشہ پھولی ہوئی توند کا راز کہہ رہی تھیں۔ میں سردی کی بنا پر جتنا اپنی جگہ پر سکڑتا چلا جا رہا تھا وہ اتنا ہی پھیلتا جاتا تھا۔

ایک اسٹیشن پر جب گاڑی رکی تو ایک آدمی ہمارے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا اور

میرے پاس بیٹھ گیا۔ جب تک گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی رہی وہ خاموش رہا مگر جب اسٹیشن کی عمارت پیچھے کی طرف ہٹتے ہٹتے نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے ہمارے چہروں کو کچھ اس طرح سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو' "ارے بھائیو! کوئی تو بات کرو' مگر ہم سب اسی طرح سے خاموش رہے۔ رفتہ رفتہ اس کی بے چینی بڑھتی گئی اور آخر اس سے خاموش نہ رہا جا سکا۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کہاں جائیں گے آپ؟"

"لاہور" میں تو بڑی سردی پڑ رہی ہو گی!

میں جواب دینے ہی والا تھا کہ مولانا صاحب بول اٹھے نہیں کوئی خاص نہیں بس یہاں جیسی ہی سمجھو! اور میں نے سوچا چلو جان چھوٹی۔ میں اپنے گھٹنوں میں سر چھپا کر بند چاقو کی طرح سمٹ کر بیٹھ گیا۔

باتوں کا سلسلہ نکلا تو ہر ایک نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔

نووارد اینٹوں کے بھٹے کے مالک تھا' آجکل تعمیرات کا کام بے انتہا بڑھ گیا تھا لہٰذا وہ مٹی گوند کر سکے بنا رہا تھا آج بھی وہ ایک ٹھیکے کے سلسلہ میں جا رہا تھا۔

اونی سوٹ والے صاحب ایک کالج میں لکچرار تھے۔ انہوں نے پچھلے ہی سال ایم اے کیا تھا۔ اچھی پوزیشن ہونے کی وجہ سے اسی کالج میں ملازمت مل گئی تھی۔ لیکن لکچرار ہونے کے بعد انہیں پتہ چلا تھا کہ پڑھنے اور پڑھانے میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ جتنی محنت انہیں امتحان کے لئے نوٹس تیار کرنے میں کرنی پڑتی تھی۔ اتنی ہی اب انہیں لکچر تیار کرنے میں کرنی پڑتی تھی۔ مگر انہیں یقین تھا کہ دو تین سال میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر انہیں پڑھنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

مولانا صاحب ایک مسجد کے پیش امام تھے۔ انہیں مسلمانوں کی پسماندگی اور ان کی مذہب سے بیزاری کا بہت شدید احساس تھا۔ ان کے خیال میں اس دور کی تمام برائیوں کا تریاق صرف مذہب کے پاس تھا مگر مذہب سے لوگ اس طرح بھاگتے تھے جیسے انہیں برائیوں سے دور بھاگنا چاہئے تھا۔

اور میری سیٹ پر بیٹھا ہوا بنیا صفت انسان جو ایک پرچون کی دوکان کا مالک تھا اسے ابھی تک مارشل لاء حکومت سے سخت شکایت تھی کہ اس نے اس کا سینکڑوں کا مال بس ذرا سی ملاوٹ کے الزام میں گندے نالے میں بہا دیا تھا اور اس نقصان کو وہ پہلے سے دوگنی ملاوٹ کے باوجود ابھی تک پورا نہیں کر سکا تھا۔

میں اور دیہاتی خاموش تھے میں ان کی گفتگو سن رہا تھا اور دیہاتی تو شاید اس کا بھی روادار نہیں تھا۔

گفتگو رنگ بدلتے ہوئے موسم سے شروع ہوئی اور پہلے ہی مرحلے میں موسم کی طرح بدلتی سیاست تک جا پہنچی۔ دوسرے دور میں موضوع اسلامی نظام حکومت تھا۔ اسلامی نظام حکومت پر بات کرنے کی کوشش ہوئی تو اسلام کا لفظ بار بار گفتگو میں آنے لگا اور جب اسلام کے بارے میں بات چلی تو اللہ کی ناقابل فہم ذات سامنے آ گئی۔

اور میں غیر ارادی طور پر سوچنے لگا کہ ہم کتنے غیر مستقل مزاج اور ریاضت سے دور بھاگنے والے اور شاید اسی وجہ سے خوف زدہ ہیں۔ ہم میں کسی بھی بات کا مقابلہ کرنے اس پر فتح پا لینے کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی ہیں۔ ہم کوئی بھی بات شروع کرتے ہیں تو خدا تک پہنچنے کے لئے ان گنت موضوعات کی کڑیاں جوڑ جوڑ کر ایک زنجیر بنا لیتے ہیں۔ اور پھر اس زنجیر کو اپنے ہاتھوں میں پہن کر بڑی شان سے اپنا سر خدا کے سامنے جھکا دیتے ہیں۔ مگر خدا کی بات تو خدا ہی جانے۔

مولانا صاحب فرما رہے تھے۔ خدا کا ہم پر کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اشرف المخلوقات یعنی انسان بنا کر اس زمین پر اتارا۔ اور دنیا کی ہر چیز کو زیر نگیں کر دیا تاکہ ہم جس چیز کو چاہیں اپنے مفید کام میں لائیں یہ خوبصورت اور رنگین پھول' یہ تازہ اور لذیذ پھل' دودھ گھی اور نجانے کیا کیا۔ غرض خدا نے کیسی کیسی نعمتوں سے ہمیں سرفراز کیا۔ مگر افسوس کہ ہم کتنے ناشکرے ہیں۔ کبھی بھول کر بھی اسے یاد نہیں کرتے۔ اگر جویائے کائنات نے روز محشر ہماری دست گیری نہ کی تو خدا کی قسم ہم سب دوزخ کا ایندھن بن جانے کے قابل ہیں۔

لکچرار صاحب نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ کیسے ذات باری تعالیٰ کے منکر ہو جاتے ہیں اور پھر یہ غلطی جاہلوں سے نہیں بڑے بڑے علم والوں سے ہوتی ہے وہ کائنات اسرار و رفور پر تو غور کرتے ہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اتنا سچا اور صحیح نظام ترتیب دینے والی آخر کونسی ذات ہے۔ وہ سورج کو طلوع اور غروب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں' بارشوں کو برستے دیکھتے ہیں چھوٹے سے بیج کو تناور درخت بنتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور کچھ نہیں دیکھتے۔ ان کا علم ہی ایک کثیف پردہ بن کر ان کی آنکھوں پر پڑ جاتا ہے۔"

"یہ وہ لوگ ہوتے ہیں!" مولانا صاحب بولے۔ "جن کے دلوں پر خدا مہر لگا دیتا ہے۔ راہ راست پر بھی وہی لوگ چل سکتے ہیں جنہیں خدا اس کی توفیق عطا کرتا ہے۔"

اور مولانا صاحب! لکچرار سے گویا ہوئے۔ "میرے خیال میں یہ لوگ اپنی مادی دنیا میں خواہ کچھ بھی کریں انہیں سکون تو زندگی بھر نہ ملتا ہو گا۔ یا شاید مرنے کے بعد بھی نہ ملتا ہو۔"

"بیشک" نووارد بولا۔ "میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا مگر نہیں تھی تو سکون کی دولت! میں نے اپنے پیر صاحب سے عرض کیا تو انہوں نے حکم دیا کہ خدا کی عبادت کرو اور اس کی راہ میں صرف کرو۔ اور جب سے میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی ہے خدا کی قسم بڑے چین سے ہوں۔ میرے خیال میں خدا کو خوش رکھنے کے لئے دو باتیں ازحد ضروری ہیں۔ ایک خدا کی عبادت اور دوسرے اس کے بندوں پر شفقت۔"

"بیشک" دوکاندار نے بڑی زور دار آواز میں تائید کی اور مولانا صاحب اور لیکچرار صاحب نے فاضلانہ انداز میں سر کی خفیف سی جنبش سے!

خاموشی ایک بار پھر مسلط ہو گئی جیسے کسی نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کا حل مل گیا ہو۔

پھر ایک بوڑھا اور کمر خمیدہ فقیر آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور ہمارے پاس کھڑا ہو گیا اس کے سر اور داڑھی کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے مگر آواز جیسے امانت کی طرح سنبھال رکھی ہو گی وہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے لگا۔ مولانا صاحب، لیکچرار صاحب، نووارد اور دوکاندار نے بیک وقت اپنی اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور جب ان کے ہاتھ باہر آئے تو نووارد کے ہاتھ میں دونی اور لکچرار صاحب کے ہاتھ میں اکنی نظر آ رہی تھی۔ مولانا صاحب اور دوکاندار کے ہاتھوں میں ایک ایک پیسہ تھا۔۔۔۔ مگر فقیر نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور تلاوت جاری رکھی۔

تلاوت ختم کرنے کے بعد وہ کہنے لگا۔ "بابا میں ایک بوڑھا آدمی ہوں ایک پیشہ ور فقیر نہیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے اور اپاہج بیوی ہے۔ میں پیسہ پیسہ نہیں مانگتا۔ میرا ایک روپیہ کا سوال ہے۔ کوئی خدا کا بندہ میرا سوال پورا کر دے۔"

مولانا صاحب عجب کشمکش میں پڑ گئے اور کہنے لگے۔ "بابا یہ تو لے لو!" مگر فقیر نے انکار کر دیا۔ نووارد اور لیکچرار صاحب نے بھی پیسے دینے چاہے مگر جب فقیر نے کسی طرح نہ مانی تو انہوں نے پیسے واپس اپنی جیبوں میں رکھ لئے۔

"مانگنے کے نئے نئے ڈھنگ ہیں جی!" دکاندار بڑبڑایا۔

فقیر اپنا سوال دہرائے جا رہا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اس کی آواز ہی نہیں سن رہا ہے۔ لیکچرار صاحب کتاب میں غرق سے لگتے تھے۔ مولانا صاحب کی تسبیح کے دانے تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ نووارد سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ اور دوکاندار خراٹے لے رہا تھا۔

فقیر نے پھر ایک مرتبہ صدا لگائی---- "بابا لوگو خدا کے نام پر میرا ایک روپے کا سوال ہے۔"

دیہاتی نے کھڑکی کے شیشے پر سے چہرہ ہٹایا' مڑ کر فقیر کی طرف دیکھا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ریز گاری نکال کر گننے لگا پھر دوسری جیب میں سے چند سکے نکالے اور ریز گاری میں شامل کر کے ایک مرتبہ پھر گنا۔

ریزگاری کو گن چکنے کے بعد وہ سوچ میں گم سا ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اپنے کان میں سے پانچ پیسے کا سکہ نکال کر ریز گاری میں شامل کیا اور فقیر کے ہاتھ پر تمام ریز گاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"بابا معاف کرنا میرے پاس پچانوے پیسے ہی تھے!"

مرکز ثقل

آج وہ لڑکی نہیں آئی۔ شاید بیمار ہو گئی ہو۔ یا ممکن ہے آج دوسرے راستے سے چلی گئی ہو۔

صبح ہوتی ہے تو میں دروازہ کھول کر یہاں بیٹھ جاتا ہوں اور ادھر سے گزرنے والوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ کوئی شناسا گزرتا ہے تو کچھ دیر کے لئے ٹھہر کر دکھ سکھ کی سناتا ہے۔ ورنہ لوگ اپنے اپنے خیالات میں گم آتے جاتے رہتے ہیں۔

صبح اور پھر تیسرے پہر کو اس راستے پر زیادہ چہل پہل رہتی ہے کیونکہ یہ راستہ لڑکیوں کے ایک اسکول کی طرف جاتا ہے۔ اسکول کے وقت سے پہلے ہی سے اس راہ پر آمدورفت بڑھ جاتی ہے۔ چھوٹی بڑی، بھولی بھالی، شریر چنچل معصوم اور بے فکر لڑکیاں چار چار، چھ چھ کی ٹولیوں میں گزرنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو چھیڑتی ہوئی، مذاق کرتی، ہنستی بولتی اور شرارتیں کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ مگر جب میرے کمرے کے سامنے سے گزرتی ہیں تو با ادب سی ہو جاتی ہیں۔ مگر ان سب لڑکیوں سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ میں جس کا منتظر تھا وہ آج نہیں آئی۔

وہ لڑکی بہت بھولی بھالی ہے۔ وہ لڑکی پہلے بھی بھولی بھالی سی تھی مگر پہلے وہ بچپن کی گود میں تھی اور اب وہ دیکھتے ہی دیکھتے جوانی کی حدوں میں داخل ہو گئی ہے آج جب قدرت نے اسے ایک بیش بہا تحفہ عطا کر دیا ہے۔ تو وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گئی ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس دولت کو چھپا لے یا سب کو دکھا دے۔ وہ ہر وقت بے چین سی رہتی ہے۔ اور بار بار اپنے دوپٹے کو سینے پر پھیلا کر چھوٹے چھوٹے مخروطی ابھاروں کو چھپاتی دکھاتی اور پھر چھپا لیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہر آنے جانے والے سے کہہ رہی ہو۔ "دیکھو اب میں بچی نہیں رہی۔ اب تو میں تمہاری توجہ کی مستحق ہوں نا؟"

اور جب میں اس لڑکی کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایک دلچسپ سا واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ الفت بھی ایسی ہی لڑکی تھی۔ اس کے ماحول نے، وقت سے پہلے ہی اس کے دل میں کسی کے من

مندر کی دیوی بن جانے کی تمنا پیدا کر دی تھی۔ جب وہ اپنی بہنوں کے نام آئے ہوئے طویل محبت نامے یا ان کو ملے ہوئے تحفے دیکھتی تھی تو اس کے دل میں بھی یہ تمنا مچلنے لگتی کہ کوئی اسے بھی ایسے ہی طویل طویل محبت نامے لکھے۔ جیسے وہ اپنی بہنوں کو لا لا کر دیتی تھی۔ کوئی ایسے ہی تحفے اس کو بھی دے جیسے اس کے ذریعہ اس کی بہنوں تک پہنچوائے جاتے تھے۔ اب اسے رشوت میں ملی ہوئی ٹافیاں اور مٹھائیاں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ وہ چاہتی تھی اب کوئی اسے "بے بی" کہہ کر مخاطب نہ کرے۔

اس نے جب "خوابوں کے راجہ" کی تلاش میں اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو اسے میرے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ وہ میرے ساتھ بڑی عجیب عجیب سی حرکتیں کرنے لگی۔ یونہی ذرا سی بات پر لڑ پڑتی' روٹھ جاتی اور خود ہی خود من جاتی۔ کبھی بیٹھے بیٹھے کسی عجیب سی چیز کی فرمائش کر دیتی اور میں حیران ہو کر سوچتا کہ آخر یہ چاہتی کیا ہے؟ میں بھلا کیسے سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

اور جب میں کسی طرح اس کے دل کی بات نہ سمجھ سکا تو آخر اسے صاف صاف کہنا پڑ گیا۔ اس نے مجھے ایک طویل سا محبت نامہ لکھا وہ محبت نامہ' جس میں املا کی بے شمار غلطیاں تھیں۔ اور جو بے ربط اور ٹوٹے پھوٹے جملوں پر مشتمل تھا۔ اس کے دل کی بات سمجھا گیا اس نے مجھے "خوابوں کے راجہ" کے نام سے خطاب کیا تھا اور پھر بڑے جذباتی انداز میں اس نے لکھا تھا کہ وہ بہت دنوں سے مجھ سے خاموش محبت کر رہی ہے۔ مگر میں ہوں کہ ایک پتھر' جس پر محبت بھرے نرم نرم اشاروں کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔

اس کا خط پڑھ کر اس وقت مجھے بڑا تعجب ہوا تھا اور ہنسی بھی آئی تھی میں نے اسے جواباً" لکھا تھا' "دیکھو الفت تم ابھی بچی ہو اور اچھے بچوں کو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں اور واقعی وہ اچھی بچی ہی تو تھی۔ ابھی تو اس نے سر پر دوپٹہ رکھنا بھی نہیں سیکھا تھا۔"

وہ میرا خط پڑھ کر مجھ سے روٹھ گئی۔ اور بہت دنوں تک سامنے بھی نہیں آئی۔ مجھے بھی افسوس نہ ہوا۔ کیونکہ مجھے اس کی وہ عجیب عجیب حرکتیں' وہ بڑوں کی سی عشق و محبت کی باتیں بھلا کب اچھی لگتی تھیں۔ مگر جب وہ ڈیڑھ دو ماہ کی روپوشی کے بعد میرے سامنے آئی تو میں اسے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تو جوان ہو گئی تھی۔ میں سوچتا ہی رہ گیا کہ یہ چند ہی روز میں اتنی تبدیلیاں کیسے ہو گئیں۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی' پہلے سے کہیں زیادہ پرکشش' پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ اور متین۔ اور اب وہ ذرا ذرا

دیر بعد سینے کے چھوٹے چھوٹے ابھاروں پر نائلون کا دوپٹہ کھینچ لیتی تھی۔

اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ پرکشش ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر معاً میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں نے اسے ناراض کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب وہ مجھے بہت ہی پیاری لگنے لگی تھی اور اسی روز سے میں اسے منانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن جیسے جیسے میں اس کی طرف بڑھتا' ویسے ویسے ہی وہ پیچھے ہٹتی جاتی۔ میں اسے منانے کی کوشش کرتا تھا' میں اس سے ملنا' اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ مجھے ستانے پر تلی ہوئی تھی۔ آخر کچھ دنوں کے بعد وہ اپنی بڑی بہنوں کی طرح چند دلچسپ سے تحفے لے کر من گئی۔

وہ مجھ سے چھپ چھپ کر ملنے لگی' کبھی زینے میں' کبھی ڈیوڑھی میں اور کبھی دھوپ میں تپتی ہوئی چھت پر اور جب ملتی کسی نہ کسی چیز کی فرمائش کر دیتی اور میں۔ میں تو جیسے اس کی فرمائشوں کا منتظر ہی رہتا تھا۔ بچپن کا نا سمجھی کا وہ جذباتی دور اور پہلی محبت' وہ جو مانگ لیتی میں کہیں نہ کہیں سے تلاش کر لاتا۔ اور پھر اس کی فرمائشیں بھی تو بڑی معمولی' بڑی دلچسپ ہوتی تھیں "ربن لا دو۔" "ٹوپس لا دو۔" "رنگین پنسلیں لا دو۔" "یا املی لا دو۔" اور یہ چیزیں ایسی تو نہیں تھیں جو میں اس کے لئے نہ لا پاتا۔ وہ مجھ سے چھپ چھپ کر' کہیں تنہائی میں ملتی' کچھ میٹھی میٹھی سی باتیں کرتی تو نجانے کیوں میرا دل یہ چاہتا کہ میں اسے چھو کر دیکھوں' اسے اپنے بازوؤں میں لے کر زور سے بھینچ دوں یا کبھی دل چاہتا کہ اس کے جسم کے نشیب و فراز اپنے ہاتھوں سے محسوس کر کے دیکھوں۔ مگر اب وہ اپنے آپ کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی۔ کبھی اس کی طرف بڑھتا تھا تو وہ بھاگ جاتی تھی اور میں سوچتا ہی رہ جاتا کہ آخر وہ مجھ سے دور دور کیوں رہنا چاہتی ہے وہ پہلے تو کبھی مجھ سے اس طرح خوف زدہ نہیں ہوئی تھی وہ مجھ سے لڑ لیتی تھی۔ میرے ہاتھوں سے چیزیں چھین لیتی تھی۔ میرے بازو میں کاٹ کھاتی تھی۔ اور ایسے ہی میں اسے مار لیا کرتا تھا مگر اب تو نجانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ میں اس کی طرف ایک قدم بڑھاتا تو وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتی میں اسے پکڑنا چاہتا تو وہ بھاگ جاتی اور میں سوچتا ہی رہ جاتا کہ وہ مجھ سے اتنی کیوں گھبرانے لگی ہے۔

ایک روز موسم بڑا ہی خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی اور ٹھنڈی نم دار ہوا دل میں گدگدیاں سی مچا رہی تھی۔ صحن میں کھڑا ہوا نیم کا بوڑھا درخت ہوا کی مستی سے جھوم رہا تھا۔ اور نیم میں پڑے ہوئے جھولے میں وہ دیر سے جھولا جھول رہی تھی میں

دور کھڑا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور ہر جھولے پر سینہ تان کر ننھے منے ابھاروں کو نمایاں کر دیتی تھی۔ میں دیکھتا رہا' دیکھتا رہا اور پھر نہ معلوم مجھے کیا سوجھی کہ میں چھپتا ہوا پیچھے سے اس کے پاس پہنچا اور بھاگ کر اچانک اسے پکڑ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ میری گرفت سے آزاد ہو کر بھاگ جائے' میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے کے ننھے منے ابھاروں پر رکھ دیئے---- مگر میرے ہاتھ میں گد گدی سی نہیں ہوئی۔ میرے جسم میں برق کی رو نہیں تڑپی۔ بلکہ میرے جسم میں لگی ہوئی ایک انجانی آگ پر برف سی جم گئی---- کیونکہ وہاں روئی کی دو چھوٹی چھوٹی گیندوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

فاصلے

عرفان اور شہلا کے درمیان شاہد اس طرح آ گیا تھا جیسے دو چٹانوں کے درمیان ایک چھوٹی سی ندی آ جاتی ہے جو سربلند اور مضبوط چٹانوں کے درمیان یوں تو بہت حقیر اور کمزور نظر آتی ہے مگر ان کو ملنے بھی نہیں دیتی۔

شہلا اور عرفان میں بہت سی باتیں مشترک تھیں اور اگر شاہد ان کے درمیان حائل نہ ہو گیا ہوتا تو شاید وہ اب تک شادی بھی کر چکے ہوتے۔ دونوں ہی کو ایک خوشگوار اور آسودہ زندگی ورثہ میں مل گئی تھی۔ انہیں اپنے مستقبل کے لئے کسی تلاش و جستجو سے کام لینا نہیں پڑا تھا وہ دونوں پڑوسی تھے۔ ان دونوں کے گھر ایک سے تھے، گھر والے ایک سے تھے، اور پسند ناپسند ایک سی تھی۔ دونوں ایک طویل عرصے سے ملتے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے لاشعوری طور پر یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ جب اپنا گھر بنا کر رہنے کی خواہش دلوں میں جاگے گی تو وہ شادی کر لیں گے۔ بات اتنی سیدھی سادی اور صاف تھی کہ عرفان نے اس موضوع پر شہلا سے بات کرنا ضروری نہ جانا تھا۔ اسے بھروسہ تھا کہ شہلا اسے پسند کرتی ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا مرد اس کی نگاہوں میں جچے گا ہی نہیں۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ شہلا کے لئے اور شہلا اس کے لئے زمین پر اتاری گئی ہے۔

مگر جب ایک دن عرفان نے شادی کی تجویز شہلا کے سامنے رکھی تو شہلا نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا۔ عرفان اسے دیکھتا رہ گیا۔ مگر شہلا مذاق نہیں کر رہی تھی۔ یہ اتنی ہی عجیب بات تھی جیسے شہلا اسے پہچاننے سے انکار کر دے!

"مگر میں یہ سمجھتا تھا شہلا کے تم مجھے پسند کرتی ہو۔" اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔

"تو میں نے یہ کب کہا ہے کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔" شہلا نے جواب دیا۔ "مگر پسند اور چیز ہے اور شادی کچھ اور---- شادی زندگی بھر کا سودا ہوتا ہے اور یہ سودا سوچے سمجھے بغیر تو طے نہیں کیا جاتا۔"

"شہلا، ہمیں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ایک عمر ہو گئی ہے۔ میری کونسی بات تم

سے چھپی ہوئی ہے۔ تم میرے آر پار دیکھ سکتی ہو اور اسی طرح تمہاری ہر پسند اور ناپسند کا علم ہے پھر اب سوچنے کی کیا بات رہ جاتی ہے؟"

"نہیں ایسا بھی نہیں ہے۔" شہلا نے کہا۔ "ہم ملتے ضرور رہے ہیں مگر شاید ہم ابھی تک ایک دوسرے سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے ہیں۔ میں تمہیں پسند ضرور کرتی ہوں مگر شادی پسند سے آگے کی بات ہے۔ اس کے لئے گہری وابستگی اور مکمل سپردگی بنیادی شرط ہے۔ میں ایک دوست کی حیثیت میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ دوست کی حیثیت میں، میں ہمیشہ تمہارا احترام کرتی رہوں گی۔"

عرفان کو اب احساس ہوا کہ جیسے کوئی چپکے سے ان کے درمیان حائل ہو گیا مگر وہ کون ہے؟ اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔

اس نے کہنا شروع کیا۔ "شہلا تم اس اعتماد کے ساتھ بات کر رہی ہو جیسے تم نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو اور تمہیں اپنے فیصلے کے صحیح ہونے پر پورا یقین ہو۔ میں تم یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہارا فیصلہ کس کے حق میں ہے۔ میں تم پر یہ الزام بھی نہیں لگاؤں گا کہ تم نے مجھے تاریکی میں رکھ کہ دھوکا دیا ہے---- مجھے تمہاری اس بات سے بھی اتفاق ہے کہ شادی کا معاملہ پسند سے آگے---- بلکہ بہت آگے کی بات ہے---- مگر تم مجھے اپنے اس اندیشے کے اظہار کی اجازت تو دو گی کہ انسان سے کبھی کبھی کچھ فیصلے جذبات کی رو میں بہہ کر غلط بھی ہو جاتے ہیں---- لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر تمہیں اپنے فیصلے کے غلط ہونے کا احساس ہو تو بغیر احساس ندامت کے لوٹ آنا میں ہمیشہ کی طرح تمہارا منتظر رہوں گا۔"

"میں آپ کی اس پیشکش کے لئے شکر گزار ہوں۔" شہلا نے کہا۔ "مگر مجھے اپنے فیصلے کی صداقت پر بھروسہ ہے۔"

"اور اگر تم مناسب سمجھو تو یہ بھی بتا دو کہ تمہارا فیصلہ کس کے حق میں ہے۔ عرفان نے پوچھا۔"

"شاہد----!" شہلا نے کہا۔

"شاہد۔" عرفان نے حیرت سے دہرایا۔ "اس سے زیادہ غلط فیصلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ یہ بات میں رقابت کی آگ میں جل کر کہہ رہا ہوں۔"

"شہلا یہ حقیقت ہے کہ یہ تمہارا انتہائی غلط فیصلہ ہے۔"

شہلا یہ بات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ مگر آسمان سے زمین کا مل جانا ممکن

ہوتا تو شاید اس فیصلے کی صداقت پر کسی کو اعتبار آ جاتا۔"

شہلا آسمان تھی۔ اس کی گود میں سورج' چاند' ستارے سب ہی کچھ تھا اور شاہد زمین تھا۔ ایسی زمین جس کی جھولی میں اپنے فن کی خاک کے سوا کچھ نہ تھا____ یہی وجہ تھی کہ اسے وہ مقام جہاں آسمان جھک کر زمین سے مل جاتا۔ دور بہت دور نظر آتا تھا اتنی دور کہ فاصلے کے تصور سے ہی اس کا سانس پھول جاتا تھا۔ اتنی طویل مسافت طے کرنے کی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ شہلا اسے جب بھی اس کے لئے اکساتی وہ کوئی بہانہ کر کے ٹال جاتا۔ وہ سوچتا یہ طویل و عریض حویلی میں رہنے والی لڑکی کس طرح اس کے چھوٹے سے گھر کے قید خانے میں رہنا گوارہ کر سکتی ہے۔ یہ کنول سے ہاتھ' دھواں اگلتی گیلی لکڑیوں پر کس طرح کھانا پکانے کی اذیت برداشت کر سکیں گے۔ یہ خوشبوؤں میں بسی رہنے والی لڑکی اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کے میلے اور گندے کپڑے کیسے برداشت کر سکے گی؟ اسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ ناممکن ہے۔ اسے یقین تھا کہ آسمان اتنا ہرگز نہیں جھک سکتا کہ زمین کی چھاتی پر اپنا سر رکھ دے۔

مگر شہلا کی نگاہ نہ اپنی بلندیوں پر تھی نہ شاہد کی پستیوں پر۔ اس نے کبھی اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے لئے تو یہ بات بہت تھی کہ شاہد کے پاس وہ کھنکتی ہوئی آواز ہے۔ جس کے بہاؤ پر زر و جواہر کی جھنکار بے وقعت تنکے کی طرح نظر آتی ہے۔ اس کی انگلیاں جب ساز چھیڑتی ہیں تو روح کے تار بھی لرز اٹھتے ہیں۔ موسیقی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور شاہد کی سب سے بڑی دولت۔ اس دولت کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس دولت کے مقابلے میں تو اسے دنیا کی ہر چیز ہیچ نظر آتی تھی۔

"کیسی نا سمجھی کی بات ہے۔" عرفان نے ایک دن شہلا سے کہا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنا غلط فیصلہ بھی کر سکتی ہو؟"

"خیر آپ کی نگاہ میں تو میرا فیصلہ غلط ہونا ہی تھا۔" شہلا نے کہا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے شہلا۔" عرفان نے کہا۔ "مجھے اعتراف ہے کہ شاہد کے گلے میں جادو ہے اس کی انگلیوں کی جنبش سے روح کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ شادی تمہیں شاہد سے کرنی ہے۔ موسیقی سے نہیں۔"

"یقیناً۔" شادی مجھے شاہد سے ہی کرنی ہے۔ مگر شاہد موسیقی سے اور موسیقی شاہد سے جدا تو نہیں ہیں۔ تم انہیں علیحدہ کیوں کرتے ہو؟"

"اس لئے کہ دنیا انہیں علیحدہ علیحدہ دیکھتی ہے۔ تمہارے والدین موسیقی سے تمہاری شادی کرنا تو شاید گوارہ کر لیں مگر شاہد سے کبھی گوارہ نہیں کریں گے۔"

"مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ اگر میری خوشیوں میں حائل ہوئے تو میں اب ان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری اس بات پر شک ہے!" عرفان نے کہا۔

"تمہیں تو شک کرنا ہی چاہئے!" شہلا نے کہا۔

عرفان ہنستے ہوئے خاموش ہو گیا۔

پھر ایک دن شاپنگ سے لوٹتے ہوئے عرفان نے اپنی گاڑی ایک اجنبی سڑک پر موڑ دی۔ "یہ ادھر کہاں چل دیئے۔" شہلا نے پوچھا۔

"ادھر میرا ایک دوست رہتا ہے۔ ذرا اس کے گھر جانا ہے۔"

گاڑی ایک تنگ گلی کے باہر رک گئی۔ وہ دونوں گلی میں داخل ہوئے گلی کے بیچوں بیچ گندے پانی کی نالی ٹوٹ رہی تھی۔ تعفن سے دماغ پھٹا جا رہا تھا دونوں آگے بڑھتے رہے۔ شہلا نے جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا عرفان نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

میلے پیوند لگے کپڑوں میں ملبوس ایک بچہ بھاگتا ہوا ان کی طرف آیا۔ اور عرفان کو سلام کر کے ان سے دور ہی ٹھہر گیا۔ عرفان نے اس سے پوچھا "بھائی جان گھر پر ہیں؟" "جی نہیں۔" بچے نے جواب دیا۔ "وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔"

"خیر امی سے کہو۔ عرفان بھائی آئے ہیں۔"

بچہ ایک دروازے کے اندر جس پر میلا سا پردا پڑا ہوا تھا چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد دروازے میں ایک زرد رو عورت نے باہر جھانک کر دیکھا اور کہا۔ "اندر آ جاؤ بیٹا۔ تم سے کون پردہ کرتا ہے۔"

عرفان اور شہلا اندر چلے گئے۔

مکان چھوٹا سا تھا۔ ایک کمرہ تھا' کمرے کے باہر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اور پھر ایک چھوٹا سا صحن جس میں دو پلنگ مشکل سے بچھ سکتے تھے عورت نے ایک چارپائی برآمدے میں ڈال کر اس پر صاف چادر بچھا دی اور ان دونوں کو اس پر بٹھا دیا۔

شہلا نے ادھر ادھر دیکھا۔ صحن کے آخری سرے پر ایک دبلی پتلی لڑکی بیٹھی ڈھیر

سارے میلے برتن لئے راکھ سے مانجھ مانجھ کر دھو رہی تھی کمرے کے اندر ایک بیمار بچہ پڑا کراہ رہا تھا۔ اور باورچی خانے میں گیلی لکڑیاں دھواں اگل رہی تھیں۔ جن کی کڑواہٹ اب ان کی آنکھوں میں محسوس ہو رہی تھی۔

عورت نے ہاتھ دھو کر اپنے میلے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے کہا۔ "بیٹا تم بیٹھو میں جلدی سے تمہارے لئے چائے بنا لاؤں۔"

"ہاں امی ذرا جلدی سے بنا لیجئے۔ چائے کو میرا دل بھی بہت چاہ رہا تھا۔" عرفان نے انجان بن کر منہ پھیر لیا۔۔۔۔

عرفان اور شہلا جب واپس اپنی کار میں آ گئے تو شہلا اس پر برس پڑی۔

"یہ آخر کیا مذاق ہے۔ اس دھواں جیسی چائے کے لئے تم مرے جا رہے تھے۔ جیسے تمہیں چائے نصیب ہی نہ ہوئی ہو۔ میری تو وہاں بیٹھے بیٹھے آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں۔"

عرفان قہقہہ مار کر ہنس دیا۔

"جانتی ہو۔۔۔۔ یہ کس کا گھر ہے۔"

"مجھے جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

"ضرورت تو ہے۔" اس نے شہلا کے چہرے پر نگاہیں جماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ شاہد کا گھر ہے۔"

"کیا۔" شہلا نے چیک کر کہا۔ "اسے یوں لگا جیسے عرفان نے اس کے منہ پر زور دار طمانچہ مار دیا ہو۔"

ایک پرانی کہانی

نوراں جتنی خاموشی سے غائب ہوئی تھی، اتنی ہی خاموشی سے گھر واپس آ گئی تھی۔

اس روز بھی رمضانی فجر کی اذان سے پہلے بیدار ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹا آسمان پر تاروں کے قافلے کو انجانی سمت میں رواں دواں دیکھتا رہا تھا اور جب گاؤں کی مسجد سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی تھی تو وہ کلمہ پڑھتا اور دونوں ہاتھوں کو منہ پر پھیرتا ہوا پلنگ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا پھر وہ اپنے ٹوٹے ہوئے جوتوں کو گھسیٹتا ہوا پانی کے مٹکوں کی طرف چل دیا تھا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ مٹکے کے ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی چہرے پر پڑتا تو نیند بخارات بن کر اڑ جاتی۔ وہ نماز گھر میں ادا کر لیتا اور نماز کے بعد اپنا کام لے کر بیٹھ جاتا۔ روز کی طرح کام کا ایک پہاڑ آج بھی اس کا منتظر تھا۔ وہ وضو کے لئے پانی لینے چلا تو اس نے دیکھا کہ اس کے چھوٹے لڑکے کلوے کے پاس چارپائی پر کوئی عورت بھی لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے سوچا اس کی بیوی ہو گی۔ نوراں جب سے غائب ہوئی تھی اس کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی تھی۔ کبھی ایک بچے کو سینے سے چمٹا کر سسکیاں بھرنے لگتی کبھی دوسرے کو آغوش میں بھینچ کر پیار کرتی تھی۔ وہ رات بھر خود سوتی تھی نہ بچوں کو سونے دیتی تھی اور جب تھک ہار کر صبح ہوتے اس کی آنکھ نیند کے بوجھ سے بند ہونے لگتی تو اسے یہ ہوش ہی نہیں رہتا تھا کہ وہ کہاں پڑی ہوئی ہے---- جہاں ذرا سی جگہ دیکھتی لیٹ کر سو رہتی۔ رمضانی نے آج بھی یہی سوچا تھا کہ اس کی بیوی اپنے بچے کے پاس تھک ہار کر سو گئی ہے مگر جب وہ رسوئی کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی چولہے میں آگ جلا رہی ہے۔

"ارے نیک بختے یہ اپنے کلوے کے پاس کون سو رہا ہے؟" اس نے بیوی سے اپنا اضطراب چھپاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بھی نہیں!" بیوی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"کوئی بھی نہیں----! کوئی پاگل ہوئی ہے کیا---- ذرا اٹھ کر تو دیکھ ____ کوئی عورت ہے!"

"تمہیں وہم ہو گیا ہو گا----" بیوی نے بد دلی سے کہا اور اٹھ کر کلوے کے پلنگ کی طرف چل دی----

جھٹ پٹے کی ملگجی روشنی میں اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ کلوے کے ساتھ سچ مچ کوئی سویا ہوا تھا---- اس نے قریب جا کر اس کے منہ پر سے چادر کھینچ لی۔ چادر ہٹتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

"نوراں----"

"نوراں ہے کیا----؟" نوراں کا باپ دوڑتا ہوا آیا اور بیٹی کو دیکھتے ہی اسے سینے سے چمٹا لیا۔

رمضانی مرد تھا۔ اس کا دل بڑا تھا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی اسے معلوم تھا کہ نوراں سے کچھ پوچھنا بیکار ہے وہ کچھ بھی نہ بتا سکے گی مگر نوراں کی ماں سے نہ رہا گیا۔

"تو کہاں غائب ہو گئی تھی ری نوراں؟" اس نے مامتا کے شکایت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

نوراں نے کوئی جواب نہ دیا۔

ماں نے نوراں کو جھنجھوڑتے ہوئے تلخی سے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"اری چپ کیوں ہے---- جواب کیوں نہیں دیتی---- تو کہاں غائب ہو گئی تھی؟"

نوراں نے نیند بھری آنکھیں کھول کر ایک دفعہ ماں کو دیکھا اور باپ کی چھاتی سے سر لگاتے ہوئے کہا۔

"ماں مجھے نیند آ رہی ہے---- سونے دے----"

ماں نے پھر اسے جھنجھوڑنا چاہا تو باپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"رہنے دے---- اسے سو جانے دے---- اس عمر میں سبھی نیند کے ماتے ہوتے ہیں!"

رمضانی نے نوراں کا سر تکیہ پر رکھ دیا اور چادر اس کے چہرے پر ڈال دی۔

نوراں پھر نیند کے اتھاہ ساگر میں ڈوب گئی۔

پندرہ سولہ کا سن ہو تو نیند پاتال کی طرح گہری ہوتی ہے اس روز بھی نوراں نیند کے ایسے ہی گہرے ساگر میں سفر کر رہی تھی جب اسے اس کے اپنے گھر کے آنگن سے اٹھا کر ایک طلسماتی کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تھی تو کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر وہ سوچنے لگی تھی کہ شاید وہ ابھی تک نیند میں ہے اور کوئی سندر سا سپنا دیکھ رہی ہے۔ وہ کمرہ اسے پریوں کے دیس کے اس شہزادے کا لگا جس کا ذکر وہ نانی اماں کی کہانیوں میں بار بار سن چکی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے اس کمرے کی ایک ایک چیز کو تکتی رہی تھی' پھر دیوار شق ہوئی تھی اور لمبی لمبی مونچھوں والا ایک دیو کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے لال لال خونخوار آنکھوں سے گھور کر اسے دیکھا تھا اور پھر منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا تھا۔ نوراں کو ایسا لگا تھا جیسے کمرے کی دیوار لرز کر گر جائے گی۔ اس نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے اور آنکھیں بند کر کے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا تھا۔

ایک بدبو دار شعلہ اس کے کان کے پاس لہرایا تھا۔

"ڈر گئی میری کبوتری!"

اور پھر ڈری ہوئی کبوتری باز کی گرفت میں آن کر لہو لہان ہو گئی تھی۔

وہ کمرہ کیا تھا---- کہاں تھا---- نوراں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کمرہ زمین کے اندر تھا' اوپر تھا یا ہوا میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں دن اور رات کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا---- ہر وقت دور بلندی پر رکھا ہوا ایک گیس کا ہنڈا جگر جگر جلتا رہتا تھا۔ اس کمرے کی بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ اور بھی تھا جہاں ایک زندہ انسان کی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی مگر وہاں ہر وقت اندھیرا رہتا تھا۔

کھانا اسے کمرے میں ہی مل جاتا تھا---- اتنا بہت سا اور طرح طرح کا ____ مگر وہ کھانے بیٹھتی تو نوالہ حلق سے نیچے ہی نہیں اترتا تھا---- چولہے کے آگے بیٹھے گرم گرم روٹی کے لئے لڑتے ہوئے بھائی بہنوں کی یاد آتی تو آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑتا اور نوالہ حلق میں اٹک کر رہ جاتا۔

دن بھر وہ کمرے میں اکیلی پڑی رہتی---- یا پھر اس کی تنہائی مٹانے کے لئے وہ مونچھوں والا دیو آ جاتا تھا---- وہ اس کے ساتھ پیار بھری باتیں کرتا مگر وہ سر جھکائے تھر

تھر کانپتی رہتی اور جب کالا دیو واپس جاتا تو وہ زندہ ہوتے ہوئے مردوں سے بدتر ہوتی اور اپنے ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے جسم کو سمیٹتے ہوئے سوچتی۔ "آخر مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی۔" لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اس میں زندگی کا ایسا سرکش دھارا بہہ رہا ہے جس پر آسانی سے موت کا بند نہیں باندھا جا سکتا تھا۔

نوراں پر جوانی ایسے آئی تھی جیسے ندی میں باڑ آ جائے۔

اپنے خیال کی ہنستی کھیلتی بچی نوراں کو اس روز دن چڑھے جب رمضانی نے جگایا تھا اور نوراں نے آنکھیں ملتے ہوئے انگڑائی لینے کے لئے اپنے جسم کو فضا میں تان لیا تھا تو اس کا ڈھیلا ڈھالا چولا سینے پر اس طرح کس گیا تھا کہ رمضانی کی نگاہیں خود بخود جھک گئی تھیں---- اسی روز شام کو حقہ گڑگڑاتے ہوئے دور آسمان کو تکتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا۔ "کلوے کی ماں اپنی نوراں اب جوان ہو گئی ہے---- اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی بھی سوچی ہے؟"

ماں اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر سے کب غافل ہوتی ہے۔ ماں نے تو نوراں کو بیاہنے کی تیاری چھٹی چلے نہاتے ہی شروع کر دی تھی---- مگر وہ تیاری تو اسی وقت کام آ سکتی تھی جب بیٹی کے لئے مناسب بر بھی ہو۔

رمضانی سوچتا کہ شاید گاؤں والوں کو ابھی تک پتہ ہی نہیں چل سکا ہے کہ نوراں جوان ہو گئی ہے اگر انہیں پتہ چل گیا ہوتا تو پھر آخر نوراں کا بر کیوں نہ آتا مگر رمضانی کا خیال غلط تھا---- نوراں کے جوان ہو جانے کی خبر دن کے اجالے کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ یہ روشنی گاؤں کی اس حویلی کو بھی جگمگا گئی تھی جس کی دیواریں اتنی اونچی اونچی تھیں کہ ان کے اندر جھانکنے کے لئے سورج کی طرح بلند ہونا ضروری ہوتا تھا----

رمضانی نے صرف سوچا ہی نہیں تھا بلکہ اعلان بھی کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو ایسا جہیز دے گا جیسا اس گاؤں میں آج تک کسی نے اپنی بیٹی کو نہ دیا ہو گا۔ اور بیٹی کا وہی جہیز بنانے کے لئے وہ دن رات محنت کرتا رہتا---- شہر کے میلے میں اب دن ہی کتنے رہ گئے تھے---- اس نے میلے کے لئے مٹی کے ڈھیروں برتن اور بچوں کے لئے ایسے خوبصورت کھلونے بنائے تھے جن پر سے نگاہ ہٹانا محال ہوتا تھا---- اس نے سوچا تھا کہ وہ ساری آمدنی بیٹی کے جہیز پر صرف کر دے گا ۔ ایسی خوشی تھی، جس کے تصور سے اس کے

چاک کی طرح اس کا دل بھی رقص کرتا رہتا تھا۔

مگر اس روز جب فجر کی اذان کے ساتھ وہ بیدار ہوا تو اس کے نصیب سو چکے تھے---- اس کی بیٹی نوراں غائب ہو گئی تھی---- اس وقت اسے یوں لگا تھا جیسے بے خبری میں کسی نے پیچھے سے اس کے سر پر کاری ضرب لگائی ہو---- وہ چکرا کر زمین پر ڈھیر ہو گیا---- اور جب اسے ہوش آیا تو وہ غم سے پچھاڑیں لیتی ہوئی بیوی کو چھوڑ کر بڑی حویلی کی طرف چل دیا۔

چودھری جی کا انتظار کرتے کرتے گھنٹے گذرے یا صدیاں اسے پتہ نہ چلا اور جب وہ حویلی سے باہر آئے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کی نظر دھندلا گئی اور وہ ان کی آنکھوں میں معصوم خون کی جھلک تک نہ دیکھ سکا۔

"سنا رمضانی کیسے آنا ہوا---- خیر تو ہے نا؟" چودھری جی کی آواز اسے بادلوں کے اس پار سے آتی ہوئی سنائی دی۔

"چودھری جی!" وہ مجسم نیاز بن کر بولا۔ "میری بچی رات کو غائب ہو گئی۔"

"بچی!---- کیا عمر تھی اس کی؟" چودھری جی نے بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی---- سولہ سال!"

"سولہ سال کی بچی ہوتی ہے!" چودھری نے کہا۔ "دماغ خراب ہو گیا ہے کیا---- آج کل تو سولہ سال کی پوری عورت ہو جاتی ہے رمضانی---- بھاگ گئی ہو گی کسی کے ساتھ!"

لوہے کی ایک سرخ انگارا سلاخ اس کے کانوں کو برماتی چلی گئی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔

"ایسا مت کہو چودھری جی! میری بچی تو بغیر اجازت گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی تھی!"

"تو اب کیسے چلی گئی؟"

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے جی----" اس نے بے بسی سے کہا۔ "اب آپ ہی کچھ کریں---- آپ گاؤں کے باپ ہیں---- وہ آپ کی بھی بیٹی تھی!"

"اچھا اچھا----" چودھری نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ "تو فکر مت کر رمضانی میں تیری بیٹی کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔ بس کچھ دن تجھے انتظار کرنا پڑے گا۔"

انتظار کرتے کرتے ان کی آنکھوں کے تمام آنسو بہہ گئے۔ اب انہیں نوراں کا خیال آ جاتا تو وہ خشک سالی سے تڑخی ہوئی زمین ایسی اجاڑ آنکھوں سے دروازے کو تکتے رہ جاتے---- انہیں یقین تھا کہ چودھری جی کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا!

آخر چودھری جی کے الفاظ سچ ثابت ہو کر رہے۔ جیسی خاموشی سے نوراں غائب ہوئی تھی ویسی ہی خاموشی سے وہ گھر لوٹ آئی تھی---- مگر اب اسے دیکھ کر رمضانی کو یہ حیرت ہوتی تھی کہ چند دن گھر سے باہر رہ کر وہ ہرنی ایسی بھولی بھالی سولہ سال کی بچی پوری عورت کیسے بن گئی----

ماں کو یہ حیرانی تھی کہ نوراں گھر سے غائب ہو کر آخر چھپی کہاں رہی تھی۔ اس نے کھوج لگانے کے لئے نوراں سے طرح طرح کے سوال کئے مگر جب نوراں نے اپنے طلسماتی قید خانے اور بڑی بڑی مونچھوں والے دیو کا ذکر کیا تو اس کی ماں نے اس سے کہا---- " بیٹی اب یہ باتیں کبھی بھول کر بھی اپنی زبان پہ مت لانا ورنہ ہم گھر سے بے گھر ہو جائیں گے----"

خزاں کے دن بیت گئے---- بہار آئی تو اجڑی ہوئی شاخوں پر نئے انکھوے پھوٹے----!

ایک روز ناشتہ کرنے کے لئے بیٹھی تو نوراں نے پہلا نوالہ ہی منہ میں رکھا تھا کہ اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا---- وہ "آ" کرتی ہوئی منہ چھپا کر بھاگی اور ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی---- جس دائی نے اسے جنم دلوایا تھا اس نے نوراں کی کوکھ ٹٹول کر اس کی ماں سے کہا تھا۔"

"بچی ماں بننے والی ہے۔"

ضبط کے بند ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گئے---- آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر باڑ آ گئی۔ نوراں کے غائب ہو جانے سے جو کلنک کا ٹیکا لگا تھا وہ ابھی دھلا نہیں تھا کہ یہ ایک اور آفت نازل ہو گئی تھی۔

اس گناہوں کی پوٹلی کو وہ کہاں چھپائیں گے۔

روتے روتے صبح سے شام ہو گئی---- آنسو خشک ہو گئے مگر دلاسے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اچانک رمضانی کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس نے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر

اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔

"او نیک بختے کیوں روئے چلی جا رہی ہے؟"

شوہر کے الفاظ بیوی کے لئے اچنبھے کی بات تھی۔ اس نے شوہر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں شوہر سے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا واقعی تمہیں معلوم نہیں ہے؟"

رمضانی ہنس پڑا۔

"اری پگلی ہم تو یونہی روتے رہے۔" وہ بولا۔

"یہ تو بڑے نصیب کی بات ہے۔ اس طرح اب ہمارے گھر میں بھی ایک چودھری جنم لے لے گا۔"

لاحاصل

تین دن میں ہی عارف کا چہرہ ایسا پیلا ہو گیا تھا جیسے وہ مہینوں کا بیمار ہو۔

اسکول سے واپس آیا تو اس نے بد دلی سے کتابیں میز پر پھینک دیں اور لباس تبدیل کئے بغیر پلنگ پر گر پڑا۔ ماں نے دیکھا تو گھبرا کر اٹھی اور اس کے پاس جا کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹے؟"

"امی میں بالکل ٹھیک ہوں' بس ذرا تھک گیا ہوں!"

پھر عارف نے پلنگ پر سے اٹھتے ہوئے کہا:

"میں ابھی کپڑے بدل کر آیا۔ آپ میرے لئے کھانا نکال دیجئے!"

کپڑے بدل کر منہ ہاتھ دھونے لگا تو واش بیسن کے آئینے میں عارف کو اپنا چہرہ اجنبی اجنبی نظر آیا۔ وہ بیمار نہیں تھا مگر آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے' رنگ پیلا ہو گیا تھا اور چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں تھیں۔

"یہ مجھے آخر ہو کیا گیا ہے!" اس نے سوچا۔ "اور اگر کچھ ہو بھی گیا ہے تو مجھے دوسروں کو پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

اسے اپنے آپ پر بڑی شرم آئی۔ اس نے سوچا اب میں ہر بات بھول جاؤں گا۔۔۔ اور اگر نہ بھول سکا تو۔۔۔۔؟۔۔۔۔ تو نہ سہی مگر میں اس بات کا کسی دوسرے کو احساس نہیں ہونے دوں گا۔ میں پریشان ہوں تو آخر میں دوسروں کو پریشان کیوں کروں!

وہ کھانا کھانے کے لئے بیٹھا تو ماں پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس نے مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا اور پوری لگن سے کھانا کھانے لگا۔ دو چار نوالوں تک تو بات ٹھیک رہی مگر پھر اسے یوں لگا جیسے معدے کا منہ بند ہو گیا ہو۔ اس نے جلدی جلدی دو ایک نوالے اور منہ میں رکھے لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ اگر اب ایک نوالہ بھی اس نے منہ میں رکھا تو وہ حلق میں اٹک کر رہ جائے گا۔

اس نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔

"بس کھا چکے؟" ماں نے حیرانی سے پوچھا۔

"جی ہاں! پیٹ بھر گیا----"

"آدھی روٹی سے!"

"بس بھوک ہی اتنی تھی!"

"میں دیکھ رہی ہوں دو تین روز سے تمہارا یہی حال ہے۔" ماں نے کہا۔ "آج شام کو میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلنا۔ کچھ پتہ تو چلے کہ تمہاری بھوک کو آخر کیا ہو گیا ہے۔"

"ڈاکٹر!" اسے ہنسی آ گئی۔ "ڈاکٹر کیا کریں گے۔ طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کی ضرورت پیش آتی ہے مگر مجھے تو کوئی تکلیف ہی نہیں ہے۔ بس یہ ہوا ہے کہ آج کل کسی کام میں دل نہیں لگتا----"

"کام میں جی نہ لگنا بھی ایک بیماری ہی ہوتی ہے---- مگر تمہیں کیا معلوم---- تم تو ابھی بچے ہو----"

اس نے سوچا۔ امی کہتی ہیں کہ میں ابھی بچہ ہوں۔ ابا کہتے ہیں۔ "عارف تم اب بچے نہیں رہے ہو---- خدا جانے کون سچ کہتا ہے۔ شاید اس کا خیال درست ہے۔ شاہدہ کی امی نے بھی تو یہی کہا تھا۔"

"عارف تم اب بڑے ہو گئے ہو----!"

شاہدہ کا خیال آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے آنسوؤں کو ماں سے چھپانے کے لئے سر جھکا لیا اور اٹھ کر چل دیا۔

ماں فکر مندی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ گھر سے باہر نکل آیا---- باہر ہر طرف دوپہر کی تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے تمام ساتھی گھروں میں چھپے ہوئے تھے---- وہ لان بھی اس وقت خالی تھا جہاں تین روز قبل اس کی اور شاہدہ کی لڑائی ہوئی تھی۔ بس لان کے ایک کونے میں بوڑھا مالی ایک درخت سے پیٹھ لگائے اونگھ رہا تھا---- وہ لان میں آ گیا---- اس کے سامنے ایک قطار میں بنے ہوئے سارے ایک سے مکان تھے۔ جو اسے ریل کی طرح نظر آتے تھے---- ہر مکان جیسے ایک ڈبہ تھا اور اس میں رہنے والے لوگ سب کے سب مسافر تھے---- اس ریل گاڑی میں شاہدہ اور اس کے ڈبے کے درمیان کوئی دوسرا ڈبہ حائل نہیں تھا۔

مکانوں کی اس قطار کے سامنے ایک بڑا سا لان تھا جس میں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور بڑے بڑے سایہ دار درخت تھے جن کے سائے میں بیٹھ کر بڑے خوش گپیاں کرتے تھے اور بچے نت نئے کھیلوں میں لگ جاتے تھے۔

اس روز بھی اس لان میں ستو لئے کا کھیل عروج پر تھا جب شاہدہ نے آ کر کہا تھا کہ اسے بھی کھیل میں شریک کر لیا جائے۔ مگر اس روز لڑکوں نے اسے اپنے ساتھ کھلانے سے انکار کر دیا---- اس وقت شاہدہ نے عارف کی طرف اس طرح دیکھا تھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو۔ "عارف تم ہی ان سے کہو کہ مجھے کھیل میں شریک کر لیں---- " عارف کا جی چاہتا تھا کہ شاہدہ کو بھی کھیل میں شامل کر لے مگر وہ لڑکوں کے فیصلے کے خلاف ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ کیوں نہیں کھیلتیں!" عارف نے اس سے کہا تھا۔

شاہدہ کو عارف کی بے رخی پر غصہ آیا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے ناگواری سے زمین پر پاؤں پٹخے اور وہیں جم کر کھڑی ہو گئی---- کھیل چلتا رہا____ پھر ایک مرتبہ جو گیند شاہدہ کی طرف آئی تو اس نے اچھل کر پکڑ لی اور دور جا کھڑی ہوئی۔

لڑکوں نے عارف کو گھیر لیا۔

"دیکھو عارف شاہدہ کو سمجھا لو ورنہ اچھا نہیں ہو گا!"

عارف نے پکار کر کہا۔

"شاہدہ ہماری گیند دے دو----"

جواب میں شاہدہ نے عارف کا منہ چڑا دیا اور ہنسنے لگی۔

"مجھے اپنے ساتھ کھلاؤ گے!"

"نہیں----"

"تو پھر گیند بھی نہیں ملے گی۔"

عارف شاہدہ کو پکڑنے کے لئے تیزی سے اس کی طرف دوڑا شاہدہ بھی دوڑنے لگی---- مگر کچھ دور جا کر اس نے شاہدہ کو پکڑ لیا---- عارف نے گیند چھیننی چاہی تو شاہدہ کی فراک کا دامن اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ شاہدہ نے پھر بھاگنا چاہا تو فراک کا دامن پھٹ گیا---- عارف نے گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ شاہدہ نے اپنی پھٹی ہوئی فراک کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے گیند زمین پر پٹخ دی اور روتی ہوئی گھر کی طرف

چل دی۔

اس روز شام کو شاہدہ سے ملنے کے لئے اس کے گھر گیا تو شاہدہ کی امی نے اسے دروازے میں ہی روک لیا۔

"عارف اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ اس طرح گھر کے اندر مت آیا کرو۔ ہم نے شاہدہ کو بھی پردہ کرا دیا ہے۔"

اس کے پاؤں زمین میں گڑ سے گئے وہ گم سم شاہدہ کی امی کو دیکھتا رہ گیا اور جب ان کے الفاظ کا مفہوم اس کی سمجھ میں آیا تو اسے یوں لگا جیسے ایک بڑا پتھر اس کے سر پر آن گرا ہو---- شاہدہ برآمدے میں بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے ____ اس نے سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ ان کے گھر سے باہر نکل آیا----

اور اب وہ لان خالی تھا' مالی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ دور آسمان پر چیلیں سست روی سے ایک دائرے میں چکر لگا رہی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جائے۔

وہ سڑک پر آ گیا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں مگر بازار میں بھیڑ نہیں تھی۔ یونہی بے ارادہ وہ ایک طرف چل دیا---- وہ چلتا رہا اور راستے میں کسی چیز میں اس کا دل نہ لگا---- مداری کا تماشہ بھی آج اسے بے سروپا حرکتوں کا مجموعہ نظر آیا۔

چلتے چلتے وہ شہر سے دور نکل آیا۔ اب دور حد نگاہ تک کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی مگر یہاں بھی اس کے دل کی کلی نہ کھلی۔ پھر اسے خیال آیا کہ نہر پر چل کر نہایا جائے۔

وہ نہر کی طرف چل دیا۔ نہر پر پہنچا تو اس کا نہانے کو دل نہ چاہا وہ پانی میں پیر لٹکا کر پل پر بیٹھ گیا اور بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ پانی نجانے کب سے اسی طرح سفر میں ہے۔ یہ نجانے کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ پانی کا سفر بھی عجیب سفر ہے جو کبھی ختم ہی نہیں ہوتا---- وہ بہتے ہوئے پانی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا اور اسے یہ احساس ہونے لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گیا ہو۔

وہ اٹھا اور واپس گھر کی طرف چل دیا۔ دن ڈھلنے لگا تھا کھیتوں میں پھر کام شروع ہو گیا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر اور بازار میں رونق بڑھ گئی تھی مگر دل اسی طرح بجھا بجھا تھا۔

گھر پہنچا تو لان میں کھیل شروع ہو چکا تھا اسے دیکھ کر اس کے ایک ساتھی نے آواز دی:

"عارف آ جاؤ تمہارا ہی انتظار تھا۔"

مگر کھیل میں اس کا دل نہ لگا۔ وہ کھیل چھوڑ کر نیم کے سائے میں گھاس پر لیٹ گیا اور اوپر درخت کی ٹیڑھی میڑھی الجھی ہوئی شاخوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ نیم کی سب سے اونچی ڈالی پر اسے ایک گھونسلہ نظر آیا اور گھونسلہ دیکھ کر اس نے سوچا کہ شاید اس میں کسی چڑیا کے انڈے ہوں گے۔ پھر اس کا جی چاہا کہ وہ درخت پر چڑھ کر دیکھے کہ گھونسلے میں کیا ہے----؟

وہ درخت پر چڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ ڈالی ڈالی---- وہ اوپر چڑھتا رہا اور آخر گھونسلے تک پہنچ گیا مگر گھونسلہ خالی تھا---- اجڑا ہوا تھا اس کے دل کی طرح---- اس پر پھر مایوسی کا غلبہ ہو گیا---- اس کی نگاہیں شاہدہ کے گھر کی طرف اٹھ گئیں۔ شاہدہ اپنی چھت پر الگنی پر گیلے کپڑے پھیلا رہی تھی---- شاہدہ کو دیکھ کر بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس کے پر ہوتے اور وہ درخت سے اڑ کر شاہدہ کے پاس پہنچ جاتا۔ شاہدہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے کئی اشارے کئے مگر وہ پتوں کی آڑ میں چھپا ہوا تھا اور شاہدہ اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔

شاہدہ بھی گم سم سی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی شگفتگی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی خالی خالی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی اس کے دل کی اداسی اور ویرانی کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

عارف نے اسے دیکھا تو اس کے دل کا بوجھ اور زیادہ ہو گیا پھر عارف نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شاہدہ سے ضرور ملے گا----

وہ تیزی سے درخت سے اترا اور دوڑتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ لمحہ بھر کے لئے دروازے میں رکا اور پھر چھپتا ہوا زینے کی طرف بڑھ گیا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس کی بے تابی سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے شاہدہ سے ملے تین دن نہیں تین صدیاں گزر گئی ہوں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب شاہدہ سے ملاقات ہو گی تو نجانے وہ اس کے ساتھ کس انداز میں پیش آئے---- پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ شاہدہ اگر ابھی تک ناراض ہو گی تو وہ اس سے معافی مانگ لے گا۔ شاہدہ اسے ضرور معاف کر دے گی۔ پھر وہ

دونوں وہاں بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔ اس نے یہ بھی طے کر لیا کہ وہ شاہدہ سے مل کر اسے اس بات پر آمادہ کر لے گا کہ اگر گھر والے انہیں ملنے نہیں دیتے تو نہ سہی وہ چھت پر چھپ چھپ کر ملتے رہا کریں گے۔

چھت پر پہنچ کر عارف تیزی سے شاہدہ کی چھت کی طرف بڑھا۔

مگر شاہدہ جا چکی تھی!

الگنی پر شاہدہ کے پھیلائے ہوئے گیلے کپڑے ہوا میں لہرا رہے تھے اس نے ایک ایک کپڑے کو چھو کر شاہدہ کے ہاتھوں کی نمی اور خنکی کو محسوس کیا۔ پھر اس نے شاہدہ کی فراک کو پہچان لیا۔ وہی پھٹی ہوئی فراک جو ان کے درمیان دیوار بن گئی تھی---- اس نے بڑی احتیاط سے اس فراک کے دامن کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنا تپتا ہوا چہرہ اس میں چھپا لیا۔

شام کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے، مگر شاہدہ دوبارہ چھت پر نہ آئی۔

عارف کو یوں لگا جیسے اس کا دل، اس کا سارا وجود شام کے دھندلکوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے---- اسے اپنا جسم بے جان سا نظر آیا۔ وہ ایک دیوار کا سہارا لے کر چھت کے فرش پر بیٹھ گیا۔

صحن میں اس کی ماں کسی سے کہہ رہی تھیں۔ "ارے ذرا دیکھو تو سہی یہ عارف کہاں غائب ہو گیا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے دیر ہوئی جا رہی ہے۔"

ففتھ ڈائی مینشن

کل میں نے ایک تصویر بنائی تھی۔ میں نے اپنے مطالعے کے کمرے کے ایک گوشے کو پینٹ کیا تھا۔۔۔۔

اس گوشے میں میری لکھنے کی میز ہے۔ دیوار سے لگا ہوا ایک بک شیلف ہے جس میں سلیقے سے کتابیں رکھی ہوئی ہیں مگر سلیقہ میرا نہیں' میری بیوی کا ہے۔ میری طبیعت میں جتنا بکھراؤ ہے' میری بیوی میں اتنا ہی نظم اور باقاعدگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ میری محدود اور غیر مستقل آمدنی کے باوجود ہم پانچ افراد یعنی تین بچوں اور دو ہم میاں بیوی کا یہ گھرانہ خاصی خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ "بک شیلف سے ذرا ہٹ کر ایک کھڑکی ہے۔ کھڑکی پر حریر کا پردہ پڑا رہتا ہے جس سے باہر کا تمام منظر دھندلا دھندلا دکھائی دیتا ہے۔ باہر ایک سڑک ہے۔ مگر اس پر ٹریفک نہیں چلتا۔ کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا گاڑی گزر جاتی ہے ورنہ دن بھر یہ سڑک ویران پڑی رہتی ہے۔ البتہ سڑک کے اس پار جو ایک پارک ہے اس میں صبح سے شام تک ایک ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ یہ پارک اس محلے کا وہ واحد مقام ہے جہاں بچے اپنے بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکیوں کے بغیر اپنے کھیل کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

تصویر میں میز کے علاوہ یہ کھڑکی بھی دکھائی گئی تھی اور کھڑکی کے باہر پارک کا ایک حصہ بھی یعنی درخت' پھولوں کے پودے' گھاس کا قطع اور گھاس پر کھیلتے ہوئے بچے! مگر یہ پورا منظر دھندلا دھندلا تھا جیسے حریر کے پردے میں سے نظر آتا تھا۔ درختوں کی حدود واضح تھیں نہ بچوں کے خدوخال۔۔۔۔ بس یہ احساس ذہن کے پردے پر ضرور ابھر آتا تھا کہ کھڑکی کے باہر پارک ہے اور پارک میں بچوں کا کھیل جاری ہے۔۔۔۔

مطالعے کی میز پر دو ایک کتابیں اور ایک رائٹنگ پیڈ رکھا ہوا تھا۔ پیڈ کے پاس ہی پن اسٹینڈ تھا جس میں سیاہ اور سرخ دو قلم لگے ہوئے تھے۔ میز کے ایک کونے میں کیمبل اسکن کا ٹیبل لیمپ تھا۔ یہ ٹیبل لیمپ ہماری شادی کے وقت ایک دوست نے تحفے میں دیا تھا۔

اب وہ دوست دنیا کی بھیڑ میں گم ہو چکا تھا اور اس کی ایک اکلوتی نشانی یہ ٹیبل لیمپ میرے پاس بچا تھا۔ تصویر میں اس لیمپ کے اصل رنگ اور نقش و نگار ابھارنے کے لئے مجھے بڑی محنت کرنی پڑی تھی----

میز کے سامنے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ سستی اور ایک عام سی کرسی! مگر اس پر ایک ربڑ فوم کا کشن رکھا ہوا تھا۔ کشن پر جو غلاف چڑھا ہوا تھا اس پر بہت خوبصورت اور اوریجنل رنگوں میں ایک گھوڑا کاڑھا گیا تھا۔ یہ غلاف میری خالہ جان نے میری سالگرہ پر مجھے دیا تھا۔ اب یاد نہیں وہ کون سی سالگرہ تھی۔ اب خالہ جان اس دنیا میں نہیں تھیں۔ میں اس غلاف کو بہت حفاظت سے رکھے ہوئے تھا مگر میری بیوی نے ایک دن اسے نکال کر کشن پر چڑھا دیا----

تصویر میں یہ ساری چیزیں بنا چکا تو مجھے خیال آیا کہ کرسی پر میں اپنے آپ کو بھی بیٹھا ہوا دکھاؤں---- اس طرح کہ جیسے میں میز پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا ہوں' مگر جب میں نے اپنی شبیہہ پر کام کرنا شروع کیا تو مجھے خیال آیا کہ میں اس تصویر میں ایڈجسٹ نہیں ہوا ہوں۔ میرے علاوہ اس تصویر میں جتنی چیزیں تھیں وہ بے جان یا بے نام تھیں اور میں ذی روح بھی تھا اور اپنی ایک پہچان بھی رکھتا تھا---- یہ خیال آیا تو کام کرتے کرتے ہاتھ رک گیا اور تصویر ادھوری رہ گئی----

اور آج میں نے ایک تصویر سوچی!----

تصویر کی جزئیات نے مجھے بہت انسپائر کیا اور رات کی تھکن' کسل مندی اور ناکامی کے باوجود میرا جی چاہا کہ میں فوراً اس تصویر پر کام شروع کر دوں----

رات دیر تک جاگنے اور آج چھٹی کا دن ہونے کے باوجود صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ پھر میں نے لاکھ سونا چاہا مگر مجھے نیند نہ آئی۔ کچھ دیر تو میں نے سونے کی کوشش کی مگر جب ناکامی یقینی ہو گئی تو میں نے اپنی بیوی کو جگایا اور اس سے چائے بنانے کے لئے کہا۔

ناشتے کے وقت تک بچے بھی اٹھ گئے۔ ناشتہ ہم نے مل کر کیا مگر ناشتے کے بعد مجھ پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ میں نے صحن میں دیوار کے سائے میں ایک پلنگ ڈال لیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دیوار کے سائے میں صبح کی خنکی ابھی تک رچی ہوئی تھی۔ بیوی بچوں کے میلے کپڑے دھونے بیٹھ گئی اور میری بڑی لڑکی اور لڑکا میرے پلنگ سے کچھ فاصلے پر صحن

میں فرش بچھا کر لوڈو کھیلنے بیٹھ گئے۔ میری سب سے چھوٹی بچی اپنے بھائی بہن کے ساتھ کھیل میں شریک ہونا چاہتی تھی مگر ابھی اسے لوڈو کھیلنا نہیں آتا تھا اس لئے اس کے بھائی نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ وہ منہ بسورتی ہوئی شکایت کرنے کے لئے میرے پاس آئی۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنے سینے پر لٹا لیا---- مجھے یاد آیا کبھی برسوں پہلے میرے والد بھی مجھے اس طرح اپنے سینے پر لٹا لیا کرتے تھے۔ آج برسوں بعد منظر وہی تھا مگر اس کے کردار بدل گئے تھے----

میری بیوی دھلے ہوئے کپڑوں کا پرانت اٹھا لائی اور پرانت میری پائنتی پر رکھ کر ایک ایک کپڑے کو نچوڑ کر الگنی پر پھیلانے لگی۔ آسمان شفاف اور گہرا نیلا تھا۔ کہیں کہیں بادل کا کوئی روپہلا ٹکڑا آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ دور بلندی پر کچھ کبوتر پرواز کر رہے تھے۔ وہ ہوا کی مخالف سمت میں مل کر پرواز کرتے لیکن جب پلٹ کر ہوا کے رخ پر بہنے لگتے تو بکھر کر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ ایک دوسرے سے فاصلے پر پرواز کرتے مگر پھر جب گھوم کر ہوا کے مخالف اپنا سفر شروع کرتے تو ایک دوسرے کے قریب آ جاتے---- میں نے اڑتے ہوئے کبوتروں کو گننا شروع کیا۔ ایک دو تین چار پانچ ____ وہ کل پانچ کبوتر تھے مگر نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ وہ چھ ہونے چاہئیں۔ مجھے چھٹے کبوتر کی تلاش ہوئی۔ میں نے پورا آسمان کھنگال ڈالا مگر چھٹا کبوتر کہیں دکھائی نہ دیا۔ چھٹا کبوتر تھا ہی نہیں۔ وہ دو جوڑے تھے اور ایک تنہا کبوتر تھا----

بچی میرے سینے پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ میری آنکھیں بھی مندنے لگی تھیں، مگر ابھی تک لوڈو کھیلتے اور کھیل میں بحث و تکرار کرتے ہوئے بچوں کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں---- بیوی اپنا کام نمٹا کر میرے پاس پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ہوا کا جھونکا آتا تھا تو الگنی پر ٹنگے ہوئے گیلے کپڑوں میں سے پانی کی کوئی بوند اڑ کر آتی اور میرے چہرے پر گر کر لمحہ بھر کو خنکی کا احساس چھوڑ جاتی----

مجھے خیال آیا یہ کتنا پرکشش منظر ہے----

کھلا نیلا آسمان---- آسمان کے نیچے پرواز کرتے ہوئے کبوتر اور لمحہ بہ لمحہ تحلیل ہوتا ہوا روپہلا بادل---- سامنے کی دیوار پر چوروں کی طرح صحن کی طرف رینگتی ہوئی دھوپ---- صحن مین لوڈو کھیلتے ہوئے دو صحت مند بچے---- بچوں سے ذرا فاصلے پر ایک

چارپائی---- چارپائی پر دراز ایک مرد---- مرد کے سینے پر سر رکھ کر سوئی ہوئی ایک بچی---- اور پائنتی کی طرف چپ چاپ مگر دزدیدہ نگاہوں سے اس منظر کو دیکھتی ہوئی ایک عورت!----

میں نے آنکھیں موندے موندے سوچا- میں اس تصویر کو ضرور بناؤں گا---- میں نے آنکھیں کھول کر منظر کی تفصیلات کو اپنے حافظے میں محفوظ کرنا شروع کر دیا---- میرے دل میں خوشی کا ایک غنچہ کھل اٹھا تھا---- میرے جسم میں توانائی کی ایک لہر مچل رہی تھی----

میں اٹھ کر بیٹھ گیا----

"کیا بات ہے؟" میری بیوی نے پوچھا----

"میں نے ایک تصویر سوچی ہے-" میں نے بیوی سے کہا اور اسے اپنی سوچی ہوئی تصویر کی تفصیلات بتانے لگا---- میری بیوی ہنسنے لگی-

"کیوں ہنس رہی ہو----؟" میں نے اس سے پوچھا:

وہ غور سے مجھے دیکھنے لگی-

"آج کل اپنی ہر تصویر میں آپ اپنے آپ کو ضرور شامل کرتے ہیں-" وہ بولی-

"تو اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"نہیں---- ہنسی تو مجھے یوں ہی آگئی تھی-" وہ بولی- "مگر مجھے یہ خیال ضرور آیا تھا کہ آج کل آپ ہر تصویر میں اپنے آپ کو شامل کرتے ہیں اور پھر اس تصویر کو ادھورا بھی چھوڑ دیتے ہیں----"

"جب تک وہ تصویر نہیں بنے گی جو میں بنانا چاہتا ہوں میری ہر تصویر ادھوری رہے گی-" میں نے کہا-

"آپ کیسی تصویر بنانا چاہتے ہیں؟" بیوی نے پوچھا-

"ایک ایسی تصویر جو زندہ رہے----"

"اور اگر ایسی تصویر بن گئی تو---- تو---- میرا مطلب ہے فرض کیجئے کہ یہ تصویر جو آپ نے ابھی ابھی سوچی ہے ایسی ہی بن گئی جیسی کہ آپ بنانا چاہتے ہیں تو کیا ہو گا----؟"

"پتہ نہیں----!"

"پتہ نہیں----؟"

میری بیوی نے سوالیہ نظروں سے دہرایا۔

"ہاں پتہ نہیں---- یا شاید کچھ بھی نہیں----" میں نے کہا۔ "مگر جی چاہتا ہے کہ دور کہیں جب وقت کے کسی موڑ پر یہ منظر ایک مرتبہ پھر آراستہ ہو تو میں اس میں ضرور شامل ہوں----"

الارم

میری بیوی کو مجھ سے یہ شکایت ہے کہ میں اسے اپنے خوابوں میں شریک نہیں کرتا اور مجھے یہ الجھن رہتی ہے کہ میری زندگی میں خوابوں کا گزر ہو تو اسے کچھ بتاؤں۔

وہ کہتی ہے خواب زندگی کی علامت ہیں۔ وہ غم روزگار کی تلخیوں کو گوارا بنا کر انسان میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔ مگر مجھے خوابوں سے ڈر لگتا ہے۔ میرا تجربہ مختلف ہے یا شاید میرے خواب مختلف ہوتے ہیں۔ میں جب بھی کوئی خواب دیکھتا ہوں بیزاری اور شدید بے کلی کے گرداب میں پھنس کر رہ جاتا ہوں----

برسوں کے بعد رات میں نے ایک خواب دیکھا----

رات میں بہت دیر تک جاگتا رہا تھا اور ایک فلم کی کہانی پر کام کرتا رہا تھا---- کالج کے زمانے کا ایک ساتھی کل مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بھاگ گیا اور ایک عرصے تک مجھے اس کی کوئی خیر خبر معلوم نہ ہو سکی تھی۔ پھر فلمی دنیا میں اس کا نام گونجنے لگا وہاں اس نے پے در پے کئی کامیاب فلمیں بنائی تھیں اور بے شمار دولت اور شہرت کمائی تھی ۔ میں کالج میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرتا رہا اور جب اس سے فراغت نصیب ہوئی تو مجھے ملازمت کے کولھو میں جتنا پڑ گیا----

میرے دوست کو میری ناکامیوں پر بہت صدمہ ہوا وہ میری صلاحیتوں کی تعریف کر کے میرے زخموں پر پھاہے رکھتا رہا۔ پھر اس نے محبت سے جھکتے ہوئے میرے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ میں اس کی آئندہ فلم کے لئے کوئی کہانی لکھوں----

میرے ذہن میں جو کہانیاں تھیں میں نے اسے سنا دیں۔ ان میں سے ایک کہانی اسے پسند نہیں آئی اور ایک کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ ذاتی طور پر اس کی کہانی کو پسند کرتا ہے۔ مگر کوئی فلم ساز اس پر سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہو گا---- باقی کہانیوں کو اس نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ دیکھنے والے انہیں پسند نہیں کریں گے اور اگر ان کہانیوں کو فلمایا گیا تو فلم ساز کا سرمایہ اور اس کی شہرت اور ساکھ دونوں ہی چیزیں خاک میں مل جائیں

گی----

میں نے اس نقطہ نگاہ کے خلاف احتجاج کرنا چاہا تو اس نے مجھے ٹوک دیا---

"دوست خوابوں کے پیچھے مت بھاگو---- حقیقت کی بات کرو کہ دنیا حقیقت کے محور پر گھومتی ہے----"

میرے لئے یہ بات انکشاف سے کم نہ تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میرے کچھ خواب اب بھی زندہ ہیں اور خیال آیا کہ اگر یہ بات سچ ہے تو میں سچ مچ اپنی بیوی کے ساتھ جھوٹ بولتا رہا ہوں---- مگر میں اتنا بڑا الزام خاموشی سے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سختی سے اس کی رائے کی تردید کرنی چاہی اور اسے بتایا کہ میں خوابوں کے سوالوں سے بہت دور ہوں میری زندگی میں تو بس حقیقتوں کی سنگلاخ چٹانیں ہی چٹانیں ہیں----!

"بس ہونا بھی ایسا ہی چاہئے----"

"میرے دوست نے خوش ہو کر کہا۔ میں چاہتا ہوں تم کوئی ایسی کہانی لکھو جو باکس آفس پر ہٹ ثابت ہو۔"

اس نے مجھے سگریٹ پیش کرنے کے لئے اپنا طلائی سگریٹ کیس میری طرف بڑھایا اور پھر سگریٹ جلانے کے لئے وہ میری طرف جھکا اور بولا----

"لکھنے والے تم ہو---- کہانی لکھنا تمہارا کام ہے---- مگر میری ایک بات یاد رکھنا کہ جنس، جنگ اور جذبات کے بغیر کوئی کہانی باکس آفس پر ہٹ نہیں ہوتی---- فلم کی کامیابی کے لئے تین چیزوں کا اجتماع ضروری ہے اور میرے لئے تو کہانی ایسی ہونی چاہئے کہ باکس آفس پر ہٹ ہو----"

"خواہ انسانوں کی زندگی میں اس سے زہر گھل جائے----؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

میرا دوست ہمدردی سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس نے میرے سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا----

پھر وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے رخصت ہوتے ہوئے مجھ سے کہا:

"مجھے یقین ہے تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ پھر یوں بھی آخر وہ کون سا شخص ہو گا جس کے دل میں اپنے اور اپنے بچوں کے لئے ایک روشن مستقبل کی تعمیر کی تمنا نہیں ہو

گی----"

پھر کل رات میں نے اپنی ذات کے ٹھنڈی راکھ میں تخلیق کی ایک دو چار چنگاریاں تلاش کیں اور اپنے مہربان دوست کے لئے ایک ایسی فلم کی کہانی لکھنے بیٹھ گیا جو اس کی توقعات کے مطابق باکس آفس پر ہٹ ثابت ہو سکے۔ میں جنس' جنگ اور جذبات کے رنگین تاروں سے اپنی کہانی کا تانا بانا بنتا رہا ____ مگر جب تھک ہار کر سونے کے لئے لیٹا تو میں نے ایک خواب دیکھا' خواب ڈراؤنا نہیں تھا مگر اسے دیکھتے دیکھتے میری آنکھ کھل گئی----

ناشتے پر آیا تو ذہن کی طرح میرا جسم بھی مضمحل تھا مگر میری بیوی سحر کی طرح شگفتہ اور مسرور تھی---- اس نے اخبار کی شہ سرخی کی طرح میرے چہرے پر لکھی ہوئی پریشانی کو پڑھ لیا----

"کیا بات ہے؟" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"رات میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا اور دھیرے دھیرے مسکرانے لگی۔

"اللہ کا شکر ہے آپ نے بھی خواب دیکھنے تو شروع کئے۔" وہ بولی

پھر کچھ دیر توقف کے بعد اس نے مجھ سے کہا:

"کیا اپنا خواب مجھے نہیں بتاؤ گے۔"

میں نے اسے خواب سنانا شروع کر دیا----

میں نے دیکھا کہ میں صبح سویرے گھر سے سیر کے لئے نکلا ہوں اور نہ جانے کیسے دریا کے پل پر پہنچ گیا ہوں۔ راستے بھر مجھے کوئی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ مگر پل پر اچانک ایک شخص میرے روبرو آ گیا میرا ہی جیسا قد و قامت' میرا ہی جیسا جسم بلکہ صبح کی اس نیم تاریکی میں مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کے خدوخال بھی کچھ میرے ہی ایسے تھے---- میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے مجھ سے کہا:

"کیا آپ مہربانی کر کے مجھے اس دریا میں دھکا دے دیں گے----"

"خودکشی کرنا چاہتے ہو----؟" میں نے اس سے کہا۔

"نہیں۔" وہ بولا "مرنا چاہتا ہوں۔"

"آخر کیوں----؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اب جینا ممکن نہیں رہا----" اس نے جواب دیا۔

"خیر اگر یہ بات درست تسلیم کر لی جائے تب بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس گھناؤنے جرم کے لئے تم نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"کیا واقعی تم یہ بات نہیں جانتے----؟"

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ جیسے میں کچھ جانتا ہوں، مگر میں نے انکار کرنا ہی مناسب سمجھا----

"اس لئے میرے دوست کہ وہ تم ہی ہو جو یہ چاہتا ہے کہ میں زندہ نہ رہوں----" وہ بولا۔

"پھر کیا ہوا----؟" میری بیوی نے بے صبری سے دریافت کیا۔

"پھر----" میں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرتے ہوئے کہا---- "پھر کچھ یوں یاد آتا ہے کہ میں نے کوئی بات کی اور وہ یک لخت زور زور سے ہنسنے لگا----

"پھر----؟" میری بیوی نے پھر سوال کیا----

"پھر یہ ہوا کہ میری آنکھ کھل گئی----"

"اور اس شخص نے دریا میں چھلانگ بھی نہیں لگائی----" میری بیوی نے کہا۔

"نہیں----" "جھوٹا کہیں کا----"

مجھے بیوی کی بات پر ہنسی آ گئی----

"دریا تھا کہاں---- میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں ہوں اور میز پر رکھی ہوئی گھڑی کا الارم زور زور سے بج رہا ہے----"

"کم بخت!----" میری بیوی نے جھنجھلا کر کہا---- "یہ گھڑی بھی ناکارہ ہو گئی ہے۔ وقت بے وقت اس کا الارم بجنے لگتا ہے----"

سوری بیٹے

شہلا گیند کی طرح اچھلتی ہوئی آئی اور آ کر میری گود میں براجمان ہو گئی۔۔۔۔
میں نے سر جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے گود میں بیٹھے بیٹھے سر اوپر اٹھایا۔۔۔۔
"ابو جب آپ چھوٹے سے تھے تو کیا آپ بھی کہانیاں سنا کرتے تھے؟"۔۔۔۔ اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھا تو پوچھا۔۔۔۔
"کیوں نہیں۔۔۔۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔۔۔۔
"آپ کو کون سی کہانی پسند تھی؟"۔۔۔۔ اس نے پھر سوال کیا۔۔۔۔
"اب یہ تو یاد نہیں۔۔۔۔ بہت سی کہانیاں تھیں۔۔۔۔
"اچھا کوئی کہانی سنایئے!" اس نے فرمائش کر ڈالی۔۔۔۔
"اس وقت؟" میں نے اس طرح کہا جیسے اس نے کوئی بہت ہی انہونی بات کہہ دی ہو۔۔۔۔
"جی!" اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔۔۔۔
"نہیں بیٹے دن میں کہانی نہیں سنتے!"۔۔۔۔
"کیوں۔۔۔۔؟" دن میں کیوں نہیں سنتے؟"۔۔۔۔
"اس لئے بیٹے" میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی کہ "اگر دن میں کہانی سنی جائے تو ماموں جان راستہ بھول جاتے ہیں۔"
یک لخت ہنسی کا فوارہ سا ابلا۔۔۔۔ میں نے کچھ جھینپتے ہوئے کچھ مسکراتے ہوئے شہلا کی طرف دیکھا۔۔۔۔ وہ ہنستے ہنستے میری گود سے پھسل کر پلنگ پر لیٹ گئی۔۔۔۔
"اس میں ہنسی کی کیا بات ہے!"۔۔۔۔ میں نے قدرے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔
اس نے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کی نمی کو پونچھتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔
"یہ ہنسی کی بات نہیں ہے؟"۔۔۔۔

ٹائم انٹرنیشنل کے تازہ شمارے پر نگاہیں جمائے جمائے شہلا کے انکل نے کہا---- "ایک سوال یہ بھی ہے کہ راستہ ہمیشہ ماموں جان بیچارے ہی کیوں بھولتے ہیں' کبھی چچا جان' اس فارمولے کی زد میں کیوں نہیں آتے؟"____

سروتے کی کھٹ کھٹ اچانک رک گئی- اماں جی نے کچھ کہنے کی نیت کی' مگر منہ میں بھری ہوئی پان کی پیک آڑے آ گئی- انہوں نے پٹی کے نیچے جھانک کر اگالدان تلاش کیا اور جب وہ نظر نہ آیا تو ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے- انہوں نے اپنا منہ آسمان کی طرف اٹھا کر پیک کو دہن کی کلیا میں سنبھالا اور آواز لگائی---- "او چھمیا---- کہاں مر گئی اگالدان لے کر آ"____

بچپن میں میرا چھوٹا بھائی اماں جی کا بڑا لاڈلا تھا' مگر اب نہ جانے کیوں انہیں اس کی باتوں سے چڑ سی ہو گئی تھی- حالانکہ ایرونا ٹیکل انجینئر ہونے کے ناتے سب سے زیادہ کماؤ بیٹا وہی ہی تھا----

"پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے"____ وہ کہا کرتیں---- "یا شاید کمائی کا گھمنڈ ہے"____

"اسے دماغ کی خرابی کہہ لو یا گھمنڈ اماں جی"____ "وہ جواب دیتا-" مگر بات یہ ہے کہ میں تو وہی بات کہوں گا جو مجھے سچ نظر آتی ہے' آپ ناراض ہوتی ہیں تو ہو جائیں مگر کسی کو میں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا اور ان بچوں کو خاص طور پر نہیں"____

اور اماں جی یہ سن کر جھنجھلا جاتیں' چراغ پا ہو جاتیں' مگر اس وقت جو اس نے گھر کا راستہ بھولنے والے فارمولے کا رخ اپنی طرف موڑا تو ان کا دل دہل کر رہ گیا----

شہلا پھر گود میں آ کر بیٹھ گئی اور ٹھنک کر کہنے لگی---- "ابو کہانی سنایئے نا----!"

"اچھا سنو"____ میں نے کہانی سنانے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیا---- "ایک تھی پری---- سبز پری!"

"کہاں تھی----؟" شہلا نے بات کاٹ کر پوچھا----

"کہاں تھی!"____ میں نے قدرے جز بز ہو کر کہا---- "کہاں ہوتی ہے- اپنے گھر میں ہو گی----"

"اور اس کا گھر کہاں تھا----؟"

"کوہ قاف میں!"____

"اور یہ کوہ قاف کہاں پایا جاتا ہے؟" شہلا کے انکل نے رسالے پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر سوال کیا----

میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا---- وہ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا----

"اس نے تو میری بچی کو بگاڑنے پر کمر باندھ لی ہے----" میں نے اپنے دل میں سوچا عجیب بات ہے- میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ اس لئے ختم کیا تھا کہ اس کی تعلیم مکمل ہو جائے اور اب وہ پڑھ لکھ کر ہمیں احمق سمجھنے لگا تھا____ پھر ستم یہ تھا کہ میری بچی اس کی دل دادہ تھی----

ٹھیک ہے وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا مگر الٹی سیدھی پٹیاں بھی پڑھاتا رہتا تھا اور وہ بچی اتنی سیدھی تھی کہ اس کی ہر بات کو اپنے دل پر نقش کر لیتی تھی---- وہ کہتا ہر بات دلیل سے سمجھاؤ---- ہنہ بچہ دلیل کو کیا جانے----!"

میں اپنے ہی خیالات میں گم تھا----

شہلا کے ہونٹوں پر اس کے انکل کی بات بازگشت بن کر ابھری---- "بتایئے نا ابو---- کوہ قاف کہاں ہے؟"____

"بھئی اس دنیا میں کہیں نہ کہیں تو ضرور ہو گا"____ میں نے دامن بچانا چاہا----

"جی کہیں بھی نہیں ہے!" شہلا نے بڑے اعتماد سے کہا---- "میں نے خود ساری دنیا کا نقشہ دیکھا ہے---- مجھے تمام پہاڑوں کے نام یاد ہیں مگر ان میں کوہ قاف تو کہیں بھی نہیں ہے---- نہیں ہے نا انکل"____

"نہیں بیٹے-" وہ بولا----

"خیر نہ ہو گا----" میں نے ہتھیار ڈالنے میں ہی عافیت دیکھی---- "میں کوہ قاف کی نہیں سبز پری کی کہانی سنا رہا ہوں"____

"مگر جب کوہ قاف ہی نہیں ہوتا تو سبز پری کہاں ہوتی ہو گی----" شہلا نے کہا----

میں نے دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی پھر آہستہ آہستہ مسکرا رہا ہے----

میری جھنجلاہٹ غصے میں تبدیل ہونے لگی----

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ یہ سبز پریاں' سنہری پریاں کہاں ہوتی ہیں----" میں نے ذرا بگڑتے ہوئے کہا---- "لیکن ان کی کہانیاں ضرور ہوتی ہیں- میں تمہیں سبز پری کی

کہانی سنانا چاہتا تھا اور وہ بھی تمہاری فرمائش پر---- خاموشی سے سن سکتی ہو تو اپنا منہ بند کر کے سن لو----" "بیکار ہے"____ شہلا نے بڑی مایوسی سے کہا----

"کیا بیکار ہے؟" میں نے پوچھا---- شہلا نے میری بات کا جواب نہیں دیا وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی----

"جو چیزیں ہوتی ہی نہیں ان کی کہانیاں بنانے سے کیا فائدہ----؟"

چھمیا پیتل کا جھلمل کرتا اگالدان لے آئی اور ماں جی کی پٹی کے نیچے رکھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی----

اماں جی نے پیک کی ایک طویل دھار اگالدان میں انڈیلی اور گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارتے ہوئے بولیں----

"اللہ میری توبہ ہے---- یہ سب قرب قیامت کی نشانیاں ہیں"____

اماں جی کے چھوٹے بیٹے نے کرسی میں جھولتے ہوئے کہا۔ "کیا اماں جی۔ کونسی قرب قیامت کی نشانیاں ہیں"____

"ارے بیٹے۔" انہوں نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا---- "یہ آج کل کے بچے ہیں کہ آفت کا ٹکڑا---- یہ بات ایسی کیوں ہے۔ وہ بات ویسی کیوں ہے؟ ان سے تو اچھے اچھے پناہ مانگ جائیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا کہ"____ "آپ کا زمانہ اماں جی ساٹھ ستر سال پرانی بات ہو چکا ہے۔ ان برسوں میں انسان نے ایک ہی جست میں اتنا لمبا سفر طے کر لیا ہے کہ گزشتہ ساٹھ ہزار سال کی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ یہ ایٹم کا زمانہ ہے۔ خلائی دور ہے"____ تیرا تو دماغ چل گیا ہے لڑکے!" اماں جی کو غصہ آ گیا۔ چار جماعتیں کیا پڑھ گیا ہے کہ ہر ایک کو احمق سمجھنے لگا ہے"____ میرے جسم میں جو غصے کی بھاپ بھر گئی تھی اس کو بھی نکلنے کی راہ مل گئی----

کوئی جاہل آدمی ایسی بات کرے تو نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ میں نے کہا۔ "جب ایسی باتیں پڑھے لکھے سمجھ دار لوگوں کی زبان پر آ جائیں تو اسے قسمت کی ستم ظریفی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اماں جی صبر کرو"____ میرے بھائی نے میری طرف دیکھا----

"خدا گواہ ہے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا"____ وہ بولا---- "میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ----"

"میں تیرا مطلب خوب سمجھتی ہوں بیٹا۔ آخر تیری ماں ہوں۔" اماں جی نے اس کی

باٹ کاٹ کر کہا۔ ان کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا----

"پڑھنے لکھنے کے بعد اگر میں اتنا ہی برا ہو گیا ہوں تو مجھے پڑھایا کیوں تھا؟" میرے بھائی نے "ٹائم" ایک طرف پٹخ دیا اور بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر چل دیا---- شہلا نے میری گود میں بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر میرے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں----

"ابو میں نے تو کہانی سنانے کے لئے کہا تھا آپ لڑنے کیوں لگے؟"____

میں نے سر جھکا کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا----

"ساری بیٹے!" میں نے دھیرے سے کہا---- "مگر دیکھو تم نے پھر ایک سوال پوچھ لیا----!"

کیکٹس

اس نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا تھا!

"کیسا عجیب اتفاق ہے۔" اس نے سوچا۔ "اس وقت اگر کچھ اور مانگ لیا ہوتا تو شاید وہ بھی مل جاتا۔ میں نے سوچا تھا کہ جب دروازہ کھولوں تو کاش کوئی میرے لئے باہر منتظر کھڑا نظر آئے۔۔۔۔ اور لو دیکھو ایسا ہی ہو گیا ہے۔"

شام کی ملگجی روشنی میں نیلے سوٹ میں ملبوس وہ شخص تجسس بھری نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔۔۔۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور نہایت شائستہ انداز میں اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا مس روبینہ یہیں رہتی ہیں؟"

"جی ہاں میں ہی روبینہ ہوں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "آپ بلا تکلف اندر تشریف لے آیئے۔"

روبینہ کے لہجے میں بے قراری اور اضطراب کی رو مچل رہی تھی۔۔۔۔ عام حالات میں وہ اپنے ہاں آنے والے لوگوں کے ساتھ اس قدر جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی مگر آجکل وقت اس کے حق میں نہیں تھا۔ وہ بیمار کیا پڑی تھی کہ اس کے چہرے کی ساری تازگی ساری شادابی اس سے چھن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی شمعیں دھندلا کر رہ گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر اب اس گلدان کا خیال آتا تھا' جس کے پھول کئی روز سے نہ بدلے گئے ہوں۔ یہی دیکھ کر اس کے یہاں پابندی سے آنے والے بھی اس کی عیادت کر کے واپس چلے جاتے تھے۔

یوں تو اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی مگر کھوئی ہوئی تازگی توانائی اور شگفتگی بحال کرنے کے لئے اسے اچھی غذا اور ٹانکوں کی ضرورت تھی لیکن اب اچھی غذا اور ٹانک خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں رہے تھے۔ قرض جتنا وہ لے سکتی تھی۔ بیماری کے دوران ہی لے چکی تھی۔ اب تو اسے یہی آس لگی رہتی تھی کہ کوئی آئے تو اس کا کاروبار چلے لیکن جو آتے تھے وہ ہڈیوں کے ڈھانچے پر اپنا پیسہ نچھاور کرنے کے قائل نہیں تھے۔ انہیں تو

زندگی سے دہکتے ہوئے گداز جسموں کی تلاش ہوتی تھی۔

روبینہ نے دیکھا کہ اس کی پیش کش کے باوجود وہ آدمی بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا ہے یوں لگتا تھا جیسے وہ اندر آتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ روبینہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتی ہوئی کمرے کے اندر لے آئی۔ اس آدمی نے کوئی مزاحمت نہ کی مگر اسے خود اپنی یہ حرکت اچھی نہ لگی----

"ٹھیک ہے میرا پیشہ اچھا نہیں۔" اس نے جھنجلاہٹ کے عالم میں سوچا تھا۔ "مگر میں نے اس پیشے میں بھی ہمیشہ ایک معیار برقرار رکھا۔ کاش میرے گھر سے پیسے آ گئے ہوتے تو میں اتنی مجبور ہرگز نہ ہوتی۔

وہ چھوٹا سا گھر جسے وہ اپنا گھر کہتی تھی۔ اس گنجان آباد صنعتی شہر سے بہت دور ایک چھوٹے سے قصبے میں تھا جہاں اس کی بوڑھی ماں تھی' بوڑھا مفلوج باپ تھا ایک چھوٹی بہن اور اس سے بھی چھوٹا ایک بھائی تھا جو کسی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور جہاں وہ ہر ماہ پابندی سے ایک لگی بندھی رقم بھیجا کرتی تھی---- اس کے گھر والوں کو یہ معلوم تھا کہ وہ کہیں ملازمت کرتی ہے۔ وہ جب گھر سے چلی تھی تو گھر والوں کو اس نے یہی یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد کہیں نہ کہیں ملازمت تلاش کرے گی اور ان کے گذارے کے لئے ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے رقم بھیجتی رہا کرے گی مگر یہاں آ کر اسے معلوم ہوا تھا کہ ملازمت حاصل کرنا اس شہر میں جوئے شیر لانے سے کام نہیں اور یہاں ایک بے سہارا لڑکی کا جسم اگر وہ اس کی قیمت وصول نہیں کر لیتی تو بے مول بھی لٹ جاتا ہے۔ اس وقت اس نے ہوشیاری کے ساتھ فیصلہ کیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب جسم لٹ جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں نہ اس کی قیمت وصول کی جائے۔ اس کاروبار میں اسے بہت جلد یہ گر بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اگر دوکاندار گاہک سے زیادہ اشتیاق کا اظہار کرے تو مال کی قیمت گر جاتی ہے۔ اس نے یہ گر پا لیا تھا تو مول تول میں اس نے گاہکوں کی پرواہ کرنا چھوڑ دی تھی---- اور منہ مانگی قیمت وصول کرنے لگی تھی۔

مگر آج اسے اپنے معیار سے گرنا پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے باپ کو لکھا تھا کہ وہ اس کے لئے کچھ پیسے بھیج دے جو اس پر قرض رہیں گے اور وہ انہیں جلد سے جلد چکا دے گی۔ مگر اس کے باپ کا خط ہی آیا تھا نہ منی آرڈر---- اس پر انتظار اور عذاب بن گیا تھا۔

اور آج جب یہ آدمی پھنسا تھا تو وہ اسے کسی قیمت پر بھی کھو دینا نہیں چاہتی تھی----

"آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے-" روبینہ نے اس آدمی سے کہا- "آپ آخر اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں ہیں-"

"میں بہت مصروف ہوں-" وہ بولا---- "میں بہت جلدی میں ہوں-"

روبینہ کو غصہ آ گیا-

"تو میں کب کہتی ہوں کہ آپ دیر لگائیے-"

اس نے اپنی ریشمی ساڑھی نوچ کر الگنی پر پھینک دی---- اور پیٹی کوٹ کے بٹن کھولنے لگی- اس آدمی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا- "مگر میری بات تو سنئے' ذرا پہلے----!"

"میں مول تول کی قائل نہیں-" روبینہ نے بات کاٹتے ہوئے ترشی سے کہا ____ اور پیٹی کوٹ کو زمین پر گرا دیا-

"خیر جیسی آپ کی مرضی" وہ بولا- اور مسکراتے ہوئے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا-

رخصت ہوتے ہوئے جب اس نے دس دس کے بیس نوٹ گن کر روبینہ کی ہتھیلی پر رکھ دیئے تو اس کی ساری کوفت تحیر آمیز مسرت میں ڈوب گئی- اس نے آواز میں پیار کی مٹھاس گھولتے ہوئے کہا-

"آپ کل پھر آئیں گے نا؟"

"نہیں!" وہ بولا---- "میں نصف شب کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا-"

"آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟" روبینہ نے سوال کیا-

"ہاں- قاسم پور سے!"

"قاسم پور-" روبینہ کو جیسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو- "آپ قاسم پور سے آئے ہیں- میرے امی ابا بھی تو وہیں رہتے ہیں-"

"مجھے معلوم ہے-" اس آدمی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا---- "یہ دو سو روپے انہوں نے ہی تمہیں دینے کے لئے مجھے دیئے تھے-" ____ اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا-

گل مہر

درخواست میرے ہاتھ سے لے کر انہوں نے ایک طرف پٹخ دی اور قدرے ناگواری سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا بات ہے؟"

میں یہ سوچ کر مطمئن تھا کہ میں نے اپنا مافی الضمیر تفصیل سے درخواست میں بیان کر دیا ہے اور اب زبانی کچھ کہنے سننے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی مگر انہوں نے درخواست کو ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کے اچانک سوال سے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنی بات کا آغاز کہاں سے کروں۔ تھوک حلق میں گولا بن کر اٹکنے لگا تو آئے اوسان بھی خطا ہونے لگے۔ میرے سامنے ایک ہی بات روشن تھی کہ مجھے گل مہر سے عشق ہے اور میری زبان پر یہی الفاظ آ گئے۔

"جناب ایسا ہے کہ مجھے گل مہر سے عشق ہے!"

ان کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

"گل مہر سے عشق ہے تو میں کیا کروں۔ شادی کر لو۔ اور اگر شادی نہ ہو سکتی ہو تو....."

انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن لب و لہجے کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر وہ جملہ پورا کرتے تو کہتے۔

"شادی نہ ہو سکے تو خودکشی کر لو۔ خس کم جہاں پاک!"

"گل مہر کوئی لڑکی نہیں ہے جناب!" میں نے ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے آہستہ سے کہا۔

"لڑکی نہیں ہے!" وہ حیرت سے بولے۔ "کوئی لڑکا ہے!"

"نہیں لڑکا بھی نہیں ہے!"

"پھر آخر یہ کیا بلا ہے؟"

"گل مہر ایک درخت ہوتا ہے جناب!" میں نے کہا۔

"درخت!" وہ بولے "حیرت ہے' خیر! اسے انگریزی میں کیا کہتے ہیں!"

"مجھے معلوم نہیں!" میں نے اپنی کم علمی کا اعتراف کر لیا۔

وہ کچھ پھول کر بولے۔ "اس پر پھل لگتے ہیں؟"

"نہیں صرف پھول آتے ہیں!"____ میں نے کہنا شروع کیا۔

"نہایت خوبصورت سرخ سرخ پھول۔ بہت سارے گچھوں کی شکل میں' درخت سرخ سرخ پھولوں سے لد جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ٹہنیوں میں انگارے دہک رہے ہوں یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ سورج کی تمازت سے سونا تپ گیا ہو یا....."

"بس بس! ٹھیک ہے!" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کرتے ہوئے کہا---- "میں پوری بات سمجھ گیا ہوں۔ گل مہر ایک درخت ہے جس پر سرخ پھول آتے ہیں اور جس سے تمہیں عشق ہے!"

"جی ہاں!" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"پھول اچھے داموں بک جاتے ہیں؟"

"مجھے نہیں معلوم! میں نے کبھی بیچنے کی کوشش ہی نہیں کی!"

"اس کی لکڑی میں کوئی خاص بات ہوتی ہے؟"

"جہاں تک مجھے علم ہے' اس کی لکڑی میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہوتی۔"

"پھر آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"____ انہوں نے ایک مرتبہ پھر ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"گل مہر ایک درخت ہوتا ہے' اس پر پھل نہیں لگتے' پھول آتے ہیں۔ پھول بکتے نہیں۔ اس کی لکڑی میں بھی کوئی خاص خوبی نہیں ہوتی۔ گویا ایک ناکارہ درخت ہے اس پر تم کہتے ہو کہ تمہیں گل مہر سے عشق ہے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہاری کس بات کو سچ سمجھوں!"

ان کی طرح میری سمجھ میں بھی کوئی بات نہیں آ رہی تھی' میں سوچ رہا تھا کہ ان کی بات کا کیا جواب دوں اور جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو میں نے بہ آواز بلند سوچنا شروع کر دیا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ گل مہر پر کوئی پھل نہیں لگتا سرخ پھول آتے ہیں جو بک نہیں سکتے'

اس کی لکڑی کے کسی مصرف سے بھی میں آگاہ نہیں ہوں مگر وہ ایک ناکارہ درخت ہرگز نہیں ہوتا بلکہ وہ تو ایک نہایت شان دار اور انتہائی خوبصورت درخت ہوتا ہے۔ اس کے پتے ننھے منے اور گہرے سبز رنگ کے ہوتے ہیں۔ شاخیں نرم و نازک اور قدرتی طور پر اس ترتیب میں آراستہ ہوتی ہیں کہ جیسے ایک دوسرے پر سایہ کئے ہوں دیکھنے والا پہلی نظر میں تو یہ محسوس کرتا ہے کہ انہیں اس ترتیب میں سجایا گیا ہو گا پھر اس کے پھولوں کا تو کوئی ثانی ملنا ہی محال ہے۔ کیا یہ تمام باتیں گل مہر کے عشق میں گرفتار ہو جانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ کیا خوبصورتی سے پیار کرنے کے لئے کوئی جواز ڈھونڈنا پڑتا ہے!"

"تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آتی!" وہ بولے---- "اور سچ پوچھتے ہو تو میرے پاس تمہاری اس بے مصرف گفتگو کو سننے اور سمجھنے کی فرصت نہیں ہے۔ میں نے تو زندگی میں صرف ایک مرتبہ عشق کیا ہے" ایک لڑکی سے اور وہ لڑکی اب میری بیوی ہے۔ اس شادی یا یوں کہہ لو کہ اس عشق سے مجھے عزت' شہرت دولت اور عہدہ سب ہی کچھ ملا ہے۔ مگر تمہارا گل مہر کا عشق آخر تمہیں کیا دیتا ہے۔"

مجھے عشق کی اس تذلیل پر غصہ تو آیا تھا مگر میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

"یہ تو اپنے اپنے نقطہ نظر کی بات ہے۔ میں نے تو اس لڑکی سے بھی جو اب میری بیوی ہے' بے لوث محبت کی تھی۔ مجھے اس شادی یا اس محبت سے عزت' دولت یا عہدہ کچھ بھی نہیں ملا مگر مجھے اس کا افسوس بھی نہیں ہے۔ میں نے اس سے ان چیزوں کی آس ہی نہیں لگائی تھی' وہ لڑکی مجھے اچھی لگتی تھی میں نے اس سے پیار کیا اور اب گل مہر بھی اچھا لگتا ہے تو مجھے اس سے بھی عشق ہے!"

وہ بات سن کر جھنجھلا سے گئے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہاری یہ بے سروپا گفتگو اتنی دیر سے کیوں سن رہا ہوں۔ تمہیں اگر گل مہر سے عشق ہے تو میں کیا کروں تم میرے پاس کس لئے آئے ہو؟"

اور مجھے یہ یاد آیا کہ یہاں کیوں آیا ہوں تو میرے لہجے میں پھر نیاز مندی کا رنگ گہرا ہو گیا۔

"میں خود نہیں آیا جناب! آپ نے مجھے بلایا ہے' آپ نے نوٹس بھجوایا ہے کہ گل مہر کے دو درختوں کی حفاظت کے لئے جو چہار دیواری میں نے بنا لی ہے وہ غیر قانونی ہے اور

بلدیہ کی زمین پر ناجائز قبضہ ہے۔ اس لئے میں اسے گرا دوں ورنہ....."

"اچھا تو یہ چکر ہے!" انہوں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "کس علاقے کا کیس ہے؟"

"حلقہ نیاز پورہ کا جناب!" میں نے انہیں بتایا۔

انہوں نے گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کا جن کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے اپنی آدھی گنجی چندیا کو سہلاتے ہوئے ایک انداز تفاخر سے کہا----

"نیاز پورہ کی فائل لے آؤ۔"

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے!

"گویا بقول تمہارے کیس یہ ہے کہ تم نیاز پورہ میں رہتے ہو۔ تمہیں گل مہر سے عشق ہے اور تم نے بلدیہ کی زمین پر دو گل مہر کے درخت لگا رکھے ہیں اور ان درختوں کی حفاظت کے لئے ایک چہار دیواری تعمیر کرائی ہے۔"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔

"اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ بات اس قابل ہے کہ کوئی بھی صحیح الدماغ آدمی اس بات پر اعتبار کرے۔"

"میں نے کوئی بات غلط نہیں کہی۔" میں نے عرض کیا۔

"خیر یونہی سہی!" وہ بولے---- "مگر اب یہ بتاؤ کہ اگر تم کو گل مہر کے درختوں سے اتنا ہی عشق ہے تو تم نے یہ پیڑ گھر کے اندر صحن میں کیوں نہیں لگائے۔ ان کے لئے بلدیہ کی زمین پر قبضہ کیوں کیا؟"

میں ایک مرتبہ پھر سراپا نیاز بن گیا۔

"جناب ہمارے گھر میں صحن نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ ہمارا گھر ایک چھوٹے سے پلاٹ پر بنے ہوئے تین چھوٹے چھوٹے کمروں کا نام ہے جس میں ہم درجن بھر افراد کسی نہ کسی طرح گذر بسر کرتے ہیں۔ گھر کے اندر جو جگہ خالی چھوڑی گئی ہے اس میں پیڑ لگانے کی کوئی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی۔"

انہیں اس بات پر سخت حیرت ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے تین کمروں کے مکان میں درجن بھر افراد کیسے سما سکتے ہیں مگر انہوں نے کہا کہ اس صورت حال کی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی۔ ان کے فرائض منصبی میں تو یہ دیکھنا شامل ہے کہ بلدیہ کی زمین پر ناجائز قبضہ نہ

ہونے پائے!

اور میں نے عرض کیا کہ میں ان کے فرائض منصبی کی انجام دہی میں رخنہ ڈالنے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتا۔

چپراسی فائل ان کے سامنے رکھ گیا۔

انہوں نے فائل کھولتے ہوئے پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"شمشیر علی!"

انہوں نے دو چار ورق الٹ پلٹ کئے اور پھر ایک جگہ رکتے ہوئے بولے۔

"شمشیر علی! ہمارے سپروائزر نے رپورٹ کی ہے کہ تم نے کوئی 25 فٹ لمبی' 30 فٹ چوڑی اور تقریباً آٹھ فٹ اونچی پختہ دیوار تعمیر کرائی اور اس طرح بلدیہ کی زمین پر ناجائز قبضہ کیا ہے---- کیا یہ رپورٹ غلط ہے۔"

"غلط تو نہیں ہے"____ میں نے کہا---- "مگر یہ بات غلط ہے کہ میں نے بلدیہ کی زمین پر قبضہ کیا ہے۔ اس زمین پر درخت لگانے کی ممانعت نہیں ہے' میں نے وہاں گل مہر کے درخت لگائے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے ریلیا کی باڑ لگائی تھی مگر ہمارے پڑوس میں ایک صاحب نے بھینسیں پال لی ہیں اور ان بھینسوں نے ادھر سے گذرتے ہوئے ریلیا کی باڑھ کو تباہ کر دیا اور اگر میں یہ چہار دیواری نہ بنوا لیتا تو وہ یقیناً گل مہر کے درختوں کو بھی تباہ کر دیتیں۔"

انہوں نے فائل میں دو چار ورق اور الٹے پلٹے اور بولے۔ "تمہارا اشارہ حاجی مشتاق کی طرف ہے۔"

"جی ہاں۔"

"ان کی رپورٹ بھی آئی تھی!"

اور اس وقت اچانک مجھے یاد آیا کہ انہوں نے بھی اپنی بھینسوں کے لئے بلدیہ کی زمین پر ایک احاطہ تعمیر کر رکھا ہے۔

"اس رپورٹ پر آپ نے کیا فیصلہ دیا۔" میں نے پوچھا۔

"ان کی بات دوسری ہے۔"

انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا:

"انہیں گل مہر سے نہیں۔ بھینسوں سے عشق ہے اور بھینس بڑی کارآمد چیز ہے' اس

سے سارے محلے کو دودھ ملتا ہے!"

"دودھ!" حاجی صاحب کا دودھ یاد آیا تو میرے لہجے میں تلخی آگئی اور تلخی اتنی زیادہ جتنا حاجی مشتاق کے دودھ میں پانی شامل ہوتا ہے!"

"کیوں اس دودھ میں کوئی خرابی ہوتی ہے؟"

"دودھ وہ ہوتا ہی کب ہے؟" میں بولا---- وہ "سیدھا سادا دودھ ملا پانی ہوتا ہے۔ اور اس پر دھونس یہ کہ لینا ہے تو لو ورنہ راستہ ناپو۔"

خیر ایسی بات تو نہیں ہے! "ہمارے گھر وہیں سے دودھ آتا ہے!"

میں نے موضوع بدل دیا۔

"مگر بلدیہ کے قانون میں قبضہ تو ان کا بھی ناجائز ہی ہو گا۔"

"ہاں ہے تو سہی!" وہ بولے---- "مگر ان کی بات دوسری ہے۔ انہوں نے یہ قبضہ خدمت خلق کے لئے کیا ہے۔ دودھ انسان کی بنیادی غذائی ضرورت ہے اور وہ سارے محلے کو دودھ ایسی نعمت فراہم کرتے ہیں' اس لئے ان کے ساتھ رعایت ممکن ہے۔ مگر تمہارے گل مہر کے درختوں سے کسی کو کیا ملتا ہے۔ محلے والوں کو ان سے کیا فیض پہنچتا ہے۔"

"کیا فیض پہنچتا ہے؟" میں ایک مرتبہ پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ بڑی دیر تک مجھے کوئی جواب سجھائی نہ دیا۔ اور اس مرتبہ پھر میں نے باآواز بلند سوچنا شروع کیا۔

"یہ تو ٹھیک ہے کہ گل مہر سے کوئی بنیادی غذائی ضرورت پورتی نہیں ہوتی نہ ہی اس سے کسی کا پیٹ بھرتا ہے۔ مگر جب اس پر پھول کھلتے ہیں تو سارا محلہ اس کی خوشبو سے مہکنے لگتا ہے اور اس خوشبو کے تلے حاجی مشتاق کے باڑے سے اٹھنے والے گوبر اور پیشاب کی بدبو کے بھبکے بھی دب جاتے ہیں اور لوگ لمبے لمبے سانس لینے کے قابل ہو جاتے ہیں---- دن بھر کے تھکے ہوئے لوگ جب ادھر سے گذرتے ہوئے درختوں کو نظر بھر دیکھتے ہیں تو انہیں اپنے دل کی کلی کھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے' روح میں کشادگی محسوس ہوتی ہے اور جب کوئی تھکا ہارا راہرو ان کے سائے میں بیٹھتا ہے تو....."

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

"بس بس میں سمجھ گیا۔" وہ بولے۔

انہوں نے میری درخواست اٹھائی اور کہا۔

"کیس کی نوعیت گویا یہ ہے کہ تمہارا نیاز پورہ میں مکان ہے۔ تمہیں گل مہر سے عشق

ہے۔ تم نے گل مہر کے دو درخت لگا رکھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کوئی 25 فٹ لمبی' 20 فٹ چوڑی اور تقریباً آٹھ فٹ اونچی دیوار تعمیر کرائی ہے اور اس طرح بلدیہ کی زمین پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے۔ تمہیں یہ تم حقائق تسلیم ہیں۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "تسلیم ہیں سوائے اس کے..... سوائے کچھ نہیں۔"

انہوں نے میری بات کاٹ کر تیزی سے کہا اور پھر درخواست پر کچھ لکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے قلم روکا تو درخواست میرے ہاتھ میں تھما دی۔

درخواست پر اپنے حکم میں انہوں نے تحریر کیا تھا۔

"درخواست کو ملاحظہ کرنے اور دلائل کو تفصیل سے سننے اور ان پر منصفانہ غور کرنے کے بعد درخواست گذار کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ تین یوم کے اندر اندر ناجائز قبضہ ختم کر دے۔ بصورت دیگر بلدیہ خود یہ اقدام کرے گی اور سارے اخراجات درخواست گذار کے ذمے ہوں گے۔"

بابا کوکا شاہ

سرتاج ہوٹل کی بالائی منزل کی چھت پر نیون سائن کی روشنیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ روشنیوں کو مرحلہ در مرحلہ اس طرح ترتیب سے رکھا گیا تھا کہ دور سے دیکھنے والوں کو یوں لگتا تھا جیسے ایک غیبی ہاتھ سے چھٹ کر روپے کے چمک دار سکے ایک بڑی سی تجوری میں لگاتار گر رہے ہوں اور گر کر غائب ہوتے جا رہے ہوں۔ تجوری کے نیچے جلتی بجھتی روشنی سے لکھا تھا۔ "قطرہ قطرہ دریا ہو جاتا ہے۔ اپنی بچت بنک میں جمع کرائیے!"

____ سڑک پر شام کا طوفانی ٹریفک بہہ رہا تھا اور ہوٹل کے باہر فٹ پاتھ پر ہر روز کی طرح آج بھی بابا کوکا شاہ چھوٹی سی صندوقچی کو اپنے سینے سے چمٹائے کھڑے' منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے اور لوگوں کو مٹھی بھر بھر کر روپے تقسیم کر رہے تھے۔

منور اور احمد نور کو بابا کوکا شاہ کے دائیں بائیں کھڑے بڑی دیر ہو گئی تھی۔ مگر ابھی تک ان کا نمبر نہیں آیا تھا۔ آج ایک نئی فلم لگی تھی۔ وہ فلم دیکھنا چاہتے تھے' مگر ٹکٹ خریدنے کے لئے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ شاید بابا کوکا شاہ کی نظر ان پر پڑ جائے اور ان کی پیسوں سے بھری مٹھی ان کی طرف بھی بڑھ جائے۔

شو شروع ہونے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اور اب ان پر ایک ایک پل بھاری تھا۔ اس مرتبہ جو بابا کوکا شاہ کا ہاتھ ان کی جیب میں گیا تو احمد نور نے جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ انہوں نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھور کر اسے دیکھا اور ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔ "دفع ہو جا یہ پیسہ حرام کاری کے لئے نہیں ہے۔"

احمد نور سٹپٹا کر پیچھے ہٹ گیا اور کھسیا کر منور سے کہنے لگا۔ "چھوڑ بھی یار---- ہم بھی کس پاگل کے چکر میں پھنس گئے"____

مگر بابا کوکا شاہ کو پاگل کہنے والے لوگ بہت ہی کم تھے۔ ان کے بارے میں عام رائے یہ تھی کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں اور جس قدر ان کا لباس میلا ہے دل اتنا ہی اجلا ہے۔ جب سے انہیں معرفت الٰہی نصیب ہوئی ہے' دنیا' دنیا والے اور دنیا داری کی ہر چیز ان

کی نظر میں بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔ کچھ انہیں مجذوب ٹھہراتے تھے اور سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ اس شہر کے ہر اچھے برے واقعے میں ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ ان کی اجازت کے بغیر اس شہر میں پتا تک نہیں ہلتا۔ لوگ ان سے مرادیں مانگتے تھے اور پاتے تھے۔ کوئی اولاد مانگتا' کوئی محبوب کا قرب اور کوئی دھن دولت! وہ کسی کو گالی سے نوازتے' کسی کے ڈنڈا دے مارتے اور کسی کے منہ پر تھوک دیتے۔ ہر سائل اس قدر ہتک آمیز سلوک کے بعد بھی خوشی سے کھل اٹھتا اور اسے یقین ہو جاتا کہ اب اس کی مراد بر آئے گی۔ وہ سائل بدنصیب ٹھہرایا جاتا' جس کے سوال کے جواب میں بابا کوکا شاہ ایک پتھر کے بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھے رہتے۔ اس کی مراد کے لئے باب قبولیت گویا بند کا بند رہ جاتا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ان سے سٹے کے نمبر پوچھ کر اس پر داؤ لگاتے تھے اور راتوں رات دھن والے بن جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ نمبر بتانے کا ان کا طریقہ اتنا پیچیدہ اور عجیب و غریب ہوتا تھا کہ صحیح نمبر تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ ہوتی۔ بہت سے اس چکر میں اپنا دیوالیہ کرا بیٹھے تھے' مگر ظاہر ہے اس میں بابا کوکا شاہ کا کیا قصور تھا---- انہوں نے تو ہمیشہ صحیح نمبر ہی بتایا تھا' اگر سمجھنے والا نہ سمجھ سکا' تو یہ اس کی فہم کا عجز تھا----

کہنے کو تو احمد نور نے بابا کوکا شاہ کو پاگل کہہ دیا' مگر ایک مرتبہ وہ سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ اور اس نے فوراً" ہی بات بنائی---- "خیر بابا پاگل تو نہیں ہے' مگر یار کبھی کبھی تو وہ بالکل ہی پاگلوں والی باتیں کرنے لگتے ہیں۔" پھر وہ منور سے کہنے لگا۔ "چل یار کہیں اور چلتے ہیں؟"

منور نے کہا---- "اب کہاں جائیں گے۔ پکچر کا وقت تو نکل ہی گیا ہے۔ چلو ہوٹل میں بیٹھ کر ایک کپ چائے ہی پی لیں"____

وہ دونوں ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

بابا کوکا شاہ کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں اور اس شہر میں کب وارد ہوئے تھے؟ سردی ہو یا گرمی ان کے جسم پر صرف ایک بڑا اونی کوٹ ہوتا جو اب بوسیدہ ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور جس پر میل کی اتنی گہری تہہ جم چکی تھی کہ اس کا رنگ پہچاننا کار محال تھا۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال میلے اور لمبے اور اس قدر الجھے ہوئے ہوتے اور ان کی آنکھیں ہمیشہ اس قدر سرخ سرخ ہوتیں کہ انہیں دیکھ

کر وحشت ہونے لگتی مگر وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ دن بھر بابا کوکا شاہ کے اردگرد ان کے پرستاروں اور عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا۔ ان کے ایک اشارے پر سب کے سب دوڑ پڑتے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ وہ کھانے پینے کی جس چیز کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لیتے وہ فوراً ان کے سامنے پیش کر دی جاتی۔ وہ کسی سے ایک پیسے کا سوال کرتے تو کئی کئی روپیوں کی ریزگاری ان کی ہتھیلی پر رکھ دی جاتی۔ نوٹوں سے انہیں چڑ تھی اگر کبھی کوئی بھولے سے نوٹ دے بھی دیتا تھا تو وہ برا سا منہ بناتے اور مروڑ کر اسے نالی میں پھینک دیتے۔

بابا کوکا شاہ کی شخصیت کے گرد اسرار کی ایک گہری دھند چھائی ہوئی تھی۔ کوئی کہتا کہ وہ بچپن ہی سے ایسے تھے' کوئی کہتا کہ نہیں ان کے بیوی بچے تھے مگر جب اچانک انہیں اپنے دل میں ایک روشنی نظر آئی' تو انہوں نے دنیا کو تیاگ کر فقیری لے لی۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کی بیوی ڈیڑھ دو سال کی ایک چھوٹی سی بچی کو چھوڑ کر اس دنیا سے منہ موڑ گئی تھی اور وہ بچی کو سینے سے لگا کر شہروں شہروں مارے مارے پھرتے رہے مگر ایک دن جب بچی بھی مر گئی تو ان کا ذہنی توازن برقرار نہ رہ سکا۔ لیکن ان تمام باتوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جس کی کوئی وثوق کے ساتھ تصدیق کر سکتا۔

بابا کوکا شاہ کی ذات کی طرح ان کی چھوٹی سی صندوقچی بھی رازوں کی پٹاری بنی ہوئی تھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس صندوقچی میں کیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ پیسے جو وہ مٹھی بھر بھر کر تقسیم کرتے ہیں۔ لوگوں کے دیئے ہوئے نہیں ہوتے۔ لوگ انہیں اتنے پیسے تھوڑی دیتے ہی وہ اسی صندوقچی کی کرامت ہوتے ہیں۔ رات بھر میں وہ صندوقچی روپے پیسوں سے لبالب بھر جاتی ہے اور صبح کو وہ ساری رقم اپنی جیب میں ڈال کر اسے تقسیم کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

احمد نور اور منور چائے پی کر ہوٹل سے باہر آئے تو منور کسی گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کس سوچ میں پڑ گئے ہو۔" احمد نور نے پوچھا:

"میں سوچ رہا تھا۔" منور نے کہا۔۔۔۔ "کہ کیا کسی طرح سے بابا کوکا شاہ کی یہ صندوقچی پار نہیں ہو سکتی۔"

"صندوقچی پار کر کے ہم کیا کریں گے۔" احمد نور نے کہا۔

منور نے تعجب خیز نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔ "کیا واقعی تمہیں یہ معلوم نہیں کہ بابا جو پیسے تقسیم کرتے ہیں وہ اسی صندوقچی کی کرامت ہیں۔ رات بھر میں یہ صندوقچی پیسوں سے بھر جاتی ہے۔"

کیوں جھوٹ بول رہے ہو' یار احمد نور نے کہا:

"کمال ہے تم اسے جھوٹ سمجھ رہے ہو۔" منور نے کہا۔ "اگر یہ جھوٹ ہے تو یہ بتاؤ کہ ان کے پاس پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ میری بات مانو میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔"

"تمہاری بات سچ ہے تو صندوقچی کو اڑانا کونسی مشکل بات ہے۔" منور نے کہا۔۔۔ "آخر بابا رات کو کہیں سوتے تو ضرور ہوں گے۔ جب وہ سو جائیں تو یہ صندوقچی اٹھا کر بھاگ لو۔"

"بس ٹھیک ہے۔" منور بولا۔

پھر وہ دونوں سڑک پار کر کے سامنے والے فٹ پاتھ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔

ہوٹل پر نیون سائن کی روشنیاں جگمگ جگمگ کرتی رہیں۔ چمکتے ہوئے سکے ایک ایک کر کے بڑی سی تجوری میں گرتے رہے اور رات گئے تک بابا کوکا شاہ مٹھی بھر بھر کر پیسے لوگوں میں تقسیم کرتے رہے۔

پھر سڑک سنسان ہونے لگی۔ بابا کوکا شاہ کے عقیدت مند جب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے' تو وہ بھی ایک طرف چل دیئے۔ منور اور احمد نور ایک فاصلے سے ان کے پیچھے چلنے لگے۔ چلتے چلتے وہ شہر سے باہر نکل آئے۔ بابا کوکا شاہ کا رخ اب ایک بڑے قبرستان کی طرف تھا اور آخر وہ سڑک چھوڑ کر قبرستان میں داخل ہو گئے۔ منور اور احمد نور بھی پیچھے لگے رہے۔۔۔۔

چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ اور فاصلے کے باوجود انہیں بابا کوکا شاہ کا ہیولا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک قبر کے پاس جا کر رک گئے۔ کچھ دیر قبر کو دیکھتے رہے اور پھر وہیں قبر پر بیٹھ گئے۔ دور سے منور اور احمد نور کو ایسا لگا جیسے انہوں نے صندوقچی کھول کر کوئی چیز نکالی ہو۔ اور اسے دیر تک گھورتے رہے ہوں۔ پھر وہ قبر پر سر رکھ کر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

منور اور احمد نور کھڑے ان کے سو جانے کا انتظار کرتے رہے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب بابا کوکا شاہ پوری طرح سو چکے ہیں تو دبے دبے قدموں سے ان کے پاس پہنچے۔ صندوقچی بابا کے سینے پر رکھی ہوئی تھی اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے دبایا ہوا

تھا۔ منور نے آگے بڑھ کر جیسے ہی صندوقچی اٹھائی۔ ان کی آنکھ کھل گئی اور وہ ایک چیخ مار کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

منور صندوقچی لے کر بھاگ نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے احمد نور بھی تھا اور ان دونوں کے تعاقب میں بابا کوکا شاہ گالیاں بکتے ہوئے دوڑتے چلے آ رہے تھے' وہ بھاگتے بھاگتے سڑک پر آ گئے' مگر بابا نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔۔۔۔ ایک دفعہ جو منور نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے ٹھوکر لگی اور وہ پکی سڑک پر گر گیا۔ صندوقچی اس کے ہاتھ سے چھٹ کر دور جا گری اس کا ڈھکنا کھل گیا اور اس میں جو کچھ تھا وہ سڑک پر بکھر گیا۔ منور نے غور سے ان چیزوں کو دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ سڑک پر بچی کا ایک چھوٹا سا پھول دار فراک' ایک گڑیا اور ایک جھنجھنا پڑا ہوا تھا۔

بابا کوکا شاہ دوڑتے ہوئے اس کے قریب آ گئے وہ ڈر کر پھر بھاگنے ہی والا تھا کہ بابا کی نگاہ صندوقچی اور سڑک پر بکھری ہوئی چیزوں پر پڑی۔ وہ اسے بھول گئے اور جھک کر ایک ایک چیز کو اٹھانے لگے۔ انہوں نے فراک' گڑیا اور جھنجھنے کو ایک مرتبہ پھر سنبھال کر صندوقچی میں رکھا اور صندوقچی کو سینے سے لگا کر اس طرح بھینچ لیا جیسے وہ ٹین کی بے جان صندوقچی نہیں۔ جیتی جاگتی بچی ہو۔

بارش

بلا کا حبس تھا----

ایسا حبس کہ لو کا جھونکا بھی اگر کسی سمت سے آ جاتا تو لوگوں کے چہروں پر طمانیت کی شادابی پھیل جاتی۔ حبس تھا اور قیامت کی گرمی!---- سورج سوا نیزے پر اتر آیا تھا----

انسانوں کا تو ذکر ہی کیا جانور تک اس حبس سے بدحال ہوئے جاتے تھے۔ کتوں کی زبانیں جبڑوں سے باہر لٹکی ہوئی تھیں اور وہ نالیوں اور گندے پانی کے جوہڑوں میں پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ پرندے درختوں کی شاخوں میں نڈھال' آنے والے طوفان سے سہمے ہوئے بیٹھے تھے----

ہر شخص کو یقین تھا کہ طوفان آنے والا ہے----

شام ہوتے ہوئے طوفان کے آثار نمودار ہونے شروع ہوئے۔ پہلے آسمان پر چیلوں اور گدھوں نے چکر لگانے شروع کئے۔ پھر افق پر دھوئیں کے سے بادل نمودار ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان بادلوں نے نیچی اونچی چٹانوں کے ایک ختم نہ ہونے والے سلسلے کا روپ دھار لیا۔ پھر یہ چٹانیں حرکت کرنے لگیں۔ ان کی چوٹیاں تیزی سے آسمان کی بلندیوں کی طرف لپکنے لگیں۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد پتہ چلا کہ یہ تو فریب نظر تھا وہ تو آندھی تھی اور سر پر آ گئی تھی----

آندھی کیا تھی قہر الٰہی تھا!---- بالکل سیاہ!

ہر سو اندھیرا چھا گیا تھا۔ چار قدم کے فاصلے کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی تھی---- ہوا میں ایسا زور تھا کہ اچھے اچھے بلوانوں کا قدم جمانا محال ہو گیا---- درخت جڑوں سے اکھڑ کر اوندھے منہ زمین پر آ رہے۔ کتنے ہی مکانوں کی چھتیں اڑ گئیں۔ سڑکوں پر چلتی ہوئی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں یا ہوا کے جھکڑوں کی زد پر آ کر الٹ گئیں۔ بجلی کا نظام درہم برہم ہو گیا اور پورا شہر تاریکی میں ڈوب گیا----

اس نے اپنے کمرے میں چھپ کر کھڑکی اور دروازے بند کر لئے!----

پھر آندھی کے ساتھ مینہ برسنے لگا----

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر دیکھا- موسلا دھار بارش ہو رہی تھی- آسمان پر بجلی کسی بے چین روح کی طرح تڑپ رہی تھی' بادلوں کے گرجنے کے بلند آہنگ شور سے دیواریں لرز اٹھتی تھیں اور کھڑکیوں کے شیشے بجنے لگتے تھے----

"اب اس حبس اور گرمی سے تو نجات مل ہی جائے گی!"____ اس نے دل میں سوچا---- "انسان کے لئے سانس لینا آسان ہو جائے گا----"

شام کے سارے پروگرام منسوخ ہو گئے تھے---- وہ کھڑکی کھلی چھوڑ کر پلنگ پر لیٹ گیا اور اسے نیند آ گئی----

اس کی آنکھ کھلی تو شہر بدستور تاریکی کی چادر میں لپٹا ہوا تھا- کمرے میں بھی اتنا گھپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا- بارش کا زور ابھی کم نہیں ہوا تھا- رات کا وہ کون سا پہر تھا اسے اندازہ نہ ہو سکا- اس نے سوچا کمرے سے باہر نکل کر دیکھے- اس نے پلنگ سے نیچے پاؤں لٹکائے تو پاؤں پانی میں ڈوب گئے----

"نشیب میں گھر بنانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے!----" اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کہا---- "ذرا سی بارش ہو تو پڑوس کا پانی بھی گھر میں بھر جاتا ہے!----"

اس نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر ایک مرتبہ پھر سونے کی کوشش کرنے لگا- رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی اور بادل اس زور سے گرجتا تھا کہ سارا کمرہ لرز کر رہ جاتا تھا- لوگ گھروں میں سہمے ہوئے بیٹھے تھے اور گھر سے باہر گلیوں اور بازاروں میں ہوا چنگھاڑتی پھر رہی تھی- بجلی کے تاروں' درختوں کی شاخوں اور گھروں کی کھلی ہوئی کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ہوا گزرتی تھی تو عجیب آسیب زدہ آوازیں فضا میں گونجنے لگتیں- اس کی آنکھوں کے سامنے ان جانے خوف کے بدہیئت بھتنے بے ہنگم رقص کرنے لگے----

"خدا جانے صبح تک اس طوفان کے ہاتھوں اس شہر کا کیا عالم ہو جائے-" اس نے سوچا اور پھر چادر میں منہ چھپا کر سونے کی کوشش کرنے لگا-

اس مرتبہ اس کی آنکھ کھلی تو اس کا بستر سیل چکا تھا- کیڑے مکوڑے اور شاید چھپکلیاں بھی اس کے بستر میں پناہ لینے کے لئے اس کے بدن پر رینگ رہی تھیں- وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا----

"یااللہ یہ کیا عذاب!"____ اس نے بلند آواز سے کہا مگر اس کو دلاسا دینے کے لئے

کمرے میں اس کی آواز کی کھوکھلی گونج کے سوا کوئی نہیں تھا----

اس نے جیب میں سے ماچس کی ڈبیا نکال کر ایک تیلی جلائی---- پانی اس کے پلنگ کی پٹیوں تک آ چکا تھا۔ وہ تیزی سے پانی میں کود گیا اور دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا مگر دروازہ بہت سختی سے بند تھا۔ اس نے اپنے جسم کی تمام توانائی کو مجتمع کیا اور دروازے کو اپنی طرف کھینچنے لگا مگر دروازے میں جنبش نہ ہوئی!----

"اگر دروازہ نہ کھلا اور پانی اسی طرح بڑھتا رہا تو----؟" اس کے ذہن میں ایک خوفناک اندیشے کے سپنولیے نے سر اٹھایا۔ اس نے سنا تھا کہ آگ میں جھلس کر اور پانی میں ڈوب کر مرنا بہت ہی اذیت ناک ہوتا ہے۔ اس نے پاگلوں کی طرح دروازے کو ٹھوکریں مارنا اور اندر کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ مگر پانی کی وجہ سے نہ ٹھوکروں میں زور تھا' نہ پوری طاقت سے پاؤں جما کر کواڑ کو ہی کھینچا جا رہا تھا۔ وہ دروازے کو چھوڑ کر کھڑکی کی سلاخوں پر زور آزمائی کرنے لگا' مگر آہنی سلاخیں بہت موٹی موٹی اور مضبوط تھیں اس کا سانس پھول گیا اور اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی----

اس نے ایک مرتبہ پھر ماچس جلائی اور پلٹ کر کمرے کے اندر دیکھا۔ اب پانی کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کا پورا بستر پانی میں ڈوب چکا تھا۔ اچانک کمرے کے کونے میں رکھے ہوئے ایک بڑے بکس پر اس کی نگاہ پڑی اس کے دل میں امید کی ایک کرن اتر آئی---- اس نے ماچس کی جلتی ہوئی تیلی کو پانی میں پھینک دیا۔ تیلی ایک خفیف سی آواز کے ساتھ بجھ گئی۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنا شروع کیا۔ پانی میں صندوق کا وزن کم ہو گیا تھا۔ لیکن جب اس نے صندوق کو پلنگ کے اوپر رکھنے کے لئے پانی سے باہر نکالا تو اسے اس کے صحیح وزن کا اندازہ ہوا عام حالات ہوتے تو وہ اکیلا اس صندوق کو نہیں اٹھا سکتا تھا۔ صندوق کو اچھی طرح سے پلنگ پر جما کر وہ صندوق کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا----

"اتنا پانی تو ہرگز نہیں آئے گا کہ یہ صندوق بھی پانی میں ڈوب جائے۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اسے کسی حد تک اطمینان ہوا تو اس نے گھر سے باہر کی آوازوں پر کان لگائے۔ اب بستی میں ہر طرف جگار ہو چکی تھی۔ بارش اور تیز ہواؤں کی سیٹیوں کے درمیان بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ عورتیں اور مرد بوکھلاہٹ کے عالم میں چیخ چلا رہے تھے۔ اور ان آوازوں کے درمیان کبھی کبھی کسی دیوار یا چھت کے گرنے کی

بوجھل آواز بھی آ جاتی تھی۔ اسے اپنے کمرے کے گرنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ دیواریں مضبوط تھیں اور چھت آر سی سی کی---- اسے یقین تھا کہ اس کا کمرہ شدید ترین طوفان کا بھی مقابلہ کر سکتا ہے----

ایک مرتبہ پھر اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالا اور لمبے لمبے کش لے کر نیند بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ سگریٹ کی مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ حشرات الارض کی ایک فوج اب صندوق پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ماچس کی ایک تیلی جلائی اور انہیں غور سے دیکھنے لگا۔ چھوٹے بڑے بے شمار کیڑے تھے جو ایک دوسرے کے پیچھے ایک قطار میں اوپر چلے آ رہے تھے۔ ان میں کتنے ہی زہریلے کیڑے ہوں گے۔ اس نے ایک تولیے سے انہیں پانی میں گرا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کے پیروں کے پاس بیٹھی ہوئی ایک موٹی سی چھپکلی پانی میں کود گئی۔ اس کے پورے جسم میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور پورے جسم کے بال کھڑے ہو گئے---- ماچس کی تیلی بجھنے کو تھی کہ اس کی نگاہ کمرے کے مشرقی گوشے میں کسی چمک دار گول رسی جیسی چیز پر پڑی۔ تیلی بجھ گئی تو اسے خیال آیا کہ کہیں وہ سانپ تو نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس پر دہشت طاری ہو گئی۔ ماچس کی چند تیلیاں ہی باقی رہ گئی تھیں جنہیں وہ ایمرجنسی کے لئے بچا رکھنا چاہتا تھا مگر اس نے ایک تیلی اور جلائی اور اس تیرتی ہوئی چیز کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ اس کی سائیکل کی پرانی ٹیوب تھی۔ "لاحول ولا قوۃ----" وہ اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔

اس نے سگریٹ کا آخری ٹکڑا پانی میں اچھال دیا اور گھٹنوں پر سر رکھ کر صبح کا انتظار کرنے لگا---- صبح ہو گی تو امدادی کام شروع ہو گا۔ کوئی امدادی پارٹی اس کا دروازہ توڑ کر اسے بھی گھر سے باہر نکال لے گی!----

وہ شاید پھر سو گیا تھا----

اس مرتبہ کسی کیڑے نے زور سے اس کے پاؤں میں کاٹا تھا تو اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کے پاؤں پر بے شمار کیڑے لپٹے ہوئے تھے جیسے مٹھائی کی ڈلی پر مکھیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ اس نے ہاتھ سے مسل مسل کر انہیں پانی میں پھینکنا شروع کر دیا۔ اس کے پاؤں میں شدید سوزش ہو رہی تھی۔ کیڑا بہت زہریلا معلوم ہوتا تھا----

اس نے ہاتھ نیچے کر کے پانی کی سطح معلوم کرنی چاہی۔ پانی صندوق کے ڈھکنے تک آ

چکا تھا----

"اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی کی سطح میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے!"____

اس نے ایک مرتبہ پھر ماچس کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیا- پانی کھڑکی کے راستے بہت تیزی سے کمرے میں آ رہا تھا- کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر کا کوڑا کرکٹ اور غلاظت کمرے کے اندر آ گئی تھی اور اب اس کے اردگرد پھیلی ہوئی تھی- اگر پانی کی سطح اسی طرح بلند ہوتی رہی تو....." ایک مرتبہ پھر وہ بے اختیار پانی میں کود گیا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا- پانی کی وجہ سے لکڑی پھول چکی تھی اور دروازہ کھلنے کے کوئی آثار نہیں تھے---- اس نے زور زور سے کواڑ پر ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں مگر اس کی ٹھوکروں کے مقابلے میں دروازہ بہت مضبوط تھا---- اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور اس کے اعصاب جواب دے گئے----

"کاش یہ دروازہ اتنا مضبوط نہ ہوتا"____ اس نے ہمت ہارتے ہوئے سوچا____

"کھڑکی کی سلاخیں بھی بہت مضبوط ہیں' ان سے سر پھوڑنا بھی بے سود ہے!----"

وہ ایک مرتبہ پھر صندوق پر چڑھ گیا- مگر اس مرتبہ پانی صندوق کے اوپر تک آ چکا تھا اور اس کے پاؤں پانی میں ڈوبے ہوئے تھے---- "اب تو بیٹھنے کی صورت بھی نہیں رہی---- اور پانی میں کتنی دیر کھڑا رہا جا سکتا ہے!"____

اس طرح تو موت یقینی ہے- اس نے دل میں سوچا اور بے بسی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے لگا- اسے کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی- اس کے چہار جانب اگر کوئی چیز زندہ تھی تو وہ پانی تھا---- پانی جو کھڑکی کے راستے تیزی سے اس کے کمرے میں آ رہا تھا- آخر یہ پانی کہاں سے آ رہا ہے؟ اس نے سوچا- بارش تو پہلے بھی ہوتی تھی مگر اتنا پانی تو کبھی نہیں آیا تھا---- آس پاس کوئی دریا بھی نہیں تھا جس کا بند ٹوٹنے کی وجہ سے سیلاب آ جائے- ہاں شہر کے پاس سے ایک نہر ضرور گزرتی ہے- ممکن ہے اس میں شگاف پڑ گیا ہو- "خدا جانے کیا ہوا ہے؟" اس نے جھنجھلا کر کہا---- "اس کمرے میں بند پڑے رہنے سے تو کچھ معلوم نہیں ہو سکتا- کیسی عجیب بات ہے- میں اس کمرے میں پانی میں ڈوب کر مر جاؤں گا اور آخر وقت تک مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ طوفان کا وہ ریلا جس نے میری جان لے لی کس طرف سے آیا تھا- کس کی حماقت یا بداحتیاطی نے مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیا----"

پانی اب اس کے ٹخنوں سے اوپر آ چکا تھا۔ حشرات الارض اس کے پیروں سے چمٹے ہوئے تھے۔ جس پیر میں کیڑے نے کاٹا تھا اس میں اب سوزش بڑھ گئی تھی' اس نے جھک کر ہاتھ لگایا ورم بھی ہو گیا---- "اس گندے پانی سے تو سیپٹک بھی ہو جائے گا----"

"تو کیا واقعی میں اس کمرے میں گھٹ کر مر جاؤں گا اور میری لاش یہاں پڑی سڑتی رہے گی----" اس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار میں ایک روشن دان تھا۔ اب یہی اس کی امید کا آخری سہارا تھا۔ وہ پانی میں اتر گیا اور پلنگ کو دھکیل کر مشرقی دیوار سے ملا دیا۔ پھر اس نے صندوق پر کھڑے ہو کر روشن دان سے باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی---- مگر فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہ راستہ بھی مسدود ہے۔ چوروں کے خوف سے اس نے روشن دان کے باہر لوہے کی ایک مضبوط گرل لگوائی تھی اور اب وہی گرل اس کا راستہ روکے ہوئے تھی----

آندھی کا زور اب ٹوٹ چکا تھا مگر بارش میں کمی نہیں آئی تھی----

کمرے میں پانی کی سطح تیزی سے بلند ہو رہی تھی----

پہلے اس کے گھٹنوں تک پانی آیا۔ پھر اس کی کمر تک اور اب پانی اس کی ٹھوڑی کو چھو رہا تھا---- پانی سرد تھا۔ مگر اس کے جسم سے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ پسینے کے قطرے اس کی پیشانی سے بہہ کر اس کے گالوں پر آتے اور پھر پانی میں شامل ہو جاتے۔ موت اب یقینی تھی---- اس کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر موت کا کوئی سہل طریقہ ہو تو وہ اسے آزما دیکھے----

باہر بہت زور سے بجلی چمکی---- اتنی زور سے بادل گرجے کہ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں---- اور روشن دان کے باہر بارش اچانک رک گئی تھی----

پانی اس کے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اوپر اس کی ناک تک پہنچ گیا تھا۔ اب سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا---- مگر اس نے اپنی ساری توانائی جمع کی اور اچھل کر روشن دان کی آہنی سلاخ کو پکڑ کر لٹک گیا۔ اب ایک مرتبہ پھر وہ پانی کی زد سے نکل گیا تھا۔ مگر اس کا سارا بوجھ اس کے ہاتھوں پر تھا---- اس نے روشندان کے پاس منہ لے جا کر دو چار لمبے لمبے سانس لئے اور عزم کیا کہ اس سلاخ کے سہارے لٹک کر وہ آخر وقت تک اپنی زندگی بچانے کی کوشش کرے گا----

بارش رک گئی تھی۔ دور افق پر صبح کی سفیدی نمایاں ہونے لگی تھی۔ مگر پانی کی سطح ابھی تک بلند ہو رہی تھی---- اب کمرے کے اندر اور روشندان کے باہر پانی کی سطح ایک دوسرے سے مل گئی تھی---- اس نے اپنے ہاتھوں کے سہارے اپنے جسم کو بلند کر کے اپنے چہرے کو پانی کی سطح سے بچایا ہوا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ سر کو زیادہ اوپر بھی نہیں اٹھایا جا سکتا تھا کہ اوپر چھت اس کے سر سے ٹکرا رہی تھی----

اس نے روشن دان کے باہر دیکھا----

صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا----

اس نے دیکھا کہ باہر گھروں کا سامان اور جانوروں کی پھولی ہوئی لاشیں بہی چلی جا رہی ہیں۔ پھر اس کے سامنے سے ایک چھوٹے سے بچے کی لاش تیرتی ہوئی گزر گئی---- خدا جانے کس ماں کی گود سے جدا ہوا ہو گا---- پھر ایک سانپ لہروں پر تیرتا ہوا اس کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا اس نے گھبرا کر سلاخ پر سے ہاتھ ہٹایا مگر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا---- اس نے پھر مضبوطی سے سلاخ کو پکڑ لیا۔ سانپ کے کاٹ لینے سے موت شاید آسان ہو جائے گی۔ سانپ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ۔ اس نے ہاتھ پھیلا کر آنکھیں بند کر لیں---- اس کے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ پانی میں بھیگے رہنے کی وجہ سے انگلیوں کی کھال نرم پڑ گئی تھی اور اب روشن دان کی سلاخ اس کی انگلیوں کو کاٹ رہی تھی ____ انگلیوں سے خون رسنے لگا تھا۔ جس ٹانگ میں کیڑے نے کاٹا تھا اس کی سوزش اب ناقابل برداشت ہو گئی تھی---- اس طرح عذاب جھیل کر مرنے سے تو بہتر ہے کہ یک لخت موت آ جائے---- سانپ کے کاٹے کی موت اتنی اذیت ناک تو نہ ہو گی---- وہ انتظار کرتا رہا---- اور جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سانپ کسی اور طرف نکل چکا تھا----

اب صبح کے اجالے میں ہر چیز صاف نظر آنے لگی تھی---- روشن دان سے جہاں جہاں تک اس کی نگاہیں پہنچتی تھیں پانی ہی پانی دکھائی دیتا تھا---- اس نے چیخنا شروع کر دیا---- وہ لوگوں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پوری بستی انسانوں سے خالی ہو چکی ہے---- ایک مرتبہ پھر اس پر شدید مایوسی اور تھکاوٹ کا غلبہ ہو گیا----

پھر اچانک سامنے نیم کے درخت پر چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا----

پہلے ایک چڑیا نحیف آواز میں بولی---- پھر ایک دوسری چڑیا نے اس کی آواز میں

آواز ملائی اور پھر یک لخت درخت پر بیٹھی ہوئی تمام چڑیاں ہم آواز ہو کر چہچہانے لگیں----

اس نے درخت کی طرف دیکھا---- زندگی کتنی پائیدار ہے!----

وہ زندہ رہنا چاہتا تھا مگر اس کا سر چکرا رہا تھا----

اس کی پیشانی پر سرد پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے----

اس کے بازوؤں کے اعصاب شل ہو چکے تھے اس کا جسم سرد اور تھکا ہوا تھا____

اور اس کی خون آلود انگلیوں کی گرفت آہنی سلاخوں پر ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی----!

ورثہ

عرفان کہا کرتا تھا--- "ایک چھوٹا سا صاف ستھرا گھر ہو' محبت کرنے والی باسلیقہ بیوی' ہنستے کھیلتے صحت مند بچے اور پڑھنے کے لئے ڈھیر ساری کتابیں میسر ہوں تو یہ دنیا جنت بن جاتی ہے۔"

گھر اسے آبائی مل گیا تھا۔ صاف ستھرا تھا اور خاصا بڑا بھی۔ ایک زمانے میں تو اسے گھر کی وسعت سے خوف آتا تھا۔ وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور جب وہ تینوں بیاہ کر اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں تو اس گھر میں وہ اور اس کی ماں رہ گئیں۔ والد کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ ان دنوں اسے اپنا گھر بہت ویران' سنسان اور خالی خالی نظر آنے لگا تھا۔

پھر اس کی شادی ہو گئی--- اس نے اپنی بیوی کو شادی سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر شادی کے بعد وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بیوی کا جو تصور تھا صورت اور سیرت دونوں ہی لحاظ سے اس کی بیوی اس کے تخیل کا مرقع تھی۔

شادی کے ایک سال بعد ہی ان کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تھا--- اور اب ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں--- تینوں لڑکوں اور بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی اور اب ان کے بھی اولادیں تھیں--- گھر میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی ___ وہ گھر جو کبھی اسے خالی خالی اور سنسان دکھائی دیتا تھا اب ان کی ضروریات کے مقابلے میں بہت چھوٹا اور تنگ نظر آنے لگا تھا۔

کتابوں سے اسے والہانہ عشق تھا۔ کوئی اچھی کتاب نظر آ جاتی تو اس کا دل مچل جاتا--- جب تک وہ کتاب اس کی ذاتی لائبریری میں شامل نہ ہو جاتی' اسے یہ احساس ستائے جاتا کہ جیسے اس کی زندگی میں کسی نہایت اہم چیز کی کمی رہ گئی ہو۔

اس کی ذاتی لائبریری گھر کے سب سے بڑے اور سب سے اچھے کمرے میں قائم تھی۔ یہ کمرہ کبھی ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا---.اس میں دوسرے سامان کے ساتھ ایک طرف ایک کونے میں کتابوں کی ایک چھوٹی سی الماری بھی رکھی تھی۔ جب کتابوں

کی تعداد میں اضافہ ہوا تو ایک اور الماری وہاں رکھ دی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ الماری بھی کتابوں سے بھر گئی تو تیسری اور چوتھی اور پھر پانچویں الماری کی ضرورت پڑی۔ رفتہ رفتہ کمرہ کتابوں سے بھرتا چلا گیا۔ اسے اپنی کتابوں پر بہت ناز تھا وہ اپنی مصروف ترین زندگی میں سے بھی چند گھنٹے ضرور ایسے نکال لیتا تھا جب وہ لائبریری میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر مطالعے میں محو ہو جاتا۔ اس وقت اس کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر مہکتی ہوئی گرم گرم چائے کا کپ بھی ضرور موجود ہوتا۔۔۔۔ وہ کہتا۔۔۔۔ "چائے کی چسکیاں کتاب کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہیں۔"

مطالعے کے دوران اگر کوئی ملنے والا آ جاتا اور آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا تو اس کے خیالات کا تانا بانا بکھر جاتا۔۔۔۔ ایسے موقعوں پر اسے بہت کوفت ہوتی۔ اس پریشانی سے نجات پانے کے لئے آخر اس نے اس بڑے کمرے کے برابر والے چھوٹے کمرے میں صوفے، میزیں اور ڈرائنگ روم کا سارا سامان منتقل کرا دیا۔ اب یہ بڑا کمرہ صرف اس کے اور اس کی کتابوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا۔ جب تک خاندان چھوٹا تھا کسی کو یہ تبدیلی گراں نہ گذری، مگر اب تینوں لڑکوں کی شادی ہو جانے کے بعد گھر میں جگہ کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کے تینوں لڑکوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے کتابوں سے کوئی دلچسپی ہو۔ وہ سب کے سب انتہائی کاروباری ذہنیت رکھتے تھے۔ کتابوں کے مقابلے میں، فصل پر سال بھر کے لئے پیاز خرید کر رکھ لینا ان کی نظر میں زیادہ نفع بخش سودا تھا۔ انہیں یہ بات خاصی غیر معقول نظر آتی تھی کہ گھر کا سب سے اچھا اور بڑا کمرہ محض کتابوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔۔۔۔ مگر وہ اپنے والد کا احترام کرتے تھے اور ان سے اس کمرے کے بارے میں بات کرنے کی کسی کو ہمت نہیں ہوتی تھی۔۔۔۔

عرفان کی آمدنی زیادہ نہیں تھی۔۔۔۔ جب تک بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔۔۔۔ اس کا مشکل سے ہی گذارا ہوتا تھا مگر اب سب بچے پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہو گئے تھے۔۔۔۔ سب سے چھوٹی لڑکی کی شادی ہونا ابھی باقی تھی مگر وہ اس کے نام پر پہلے ہی کافی رقم بنک میں جمع کرا چکا تھا۔۔۔۔ اب اس کی آمدنی میں کوئی شریک نہیں تھا۔۔۔۔ وہ اب اپنی آمدنی کا خاصا بڑا حصہ کتابوں پر صرف کر دیتا تھا۔ شہر کے تمام کتب فروشوں سے اس کے تعلقات ہو گئے تھے۔ وہ جب کسی نئی کتاب کی تعریف سنتا یا کہیں کسی کے پاس دیکھ لیتا تو اس کتاب کو شہر بھر کی تمام دوکانوں پر تلاش کرتا پھرتا۔۔۔۔ اگر وہ کتاب اپنے شہر میں نہ

ملتی تو دوسرے شہروں میں تلاش کرواتا---- جب کبھی اسے کوئی نئی اور اچھی کتاب مل جاتی تو اسے اتنی ہی خوشی ہوتی جتنی اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے وقت ہوئی تھی۔ بیشتر کتب فروش اس کے کتابوں سے اس والہانہ عشق سے واقف ہو گئے تھے اور موقع ملنے پر اس سے کتابوں کی دگنی یا تگنی قیمت وصول کر لیتے تھے۔

اللہ بخش پرانی کتابوں کا بیوپاری تھا۔ وہ ایک فٹ پاتھ پر کتابیں پھیلا کر صبح سے شام تک بیٹھا رہتا تھا۔ عرفان ایک روز اتفاق سے اس طرف نکل گیا۔ اس روز وہ اللہ بخش سے دس بارہ کتابیں خرید لایا---- گھر آ کر اس نے حساب لگایا تو اسے پتہ چلا کہ پرانی کتابیں خریدنے میں دہرا فائدہ ہے۔ اول یہ کہ قیمت نصف رہ جاتی ہے اور دوئم یہ کہ بہت سی ایسی کتابیں بھی جو اب بازار میں نایاب ہو چکی ہیں' مل جاتی ہیں---- عرفان اب وہاں ہر دوسرے تیسرے دن جانے لگا۔ اس نے بے شمار نایاب اور قیمتی کتابیں وہاں سے خریدیں---- وہ اپنی کتابوں سے اتنی ہی محبت کرتا تھا اور ان کو اسی طرح حفاظت سے رکھتا تھا جیسے کوئی سیٹھ بلیک سے کمائی ہوئی رقم رکھتا ہے----!

اللہ بخش کو ایک اچھا گاہک مل گیا تھا۔ وہ عرفان کی بہت آؤ بھگت کرنے لگا۔ وہ جب کبھی کہیں سے کتابیں خرید کر لاتا تو عرفان کو ضرور اطلاع بھجواتا---- "صاحب! یزدانی صاحب فلاں کالج میں پروفیسر تھے۔ ان کا پچھلے سال انتقال ہو گیا---- آج اتفاق سے مجھے ان کی کتابیں مل گئی ہیں۔ بڑی نایاب کتابیں ہیں آ کر دیکھ جایئے---- شاید آپ کے مطلب کی کوئی کتاب نکل آئے----" (اور اس روز وہ یقیناً دس دس کتابیں خرید لاتا۔)

اس کی لائبریری میں کتابوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھی تھی کہ وہ ان سے بہت کم کتابوں کا مطالعہ کر سکا تھا۔ بیشتر کتابیں تو اس نے لا کر رکھ دی تھیں اور اب تک انہیں کھول کر دیکھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔ مگر اسے اس بات کی فکر نہیں تھی۔ ملازمت سے سبک دوش ہونے میں صرف تین سال رہ گئے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اسے ملازمت میں توسیع ملی بھی تو وہ قبول نہیں کرے گا۔ ریٹائر ہو جانے کے بعد وہ اپنا سارا وقت پڑھنے لکھنے میں صرف کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی موضوعات تھے جن پر وہ کتابیں لکھنا چاہتا تھا مگر ابھی ان موضوعات پر اس کا مطالعہ کافی نہیں تھا---- اس نے سوچا تھا کہ ملازمت کی چخ چخ سے نجات مل جائے گی تو یک سوئی سے مطالعہ کرے گا اور لکھے گا----

ایک روز وہ اپنی لائبریری میں رات گئے تک مطالعہ کرتا رہا---- کتاب بند کر کے وہ

اٹھا تو اسے احساس ہوا کہ اسے ہلکا ہلکا بخار ہے۔ صبح تک بخار اور بھی تیز ہو گیا مگر اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ سوچا' تھکن سے ہو گیا ہو گا۔۔۔۔ مگر بخار دوسرے دن بھی نہ اترا اور پھر تیسرے دن بخار میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔۔۔۔ علاج شروع ہوا مگر وہ چند روز بیمار رہ کر مر گیا۔

اس کا یوں اچانک مر جانا گھر بھر کے لئے ایک سانحے سے کم نہ تھا۔۔۔۔ ابھی تو اس کی ماں زندہ بیٹھی تھی۔۔۔۔ گھر والوں کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔۔۔۔ مگر اب اس کے اور گھر والوں کے درمیان ایک ایسی دیوار حائل ہو گئی تھی جسے ان کے آنسو بھی گرا نہیں سکتے تھے۔۔۔۔ دن گزرتے چلے گئے۔

پھر گھر میں اس کی سب سے چھوٹی لڑکی کی شادی کا کام پھیلنا شروع ہوا ____ گھر کی صفائی شروع ہوئی تو اس کے بیٹوں کو خیال آیا کہ گھر کا سب سے اچھا اور سب سے بڑا کمرہ تو ابھی تک مقفل پڑا ہوا ہے۔۔۔۔ انہوں نے تالا توڑا تو دیکھا کہ کمرہ کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ الماریوں' میزوں' کرسیوں اور حد یہ ہے کہ فرش پر ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔۔۔۔

"اف بابا نے اس کباڑ پر کتنا روپیہ صرف کیا ہے۔" ایک لڑکے نے کہا۔

"خیر۔۔۔۔ اب کسی کباڑیئے کو دیکھو اور کمرہ خالی کراؤ۔" دوسرا بولا۔۔۔۔

تیسرا پرانی کتابوں کے بیوپاری اللہ بخش کو پکڑ لایا۔۔۔۔ اللہ بخش نے تمام کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہنے لگا۔۔۔۔ "اب ان کتابوں کا گاہک کون ہے بابو صاحب' مگر خیر میں یہ سب کی سب اسی روپے من کے حساب سے خرید لوں گا۔۔۔۔ کہئے منظور ہے۔۔۔۔"

"منظور ہے۔۔۔۔" تینوں بیٹوں نے بیک آواز کہا۔

اور دوسرے روز وہ ساری کتابیں کسی نئے خریدار کے انتظار میں پھر فٹ پاتھ پر آ گئیں۔۔۔۔!

روشنی

وہ جب اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر ترا تو شب نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اس نے سوچا اس وقت گھر جا کر بیوی اور بچے کو پریشان کرنا مناسب نہ ہو گا۔

وہ ایک چھوٹے سے شہر کا چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ اس اسٹیشن پر اس کے ساتھ گاڑی کے چند مسافر اور اترے تھے جنہوں نے اپنا سامان اٹھا کر کسی سواری کا انتظار کئے بغیر اپنے گھروں کی طرف چلنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے پاس کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ وہ جس طرح خالی ہاتھ گھر سے نکلا تھا ویسے ہی خالی ہاتھ واپس آیا تھا۔ اسے بھی دوسرے مسافروں کی طرح پیدل ہی اپنے گھر جانا تھا۔ مگر اس کا گھر شہر کے دوسرے سرے پر تھا اور وہ ایک طویل عرصے کے بعد اپنے گھر واپس آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے کا گھر راستہ بھول گیا ہو۔ پھر وہ اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسنے لگا۔ بھلا کوئی اپنے گھر کا راستہ بھی بھولتا ہے۔ اور اگر واقعی وہ اپنے گھر کا راستہ بھول گیا ہوتا تو آج واپس کیوں آتا؟

اس نے پلیٹ فارم پر ایک خالی بنچ تلاش کی اور اس پر لیٹ گیا۔ رات تاریک تھی اور پلیٹ فارم کے جس گوشے میں وہ بنچ تھی وہاں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ آسمان صاف اور تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بنچ پر چت لیٹ کر جھلمل کرتے ہوئے تاروں کو دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نجانے ان تاروں میں کتنی دنیائیں آباد ہوں گی۔ آخر اتنے بہت سے ستارے۔ اتنے بہت سے سیارے بنانے والے نے یونہی بے مصرف تو نہیں بنا دیئے ہوں گے۔ اس دنیا کے علاوہ اور بھی دنیائیں ہوں گی مگر ان میں کون سی مخلوق آباد ہو گی؟ کیا کبھی ان سے ہماری ملاقات ہو سکے گی؟ پھر وہ خود ہی اپنے ان خیالات پر دھیرے دھیرے مسکرانے لگا۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی بیوی اور بچے کا چہرہ ابھر آیا۔ مگر یہ تصویر آٹھ سال پرانی ہو چکی تھی۔ اس وقت اس کے بچے کی عمر ایک سال تھی۔ ابھی اس نے تکیئے کے سہارے

بیٹھنا شروع کیا تھا۔ اسے کھڑا ہونا نہیں آتا تھا۔ مگر اب تو اس کی عمر نو سال ہو چکی ہو گی۔ اب تو اس نے اچھا خاصا قد کاٹھ نکال لیا ہو گا۔ اسکول بھی جانے لگا ہو گا اور یقیناً شریر بھی ہو گیا ہو گا۔ بچپن میں ہی اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ لڑکپن کی منزل تک آتے آتے بہت شریر اور چلبلا ہو جائے گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ خدا جانے اب اس کا بیٹا کیسا ہو گا؟ اس کی شکل و صورت کیسی ہو گی؟ قد کتنا ہو گا؟ جسم کیسا ہو گا؟ اس نے ذہن پر بہت زور دیا مگر اپنے بیٹے کی کوئی شبیہہ نہ بنا سکا۔ اس نے گزرے ہوئے آٹھ سالوں کے دوران اپنے بچے اور بیوی کے خیال کو اپنے ذہن سے بہت دور رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب اسے اپنے بچے اور بیوی کی کوئی تصویر بنانا ناممکن نظر آتا تھا۔

ان آٹھ سالوں کے دوران اس کی بیوی بھی یقیناً بدل گئی ہو گی۔ آٹھ سال پہلے جب وہ اپنے گھر سے چلا تھا تو اس کی بیوی جوان، صحت مند اور خوبصورت تھی۔ شادی سے پہلے بھی وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ شادی کے بعد ماں بن جانے پر تو اس کا حسن اور نکھر آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کی جلد کے نیچے پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہو۔ مگر اب وہ کیسی ہو گی؟ اب بچے کے عروج کے دن آ رہے تھے اور اس کے اور اس کی بیوی کے زوال کے دن۔ عروج و زوال---- زوال و عروج۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ سلسلہ یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ کیوں ہے؟۔ آخر یہ سب کس لئے ہے؟---- ایک بچہ جب اس دنیا میں آتا ہے کتنا نحیف و ناتواں ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ اس کے جسم میں توانائیوں کا ذخیرہ جمع ہونے لگتا ہے۔ پھر وہ زمانہ آتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے پہاڑ بھی اس کی ٹھوکر سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں اور تندرست اور توانا جسم آخر زوال کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ توانائی کا سارا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے اور انسان جہاں سے اپنا سفر شروع کرتا ہے وہیں پہنچ جاتا ہے۔ وہی ناتوانی، وہی بے چارگی، اور پھر ایک دن وہ ناتوانی اور بے چارگی بھی نہیں رہتی۔ آخر یہ کیا تماشہ ہے؟

(اس نے جب اپنا سفر شروع کیا تھا تو یہ تماشہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ ہر بات اس کے ذہن میں ہلچل پیدا کر دیتی تھی۔ وہ کرب کی بھٹی میں تپا رہتا تھا۔ ہر سوال لاینحل دکھائی دیتا تھا۔ اب وہ بات باقی نہیں رہی تھی۔ اس کی کھوج کام آ گئی تھی۔ اس کی ریاضت نے اسے کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو کم از کم اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس کے من کو اطمینان نصیب ہو گیا تھا۔

مگر اس پل اس بنچ پر لیٹے لیٹے اسے محسوس ہوا ایک عرصے کے بعد آج پھر اس کی روح کے سمندر میں ایک طوفان آیا ہوا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔ سونے کی کوشش کرنا حماقت تھی۔ اس جوار بھاٹا کی کیفیت کی موجودگی میں نیند ایک ایسی ہی انہونی بات تھی جیسے ببول کے درخت پر آم لگ جانا۔

وہ اپنے بچے اور بیوی سے اتنا قریب تھا۔ سفر کے بعد اپنے شہر کے پلیٹ فارم پر آ چکا تھا۔ اب مزید انتظار اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ تو ایسے ہی تھا جیسے پیاسا دریا کے کنارے پہنچ کر بھی پانی نہ پیے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جائے۔ گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے اور جب اس کی بیوی دروازہ کھولے تو اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے کہے۔ "مجھے پہچانتی ہو۔ میں کون ہو؟" اور اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک سوال ایک ہولناک اندیشے کا روپ دھار گیا۔ اگر سچ مچ کہیں ایسا ہوا کہ اس کی بیوی اسے نہ پہچان سکی تو کیا ہو گا؟ اسے احساس تھا کہ اس عرصے میں محض اس کی وضع قطع ہی تبدیل نہیں ہو گئی ہے بلکہ گزرتے ہوئے وقت نے اور اس کی صبر آزما اور کڑی تپسیا نے اس پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔

اب وہاں بیٹھے رہنا اس کے امکان میں نہیں تھا۔

وہ بینچ پر سے اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اس نے محسوس کیا کہ شہر میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وہی نیم تاریک گلی کوچے وہی جگہ جگہ بکھری ہوئی گندگی۔ وہی را بگیروں کی طرف لپکتے ہوئے کتے۔ ہر قدم پر اسے احساس ہوا کہ کوئی نئی بات سامنے آ جائے گی۔ مگر ہر موڑ پر اس کا اشتیاق دم توڑ دیتا۔ شہر آج بھی وہی تھا۔ جو وہ آٹھ سال پہلے چھوڑ گیا تھا۔ آٹھ سال میں پالنوں میں پڑے ہوئے بچے گلی میں آ کر اچھل کود کرنے لگے ہوں گے۔ گلی میں کھیلنے والے لڑکے بالے اب جوان ہو کر زندگی کی تگ و دو میں شریک ہو چکے ہوں گے۔ انسانی زندگی کس قدر تیزی کے ساتھ تغیر کی زد میں آ جاتی ہے۔ مگر ایک یہ شہر ہیں کہ ہر تغیر کو سنگ دلی کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ انسانی زندگی کے جوار بھاٹا کو اپنی سنگلاخ فیصلوں سے سر ٹکراتے ہوئے دیکھتے ہیں مگر اپنی پیشانی پر کوئی بل نہیں پڑنے دیتے۔

وہ اپنی گلی---- میں داخل ہوا تو ایک کتا اچھل کر اس کی طرف لپکا اس نے ایک پتھر اٹھا کر اسے دھمکایا حد ہو گئی ہے---- اب تو وہ اپنی گلی میں بھی اجنبی ہو گیا ہے۔

اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلی مرتبہ---- ذرا سے وقفے کے بعد دوسری مرتبہ---- اور پھر قدرے بے صبری کے ساتھ زور زور سے تیسری مرتبہ ____ نیند میں ڈوبی ہوئی ایک مردانہ آواز نے ناگواری سے پوچھا۔ کون ہے؟"

یہ مردانہ آواز کس کی ہو سکتی ہے؟ اس کے جسم میں پہلے تو ایک شعلہ سا لپکا۔ اور پھر کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دروازے کے پیچھے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک نامانوس چہرہ اس کے روبرو تھا۔ "فرمائیے؟"

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس غیر متوقع صورت میں وہ کیا بات کرے؟ اس نے اپنی بیوی کا نام لے کر پوچھا "کیا یشودھرا یہیں رہتی ہیں؟"

"یشودھرا؟" اس شخص نے جواب دیا۔ "اس نام کی کوئی خاتون یہاں نہیں رہتیں۔"

"یشودھرا جو سدارتھ کی بیوی تھیں۔ اوہ میرا مطلب ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے وہ یہیں رہتی ہیں۔ ایک عرصے سے یہاں رہتی ہیں یہ انہیں کا گھر ہے۔"

وہ شخص بولا۔ "آپ شاید ان خاتون کے بارے میں پوچھ رہے ہیں جو پہلے اس گھر میں رہا کرتی تھیں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ یاد آیا۔ ان کا نام یشودھرا ہی ہے مگر اب وہ یہاں نہیں رہتیں۔"

"کیا وہ یہ مکان چھوڑ گئی ہیں؟"

"جی ہاں! بہت عرصہ ہوا۔ وہ جب کئی ماہ تک کرایہ ادا نہ کر سکیں تو مالک مکان نے انہیں اس گھر سے نکال دیا تھا۔"

اب کیا ہو گا؟ اس نے سوچا۔ اب اپنی بیوی کو کہاں تلاش کرے گا؟ کیا آپ بتا سکیں گے کہ وہ یہ مکان چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہیں؟ اس نے دریافت کیا۔

"مجھے صحیح علم نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ کبھی کبھی اس محلے میں اپنے پرانے ملنے والوں سے ملاقات کے لئے آ جاتی ہیں۔ اور غالباً انہوں نے بتایا تھا کہ وہ آجکل نہر کے اس پار کچی آبادی میں رہتی ہیں۔"

یشودھرا کو ڈھونڈنے کے لئے یہ اطلاع کافی نہیں تھی۔ مگر ان حالات میں وہ اپنے پرانے پڑوسیوں کو جگانا نہیں چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اب وہ اپنی بیوی سے ملنے سے پہلے کسی اور سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس ادھورے پتے کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا ہوا نہر کی طرف چل دیا۔

نہر مشرقی سمت میں اس شہر کی آخری حدود کو چھوتی ہوئی بہتی تھی۔ جہاں تک اسے یاد تھا نہر کے اس پار آبادی نہیں تھی۔ مگر آج جب وہ نہر کے پل پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کچے مکانات اور جھونپڑیوں کا ایک جنگل آباد ہو گیا۔

وہ نہر کے پل پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس بستی میں وہ اپنی بیوی کو کس طرح تلاش کرے گا۔ پل کے نیچے پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ افق پر سیدی کی لکیر نمودار ہونے لگی تھی۔ اور پل کے نیچے شہر کا پانی چمکنے لگا تھا۔ اس نے بہتے ہوئے پانی پر نظریں جما دیں۔ وقت کس طرح بہتے ہوئے پانی کی طرح گزر گیا تھا۔

آٹھ سال پہلے ایک ایسی ہی تاریک رات تھی وہ اپنی بیوی اور بچے کو سوتا ہوا چھوڑ کر گھر سے نکل گیا اس نے اپنے تکئے کے نیچے اپنی بیوی کے لئے ایک مختصر پیغام چھوڑا تھا۔

"گھبرانا مت' میں جلد واپس آ جاؤں گا۔"

مگر جلد واپس آنے کی اسے امید نہیں تھی۔ یہ الفاظ تو اس نے اپنی بیوی کو تسلی دینے کے لئے لکھ دیئے تھے۔ اسے احساس تھا کہ وہ جس سفر پر روانہ ہو رہا ہے اس میں واپسی کے وقت کا تعین ممکن نہیں ہے' بلکہ اسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس روز گھر سے نکلنے کے بعد کبھی گھر واپس بھی آ سکے گا یا نہیں!

ان دنوں اس کی آمدنی زیادہ نہیں تھی مگر زندگی اچھی خاصی اور پر مسرت تھی۔ گھر میں خوبصورت سلیقہ شعار اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔ پھر ان کے گھر میں ایک ننھا سا ہنستا کھیلتا بچہ بھی آ گیا تھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد تو گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا تھا---- لیکن کچھ عرصے بعد نجانے کیوں اس کے دل میں انجانے سوالوں کے سنپولئے سر اٹھانے لگے تھے---- زندگی کیا ہے؟---- موت کیوں آتی ہے؟---- مسکراتے شگفتہ چہرے وقت کی باد سموم سے مرجھا کیوں جاتے ہیں؟ چٹان کی طرح مضبوط جسموں کو بیماریوں کی دیمک اندر ہی اندر چاٹ کر کھوکھلا کیوں کر دیتی ہے؟---- موت اگر انسان کی منزل ہے تو اسے زندگی کی دولت کیوں ملتی ہے؟---- اور سب سے اہم یہ سوال کہ یہ زندگی جو انسان کو صرف ایک بار عطا ہوتی ہے کیسے گزاری جائے کہ جب موت کے سرد اور بوجھل قدموں کی چاپ کانوں میں گونجنے لگے تو وقت کے بے مصرف اور بے ثمر گزر جانے کا احساس بوجھ نہ بن جائے؟----

وہ ان سوالوں پر غور و فکر کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا مگر گھر سے باہر کی مصروفیتیں

اور گھر کے اندر کی مسرتیں اس کی راہ میں دیوار بنی ہوئی تھیں وہ سوچنا چاہتا تھا مگر ہر بار کسی نہ کسی کام سے اس کے دھیان کا تانا بانا بکھر جاتا تھا---- رفتہ رفتہ اسے یقین ہو گیا کہ اگر وہ اسی طرح دنیا کے جھمیلوں میں الجھا رہا تو کبھی بھی نروان کی درخشاں منزل تک نہیں پہنچ سکے گا ____ اس کے لئے تو یکسوئی کے ساتھ غور و فکر اور بے لاگ تپسیا کی ضرورت تھی!

اسے فیصلہ کرنے میں دیر لگی مگر جب اس نے فیصلہ کر لیا تو عمل میں تاخیر نہیں کی۔ اس رات وہ اپنی بیوی اور بچے کو سوتا چھوڑ کر نکل گیا اور اپنے شہر سے بہت دور ایک اجنبی سرزمین پر انسانوں سے دور جنگل کی تنہائیوں میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

وہاں بیٹھے بیٹھے کتنا وقت گزر گیا۔ اسے اس کا اندازہ نہیں تھا لیکن ایک روز اسے یکایک احساس ہوا کہ اس کے دل میں ایک قندیل روشن ہو گئی ہے۔ اس کے ذہن میں جتنے سوالات تھے سب کے ہی جواب مل گئے ہیں۔ وہ برگد کے درخت کی چھاؤں سے نکل آیا اور بستی بستی گھومنے لگا۔ اس پر ایک عجیب سرشاری کا عالم طاری تھا وہ چاہتا تھا کہ اپنے دل کے نرد سے ساری دنیا کو جگمگا دے اس جہاں گردی کے دوران ایک روز اس نے ایک عورت کو دیکھا جس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ کھیل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے یاد آیا کہ اس دنیا میں کہیں اس کا بھی ایک گھر ہے جہاں اس کی بیوی اور اس کا بچہ اس کا آج بھی منتظر ہو گا۔

وہ پل سے اتر کر آبادی میں آ گیا----

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا مگر ہر سو اجالا پھیل چکا تھا۔ ایک تنگ اور غلیظ گلی سے گزرتے ہوئے ایک شخص اچانک اس کے روبرو آ گیا---- اس نے اسے روک کر پوچھا---- "بھائی! میں ایک عورت کا پتہ معلوم کرنا چاہتا ہوں ____ اس کا نام یشودھرا ہے اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ بچے کا نام راہول ہے۔ کیا تم اسے جانتے ہو----؟"

یشودھرا۔ "اس عورت کو اس بستی میں کون نہیں جانتا۔ بہت نیک اور ہمدرد خاتون ہیں۔ بہت دن ہوئے ان کے شوہر انہیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ اور وہ اسی رو سے ان کے انتظار میں زندگی کا پہاڑ کاٹ رہی ہیں۔ ہمت والی عورت ہیں----" پھر اس کے آدمی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مگر آپ کون ہیں؟"

وہ اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں ان سے ملنا چاہتا

ہوں۔"

اس شخص نے اسے کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور بولا "آیئے! میں آپ کو وہاں تک پہنچا دیتا ہوں۔"

کچھ دور جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک عورت پانی کی دو بھری ہوئی بالٹیاں اپنے ہاتھوں میں اٹھائے سامنے سے چلی آ رہی ہے۔ اسے گمان گزرا کہ شاید وہ عورت یشودھرا ہے۔ اسی لمحے اس شخص نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: "لو یشودھرا تو وہ سامنے سے چلی آ رہی ہیں۔"

اس کے بعد قدم زمین میں گڑ گئے۔

"ابھی اس بستی میں پانی نہیں آیا۔" وہ آدمی کہہ رہا تھا "پانی نہر سے لانا پڑتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم پانی لا کر دیں گے۔ مگر وہ کسی کا احسان قبول کرنا نہیں چاہتیں۔ دن بھر محنت مزدوری کرتی ہیں۔ مگر اس بستی میں مزدوری بھی کم ہے۔ مزدوری مل جاتی ہے تو ان کے یہاں چولہا جل جاتا ہے۔ ورنہ بھوکے پیٹ ہی سو جاتی ہیں---- بڑی ہمت والی عورت ہیں۔"

اب یشودھرا قریب آ گئی تھی۔

اس نے دیکھا کہ یشودھرا کے نرم ملائم ریشمی بال الجھ کر مکڑی کا جالا بن گئے تھے---- اس کے رخساروں کی جلد مٹیالی اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ چہرے کی ہڈیاں نمایاں تھیں---- جسم لاغر' اور بے رونق ہو چکا تھا۔ ان آٹھ سال کی لمبی مدت نے یشودھرا کو بالکل ہی تباہ کر دیا تھا۔

وہ سر جھکائے بوجھ اٹھائے ایک جھونپڑی کے دروازے میں داخل ہونے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اسے پکارا۔ "یشودھرا۔"

یشودھرا ٹھٹک گئی---- اس نے پانی کی بھری ہوئی بالٹیاں زمین پر رکھ دیں۔ نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ اور پھر اسے پہچانتے ہوئے بولی۔ "سدارتھ!"

اس نے پانی کی بالٹیاں اٹھائیں اور جھونپڑی کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "اندر آ جاؤ!"

وہ اس کے پیچھے پیچھے جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ جھونپڑی چھوٹی سی تھی۔ گھاس

پھوس کی چھت والا ایک کمرہ اور اس کے آگے ایک چھوٹی سی کھلی ہوئی جگہ جو صحن باورچی خانہ غسل خانہ سب ہی کچھ تھی۔

یشودھرا نے پانی کی بالٹیاں ایک طرف رکھ دیں۔ اور اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں ایک دوسروں کے چہروں پر لکھی ہوئی گزرے ہوئے وقت کی تحریر پڑھ رہے تھے۔

"تم نے یہ کیا حالت بنائی ہے یشودھرا۔۔۔۔؟" آخر اس نے پوچھا۔

یشودھرا نے اچٹتی سی نگاہ سے بھی اپنا جائزہ نہیں لیا۔ وہ بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے پاس پڑی ہوئی چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

"بیٹھو! میں تمہارے لئے ناشتہ تیار کرتی ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر یشودھرا کا بازو پکڑ لیا۔ "ناشتہ بھی تیار ہو جائے گا ____ مگر تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی یہ کیا حالت بنائی ہے۔۔۔۔؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کہاں چلے گئے تھے؟"

مجھے نروان کی تلاش تھی؟ سکون کی تلاش تھی؟

"مل گیا۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔"

"مجھے خوشی ہے۔" یشودھرا نے کہا۔ "اب آرام کرو گے۔ معلوم ہوتا ہے تم لمبے سفر سے آ رہے ہو۔ تھک گئے ہو گے۔"

"امی کون آیا ہے؟" کمرے میں سے ایک بچے کی نحیف آواز آئی۔

"تمہارے ابو ہیں بیٹا۔" یشودھرا نے کہا۔ اس نے کمرے کی طرف دیکھا۔ "تمہارا بیٹا ہے راہول۔" یشودھرا نے کہا۔ "اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے کمرے میں جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک ہڈیوں کا پنجر کمرے کے دروازے کی چوکھٹ کے فریم میں نمودار ہوا۔ وہ بچہ حیرت زدہ آنکھوں سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔

"راہول بیٹا سلام کرو۔ یہ تمہارے ابو ہیں۔" یشودھرا نے کہا۔

اس نے آگے بڑھ کر ہڈیوں کے پنجر کو اپنی گود میں سمیٹا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا جسم بخار سے تپ رہا ہے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس نے نگاہیں چراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "کئی ماہ سے بیمار ہے۔"

"اور تم نے علاج بھی نہیں کرایا؟" اس نے شکایتاً" طنز سے کہا۔

"علاج!" یشودھرا نے بے دھیانی میں دہرایا۔ پھر اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی عمر کے رائیگاں گذرے ہوئے آٹھ سالوں کا اپنے شوہر سے حساب لے یا نہیں۔ اس کے ذہن میں ایک کشمکش جاری تھی اور وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

"تم نے راہول کا علاج بھی نہیں کرایا؟" اس کے شوہر نے پھر اس سے سوال کیا۔

"تم کئی سوال کر چکے ہو!" یشودھرا نے کہا۔ "اگر اجازت دو تو ایک سوال میں بھی پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھو۔" اس نے کہا۔

یشودھرا بولی۔

"جب تم نروان اور سکون کی تلاش میں گھر سے نکلے تھے کیا میرے لئے کسی مہاراجہ کی ریاست چھوڑ گئے تھے؟"

سدارتھ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہیں پاس ہی بجلی گری ہو۔ پہلے تو ہر سو اجالا پھیل گیا۔ پھر بہت دیر تک گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دیتی رہی جیسے کوئی بلند و بالا عمارت منزل بہ منزل گر رہی ہو۔

اب جو اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو اس کی صورت بدلی ہوئی نظر آئی۔ یشودھرا کی آنکھوں میں جھلمل کرتے چراغ روشن تھے۔ ایسے چراغ جن میں زندگی پر تاریکی سے نبرد آزما ہونے کا عزم جھلملا رہا تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ وہ روشنی جو اس نے برگد کے سائے میں دیکھی تھی انہی چراغوں سے مستعار تھی۔

شہر آرزو

توصیف نے ایک مرتبہ پھر گھڑی دیکھی۔ ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

"آرٹسٹ صاحب وقت کا خاص خیال رہے۔" بیگم ریاض نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں تاکید کی تھی۔ "آپ کو چھوڑنے کے بعد گاڑی کئی اور مہمانوں کو بھی لینے کے لئے جائے گی۔ بہتر ہے کہ آپ ساڑھے چھ بجے سے پہلے ہی تیار ہو جائیں۔" اور اب وہ سوا چھ بجے سے تیار بیٹھا تھا مگر کار کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

اس نے ایک سگریٹ جلائی اور کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا فلیٹ شہر کی ایک مصروف سڑک پر واقع تھا جہاں ہر وقت ٹریفک کا سیلاب بہتا رہتا تھا۔ اسے تنہائی اور ویرانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ حرکت اور توانائی کا پرستار تھا اور اس مصروف سڑک پر رہتے ہوئے اپنے آپ کو زندگی کے رواں دواں قافلے کا حصہ تصور کرتا تھا۔

شہر پر آہستہ آہستہ رات اترتی چلی آ رہی تھی۔ جہاں ابھی کچھ دیر پہلے سورج افق کے زینے سے اندھیرے کی آغوش میں اتر گیا تھا شفق کی لالی آسمان کے دامن کو گلنار بنائے دے رہی تھی اور اس شفق کی لالی میں ایک اکیلا تارا اس طرح جھلملا رہا تھا جیسے تپتی ہوئی راکھ میں چنگاری۔

سڑک پر روشنیاں ہونے لگیں تھیں۔ وہ کھڑکی میں کھڑا لوگوں کے روکھے، پژمردہ اور بے رونق چہروں کو دیکھتا رہا جو دن بھر کی پرمشقت مصروفیات کے بعد اب گھر پہنچنے کی جلدی میں یوں تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ جیسے اگر اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تو انہیں اپنے گھروں کا راستہ نہیں ملے گا۔

اسے اگر بیگم ریاض کے یہاں جانا نہ ہوتا تو شاید آج وہ رات گئے تک کوئی تصویر بناتا۔ آج اس کے دن میں ایک اداس سی گدگدی ہو رہی تھی جو اس سے تصویر بنانے کا تقاضا کر رہی تھی۔ مگر اس کی یہ شام ضائع ہوئی چلی جا رہی تھی۔

اس کی نگاہیں ایک چہرے سے پھسلتیں تو دوسرے چہرے پر اور ایک دن سے ٹکرا کر

گدا کھائیں تو دوسرے بدن پر آ کر ٹکتیں---- مگر پھر اس کی مضطرب نظریں ایک جگہ آ کر جم سی گئیں- وہ لڑکی کسی جلدی میں معلوم نہیں ہوتی تھی- وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' داہنے ہاتھ کے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی- اس کی چال میں دلکشی' رعنائی اور بلا کی تمکنت تھی جیسے اسے اپنی اہمیت کا احساس ہو- جیسے اس نے سوچ رکھا ہو کہ دنیا کے نظام کو درہم برہم کر کے ہی دم لے گی---- کتنے ہی راہ گیر دور تک مڑ مڑ اسے دیکھتے رہے- کیسا خوبصورت' متناسب اور زندگی سے بھرپور جسم تھا---- "کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ میری ایک ہی تصویر کے لئے بیٹھنا گوارہ کر لیتی"____ اس نے سوچا-

لڑکی کا چہرہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا- وہ اس کی مخالف سمت میں جا رہی تھی- اس کے لانبے لانبے بالوں کی چوٹی کے آخری سرے پر رنگین ربن کا ایک پھول بنا ہوا تھا جو اس کے بھرے بھرے کولہوں پر دائیں بائیں گھڑی کے پنڈولم کی طرح جھول رہا تھا- اس نے اپنے سرخی مائل سنہری بالوں میں زرد گلاب کا ایک پھول سجا رکھا تھا---- پھول جیسے شب کی ست رو رودبار میں چاند کا بجرا-

لڑکی فٹ پاتھ پر چلتے چلتے یک لخت ایک گلی میں مڑ گئی- طلسم ٹوٹ گیا- وہ کھڑکی سے ہٹ آیا- اب سات بج رہے تھے- کار ابھی تک نہیں آئی تھی- انتظار کھلنے لگا تو اس نے سوچا کوئی تصویر ہی شروع کر دی جائے- مگر کونسی؟ اس لڑکی کی جو ابھی ابھی سڑک پر سے گذر کر گلی میں مڑ گئی تھی- "مگر میں نے اس کی صورت کب دیکھی ہے!" اس نے سوچا- "خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے" اتنا خوبصورت اور متناسب جسم تھا تو صورت بھی یقیناً اچھی ہی ہو گی!---- پھر اس کے ذہن کے کینوس پر ایک چہرہ ابھر آیا- وہ چہرہ کہ اگر اس لڑکی کا خالق وہ خود ہوتا تو اس جسم کو یہی چہرہ عطا کرتا-

"چلو ایک تجربہ ہی سہی-" اس نے سوچا اور یونہی لاپرواہی سے تصویر بنانے لگا- رنگ رنگوں میں مل کر نئے رنگوں سایوں اور اجالوں کو تخلیق کرتے رہے- اس کی مشغولیت بڑھتی گئی- جب بیگم ریاض کی کار اسے لینے کے لئے آئی تو وہ اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ سڑک پر کھڑی ہوئی کار کے ہارن کا اسے خیال ہی نہیں آیا- اس کے ملازم نے آ کر اسے بتایا تو وہ جیسے خواب کی دنیا سے باہر آیا- اس نے جلدی جلدی میں ایک نگاہ کینوس پر بنی ہوئی تصویر پر ڈالی- ایک لڑکی جس کے بالوں میں زرد گلاب کا پھول سجا ہوا تھا اپنی کنول ایسی روشن آنکھوں سے اسے تک رہی تھی-

"اچھا خدا حافظ---- پھر ملیں گے-" اس نے خوش دلی سے ہاتھ ہلا کر تصویر سے رخصت چاہی اور کمرے سے باہر نکل گیا-

توصیف خاموش طبع مگر انتھک اور کبھی مضمحل نہ ہونے والا مصور تھا- اس کی تصویریں حرکت' ارتقاء اور وسعت و پھیلاؤ کا پتہ دیتی تھیں- اسے اپنے فن سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا- اس کا اسلوب جامد نہیں سیماب صفت تھا- وہ چپ چاپ کام کرنا پسند کرتا تھا مگر کچھ دنوں سے اخبارات اور رسائل میں اس کا بہت چرچا ہوتا رہا تھا- اس پر اور اس کے فن پر کتنے ہی مضامین لکھے جا چکے تھے- فن کے ایک پرستار نے اس کی تصویروں کی ایک بڑی نمائش بھی کرا دی تھی- اب وہ ایک گمنام فنکار نہیں رہا تھا- اسے اب مختلف محفلوں میں خاص طور پر مدعو کیا جانے لگا تھا اور ایسی محفلوں میں بیگم ریاض کی محفلیں اور دعوتیں خاص طور پر مشہور تھیں جہاں پر شہر بھر کے ادیب' شاعر اور مصور شرکت کیا کرتے تھے-

توصیف بیگم ریاض کے یہاں پہنچا تو اسے باہر لان میں ہی ایک لڑکی نظر آئی جسے دیکھ کر اسے خیال آیا کہ وہ اس لڑکی کو جانتا ہے- اس نے دور ہی سے ہاتھ ہلا کر سلام کیا مگر اس کی بے تکلفی پر لڑکی حیران ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی- اس کی آنکھوں میں سوچ کے گہرے سائے لہرانے لگے جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو- پھر اس نے بھی ذرا ہچکچاتے ہوئے ہاتھ ہلا کر سلام کا جواب دیا ____ پارٹی شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی- وہ باہر لان میں ہی اس لڑکی کے پاس ٹھہر گیا-

"آپ شاید مجھے پہچان نہیں سکیں!" وہ بولا-

"جی---- جی میرا خیال ہے-" لڑکی نے اٹک اٹک کر کہا- "میری پہلے کبھی آپ سے ملاقات نہیں ہوئی-"

"مگر میں تو آپ کو جانتا ہوں---- توصیف نے کہا---- مجھے یقین ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں-"

"ہو سکتا ہے----" لڑکی بولی---- "مگر میں تو ابھی کل ہی یہاں آئی ہوں اور جو لوگ یہاں مدعو ہیں میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی-"

"کیا آپ لاہور سے آئی ہیں؟"

"آپ کبھی لاہور تو گئی ہوں گی؟"

"کبھی نہیں---- عجیب بات ہے مگر یہ سمجھئے کہ کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا----"

"اوہو تو آرٹسٹ صاحب تشریف لے آئے ہیں----" بیگم ریاض نے ان کی طرف آتے ہوئے دور ہی سے کہا۔ وہ اسے ہمیشہ آرٹسٹ صاحب ہی کہہ کر پکارا کرتی تھیں ____

"آداب عرض"____ توصیف نے ہڑبڑا کر سلام کیا۔

آداب---- مگر شہلا سے تمہارا کس نے تعارف کرا دیا---- انہوں نے پوچھا۔

"تعارف تو کسی نے نہیں کرایا اور میرا خیال ہے کہ تعارف کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں!"

"شہلا بیٹی تم انہیں جانتی ہو----"

"نہیں آنٹی---- مگر یہ کہتے ہیں کہ یہ مجھے اچھی طرح پہچانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ مجھ سے پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔ مگر مجھے بالکل یاد نہیں ہے ____ بھلا کہاں ملے ہوں گے۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میں زندگی میں پہلی بار پنڈی سے باہر نکلی ہوں۔"

"اور میں کبھی پنڈی گیا نہیں!"

"تو پھر آرٹسٹ صاحب آپ کو دھوکا ہوا ہے۔" بیگم ریاض نے ہنستے ہوئے کہا----

"نہیں بیگم صاحبہ---- مجھے یقین ہے کہ....."

"نہیں نہیں بالکل غلط---- آپ کو سراسر غلط فہمی ہوئی ہے آرٹسٹ صاحب۔ آپ کسی اور لڑکی سے ملے ہوں گے۔"

"مگر میرا خیال ہے کہ....."

"خیر چھوڑیئے اس بحث کو کھانا لگ گیا ہو گا۔ کھانے کے بعد فرصت سے آپ اپنے خیال کا اظہار کرتے رہئے۔ ویسے یہ میری بھتیجی ہے۔ شہلا---- شہلا رحمٰن۔ اور شہلا یہ توصیف صاحب ہیں۔ بڑے اچھے مصور بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ملک کے نامی گرامی مصور۔ ان کی باتوں کا خیال مت کرنا بیٹی تمام بڑے فنکار کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

"کیوں شرمندہ کرتی ہیں----" توصیف نے جھینپتے ہوئے کہا----

کھانے کے دوران بھی وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے شہلا کو اس سے پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ وہ بار بار نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا اور سوچتا ____ "یقیناً میں اس لڑکی سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں---- وہی خوبصورت، متناسب اور زندگی سے بھرپور جسم، وہی لانبے لانبے ریشمی بال اور وہی کنول کی طرح روشن آنکھیں---- میں کیسے دھوکا کھا سکتا ہوں؟ یہ لڑکی اپنے پورے سراپے کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہے---- مگر یہ اس

بات سے انکار کیوں کر رہی ہے- کیا اسے بھی میری طرح یاد نہیں رہا ہے کہ ہماری پہلے کہاں ملاقات ہوئی تھی کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے میری ذات سے کوئی دکھ پہنچا ہو اور اب وہ مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر رہی ہو---- مگر میری زندگی میں تو کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جو کسی کے لئے تکلیف کا باعث بن سکتا ہو- میں اس سے ملا ہوں یا نہ ملا ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ یہ لڑکی میرے لئے اجنبی نہیں- میں ایک عرصے سے اس سے واقف ہوں اور اسے تلاش بھی کرتا رہا ہوں- میں بیگم ریاض سے کہوں گا کہ میں اپنی کچھ تصویروں کے لئے شہلا کو ماڈل بنانا چاہتا ہوں---- مجھے یقین ہے وہ میری اس درخواست کو قبول کر لیں گی----"

کھانا ختم ہو گیا مگر اس کی الجھن میں کمی نہ آئی- وہ پھر باہر لان میں آگیا اور سب سے علیحدہ پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا- اس نے سگریٹ جلائی اور پھر سوچنے لگا- آخر کہاں---- اس سے میری ملاقات کہاں ہو سکتی ہے- وہ کہتی ہے وہ کبھی راولپنڈی سے باہر نہیں گئی اور میں کبھی پنڈی نہیں گیا- پھر آخر یہ معمہ کیا ہے---- ہماری ملاقات آخر کہا ہوئی ہے---- یہ خوبصورت اور متناسب جسم' یہ لانبے لانبے ریشمی بال' بالوں میں پھول سجانے کا مخصوص انداز اور یہ کنول سی روشن آنکھیں---- میں یہ کیسے مان لوں کہ شہلا سے آج تک میری ملاقات نہیں ہوئی ہے-"

"کافی پیئں گے آرٹسٹ صاحب" بیگم ریاض نے پاس سے گذرتے ہوئے اس سے پوچھا-

"جی یقیناً---- بہت بہت شکریہ!"

"مگر یہ کیا وحشت ہے کہ آپ یہاں سب سے علیحدہ بیٹھے ہیں- کیا کسی سے روٹھ گئے ہیں؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے-" وہ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا ____ دراصل میں کچھ سوچ رہا تھا---- کیا آپ کو یقین ہے کہ شہلا کبھی پنڈی سے باہر نہیں گئی- میرا مطلب ہے کہ ایک دو دن کے لئے یا محض دو چار گھنٹوں کے لئے----"

کمال ہے بھئی---- "تمہارے ساتھ یہ بڑی مشکل ہے کہ تمہارے ذہن کی سوئی ٹوٹے ہوئے ریکارڈ کی طرح ایک ہی جگہ اٹک کر رہ جاتی ہے-" بیگم ریاض بولیں- "شہلا کے والد بڑے عجیب آدمی ہیں- وہ اپنے تمام عزیزوں سے سخت ناراض ہیں- وہ کسی کو اپنا

دوست بھی نہیں سمجھتے- وہ خود کہیں جاتے ہیں نہ اپنے بچوں کو کہیں بھیجتے ہیں- وہ کہتے ہیں جسے ملنا ہو گا وہ خود ان کے یہاں آ جائے گا- میں راولپنڈی گئی تھی تو بڑی مشکل سے بھائی صاحب کو شہلا کو یہاں بھیجنے پر آمادہ کیا ہے- اس بیچاری کو پنڈی سے باہر نکلنا ہی کہاں نصیب ہوا ہے----"

"مگر میں کبھی راولپنڈی نہیں گیا-" وہ بولا----

"اور مجھے یقین ہے کہ آپ کبھی شہلا سے ملے ہی نہیں-"

"میں آپ کی بات تسلیم کر لیتا مگر....."

"پھر وہی مگر----" بیگم ریاض نے ہنستے ہوئے کہا- "میں کافی بھجواتی ہوں آپ کے لئے----"

وہ آگے بڑھ گئیں----

"مگر----" توصیف نے خیالات کا دھارا بہنے دیا---- "یہ خوبصورت' متناسب اور زندگی سے بھرپور جسم' لانبے لانبے سرخی مائل سنہرے بال' بالوں میں پھول سجانے کا مخصوص انداز اور مسکراتی ہوئی کنول ایسی روشن آنکھیں---- یہ سب تو میرا جانا پہچانا ہے-"

اس کی الجھن بڑھتی چلی جا رہی تھی---- اس نے کافی کا بھی انتظار نہیں کیا اور بیگم ریاض کے بنگلے سے باہر نکل آیا ٹیکسی روکی اور اپنے فلیٹ کی طرف چل دیا- راستے بھر ٹیکسی کے پہیے کی طرح یہ سوال اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا---- "شہلا مجھے کہاں ملی تھی---- شہلا مجھے کہاں ملی تھی----"

گھر پہنچا تو وہ بری طرح الجھا ہوا تھا- جھنجلاہٹ میں اس نے ٹھوکر مار کر اپنے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا- لیکن دروازہ کھلتے ہی وہ دم بخود رہ گیا-

سامنے ایزل پر شہلا کی ادھوری تصویر اپنی کنول ایسی مسکراتی ہوئی روشن آنکھوں سے اسے تک رہی تھی----

احساس کا دریچہ

وقت قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ کلاک کا پنڈولم ادھر ادھر حرکت کر رہا تھا۔ سوئیاں اپنی بندھی ٹکی رفتار سے چل رہی تھی۔ چیونٹی کی رفتار سے آگے آگے سرک رہی تھیں.... سات ابھی نہیں بجے تھے۔ وہ سات بجنے کا بیچینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ابھی پورے پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس عرصے میں وہ تین مرتبہ کلاک کے چہرے کو بڑی بیکسی سے تک چکا تھا مگر سوئیاں بدستور اپنی جگہ قائم نظر آئیں تھیں۔ جیسے وقت ٹھہر گیا ہو' جیسے کلاک رک گیا ہو۔ ابھی سات بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

"وقت کیا ہے؟ اسے ہم سے ضد کیوں ہے؟"

اس نے سوچنا شروع کیا۔ جب چاہتے ہیں کہ یہ آہستہ آہستہ گذرے' ٹھہر ٹھہر کر چلے تو آندھی طوفان کی طرح گزرتا چلا جاتا ہے۔ تند رفتار دھارے کی مانند بہتا چلا جاتا ہے..... مگر جب چاہتے ہیں کہ جلدی سے گذر جائے تو یوں آہستہ آہستہ چلتا ہے' جیسے آندھی کی مخالف سمت چل رہا ہو' جیسے طوفانی دھارے کے سینے کو چیرتا ہوا بڑھ رہا ہو' جیسے تھک گیا ہو' ہانپ گیا ہو' جیسے بیدم ہو کر جانے والا ہو' مرجانے والا ہو.....

مگر وقت کبھی نہیں مرتا' کبھی نہیں تھکتا' وہ اپنی یکساں رفتار سے چلتا رہتا ہے۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ سات بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ پانچ منٹ آنکھ بچا کر چپ چاپ گذر گئے تھے۔

سات بجے کا اسے انتظار رہتا تھا۔ سات بجتے ہی وہ سائیکل اٹھا کر سڑک پر نکل آتا۔ اچک کر سائیکل پر سوار ہوتا اور دفتر کے لئے روانہ ہو جاتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا' اس میں کبھی شاذ و نادر ہی تبدیلی آتی تھی اور اسی طرح نئے نئے راستے تلاش کرنا بھی اس کا مشغلہ تھا۔ گھر سے دفتر تک کے اس نے کتنے ہی راستے تلاش کئے تھے۔ مگر پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ انہیں راستوں میں سے ایک کا ہو رہا۔

اس روز بھی وہ حسب معمول سات بجے گھر سے نکلا تھا۔ مگر سائیکل پر سوار ہوتے ہوئے اسے خیال آیا کہ آج باغیچہ کی طرف سے گھوم کر چلنا چاہئے۔ اس نے سائیکل باغیچہ کی سمت موڑ دی اور کوئی فلمی دھن گنگناتا ہوا چل دیا۔

باغیچہ سے گذر کر بڑی سڑک پر مڑتے ہوئے وہ اچانک چونک سا گیا۔ کونے والے مکان کی سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ نو شگفتہ پھول کی طرح شاداب' آنکھوں میں سورج کی پہلی کرن کی سی مسیحائی لئے' بالوں کی سرمئی بدلیوں کو کاندھوں پر بکھرائے..... لاشعوری طور پر اس کی انگلیاں بریکوں پر گئی اور سائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ رک سی گئی۔ مگر ابھی وہ نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ کھڑکی کھٹاک سے بند ہو گئی۔

"اف خدایا!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور سائیکل کی رفتار تیز کر دی۔

اس روز وہ دفتر میں بہت خوش رہا۔ بات بات پر قہقہہ لگاتا رہا۔ ساتھیوں کو چھیڑتا اور ان پر فقرے چست کرتا رہا۔

"آج کی بات ہے صاحبزادے' بہت خوش نظر آتے ہو؟" دفتر کے بوڑھے ہیڈ کلرک مولانا صاحب نے اس کی بدلی ہوئی حالت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

"بس مولانا صاحب' آج کچھ نہ پوچھئے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج مجھے وہ خوشی نصیب ہوئی ہے کہ آج تک جس سے ناآشنا تھا۔ اب ہر چیز مجھے بدلی بدلی نظر آتی ہے۔"

اور مولانا صاحب مسکرا کر یوں خاموش ہو گئے جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں۔

"کیا بات ہے بھئی؟" اس کے ایک اور ساتھی نے پوچھا۔

"بہت کچھ....." اس نے جواب دیا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"بہت کچھ....." اس نے دھیرے سے کہا اور زور سے ہنسنے لگا۔

دفتر ختم ہونے کے بعد وہ اسی راستہ سے واپس آیا مگر اب سڑک پر چہل پہل بڑھ گئی اور وہ کھڑکی بند تھی۔

دوسرے روز وہ پھر اسی راستہ سے دفتر کے لئے روانہ ہوا اور جب کھڑکی کے سامنے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ لڑکی کھڑکی میں کھڑی ہوئی ہے۔ مگر جیسے ہی اس نے بریک لگائے' کھڑکی کھٹاک سے بند ہو گئی..... اور پھر یہ اس کا روز کا معمول بن گیا کہ سات بجے گھر سے

نکلتا باغیچہ کے راستہ سے دفتر کے لئے روانہ ہوتا اور جب وہ باغیچہ سے بڑی سڑک کی طرف جاتا تو اسے دور ہی سے کھڑکی میں وہ شگفتہ چہرہ نظر آ جاتا۔ مگر وہ' کبھی اسے دور سے دیکھ کر ہی اور کبھی اس کے کھڑکی کے سامنے پہنچنے پر کھڑکی بند کر لیتی۔

شروع شروع میں تو اس نے سوچا کہ شاید دو چار روز کے بعد کچھ الطاف و عنایات کا مظاہرہ ہو گا۔ مگر جب کئی ہفتے اسی انداز سے گذر گئے تو اس کے وسوسے سرد پڑ گئے مگر اس کے معمول میں پھر بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہ روزانہ جھنجھلا کر کھڑکی بند کر دیتی۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں ہی اس بات کے عادی ہو گئے ہوں۔

مگر کل اچانک حالات کی یکسانیت ٹوٹ گئی۔

کل بہار کی پہلی بارش ہوئی تھی۔ رات بھر پانی برستا رہا تھا اور صبح جب وہ دفتر کے لئے روانہ ہوا تھا تب بھی رم جھم رم جھم پھوار پڑ رہی تھی۔ مکانات' عمارتیں' راستے اور فضا دھل گئی تھی۔ پیڑ پودے نہائے دھوئے سبز قبا زین تن کئے صبح کی مدہوش کن ہوا میں جھوم رہے تھے۔ خود اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ ہوا اتنی خوشگوار اور معطر تھی کہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب زور زور سے ہنسے' دیوانہ وار رقص کرے۔

کھڑکی آج بھی کھلی ہوئی تھی اور وہ لڑکی آج بھی آنکھوں میں نیند کا خمار لئے' کاندھوں پر بدلیاں بکھرائے کھڑی ہوئی تھی۔ آج جب اس نے کھڑکی کے سامنے جا کر بریک لگائے تو کھڑکی بند نہ ہوئی۔ کچھ دیر تک وہ سائیکل پر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر ڈگمگا کر گر گیا اور لڑکی کے کلیوں کی طرح خوبصورت لب بے اختیار تبسم سے کھل کر وا ہو گئے۔ ایک ایسا تبسم جو واضح بھی تھا اور معنی خیز بھی تھا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھڑکی بند کر دی۔ مگر آج جھنجھلا کر نہیں مسکرا کر.....!

کل پھر وہ دن بھر بے انتہا مسرور تھا اس نے دفتر میں کئی ہفتوں کا پڑا ہوا ڈھیر سارا کام نکال دیا تھا۔ وہ اپنے جسم میں ایک انوکھی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ مگر یہ کل کی بات تھی۔

اور آج وقت کسی صورت سے نہیں گذر رہا تھا۔ اس نے پھر کلاک کی طرف دیکھا۔ سات بجنے میں ایک منٹ تھا۔ اس نے میز پر سے کلائی کی گھڑی اٹھائی' باندھی اور سائیکل لے کر سڑک پر نکل آیا۔

ہوا بند تھی۔ فضا میں گھٹن رچی بسی ہوئی تھی۔ نمی کی زیادتی کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور پسینہ خشک ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ بادل آج بھی سروں پر

منڈلا رہے تھے مگر برسنے کے ارادہ سے نہیں۔

باغیچہ سے گذر کر وہ بڑی سڑک کی طرف مڑا تو اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی کھڑکی میں کھڑی ہوئی ہے مگر ابھی وہ دور ہی تھا کہ کھڑکی زوردار آواز سے بند ہو گئی' جیسے اسے دیکھتے ہی وہ جھنجھلا گئی ہو۔

کھڑکی کے سامنے جا کر اس نے سائیکل روک دی اور انتظار کرنے لگا کہ شاید یہ کھل جائے مگر وہ نہ کھلی۔ وہ کھڑا بیچارگی سے کھڑکی کو تکتا رہا..... وقت طوفان کی طرح سے دوڑ کر گذر گیا پھر یوں لگا جیسے وقت تھک گیا ہو' ہانپ گیا ہو' جیسے بیدم ہو کر گر جانے والا ہو' مر جانے والا ہو.....

مگر وقت کبھی نہیں مرتا' کبھی نہیں تھکتا' وہ اپنی یکساں رفتار سے چلتا رہتا ہے۔

حصار ذات کا قیدی

بھائی قیصر محلے میں نئے نئے آئے تھے اور آتے ہی سب کی آنکھوں کے تارے بن گئے تھے۔

ایک دو کی بات نہیں تھی جو بھی ملتا ان کا مداح بن جاتا۔ مگر یہ اعجاز انہیں یونہی نہیں مل گیا تھا۔ اس میں خون جلانا اور جان کھپانی پڑتی تھی۔

چودھری برکت اللہ محلے کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ لئے دیئے دیتے تھے۔ دوستوں کا حلقہ بھی وسیع نہیں تھا۔ محلے میں چند لوگ ہی ایسے تھے۔ جو ان کے دیوان خانے میں باریابی پا سکتے تھے۔ بھائی قیصر تو پھر نووارد تھے۔ ان کو بھلا کب چودھری صاحب اہمیت دینے والے تھے۔ مگر جب چودھری صاحب کی لڑکی کی شادی ہوئی تو بھائی قیصر بغیر بلائے ان کے گھر پہنچ گئے۔ اور شادی کا سارا کام اس طرح اپنے ذمہ لے لیا۔ جیسے خود ان کی اپنی لڑکی کی شادی ہو رہی ہو۔ شامیانے لگوانے' چھڑکاؤ کروانے' کرسیاں بچھوانے اور مہمانوں کو خوش آمدید کہنے سے لے کر کھانے پکوانے اور کھلوانے تک کا سارا کام انہوں نے اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ چودھری صاحب ان کے حسن انتظام کے قائل ہو گئے۔

سارا کام بھائی قیصر کی نگرانی میں ہوا مگر جب منتظمین کے کھانا کھانے کا وقت آیا تو وہ غائب تھے۔ چودھری صاحب نے تلاش کیا تو پتہ چلا کے وہ تو گھر جا چکے ہیں۔ چودھری صاحب کو ان کی یہ ادا بہت اچھی لگی۔ اور خود ان کو بلانے کے لئے ان کے گھر گئے۔

چودھری صاحب اس روز بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنی پگڑی بھائی قیصر کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "آج سے آپ میرے بھائی ہیں---- اور بھائیوں کو رسمی انداز کے دعوت ناموں کی ضرورت نہیں ہوتی!"

چودھری صاحب نے بھائی کہہ دیا تو گویا یہ بات طے ہو گئی کہ محلے کا ہر شخص انہیں بھائی کہے گا۔ وہ دن اور آج کا دن چھوٹے بڑے سب انہیں بھائی قیصر کہہ کر پکارنے لگے۔

پھر بھائی قیصر کی ہردلعزیزی کا حلقہ روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ محلے میں کسی کے گھر کوئی

تقریب ہوتی تو گویا یہ بات طے پاتی کہ اس کے انتظامات کی نگرانی بھائی قیصر کے ہاتھ میں ہو گی۔ کسی کے گھر میت ہو جاتی تو کسی کو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ مردے کو نہلانے دھلانے اور اس کے کفن دفن کا انتظام بھی کرنا ہے۔ بھائی قیصر کچھ دیر پسماندگان کے پاس بیٹھ کر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے اور خوشی خوشی اپنے کام میں مشغول ہو جاتے اس کے بعد یہ کام اپنے وقت پر ٹھیک ٹھیک ہوتا چلا جاتا اور کسی کو یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ کتنا بڑا پہاڑ تھا جو چپ چپاتے کٹ گیا ہے۔

چودھری صاحب نے انہیں اپنا بھائی بنا کر اپنے گھر کے اندر بلا لیا اور اپنی بیوی کا پردہ ختم کرا دیا تو محلے بھر میں اس سنت پر عمل ہوا۔ کسی کو اپنے لڑکے یا لڑکی کا رشتہ طے کرنا ہوتا تو ان سے مشورہ طلب کرنے کے لئے ان کا بلاوا آ جاتا۔ کسی کو اپنا زیور گروی رکھ کر راز دارانہ طور پر قرض لینا مقصود ہوتا تو بھائی قیصر کی خدمات کی ضرورت پیش آتی---- رفتہ رفتہ وہ محلے بھر کی سماجی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل کرتے چلے گئے۔ انہیں لوگوں کے کام آ کر بہت خوشی ہوتی تھی۔ شکر گزاری اور تعریف کے چند الفاظ جو ان کی خدمت کے صلے میں ان کی جھولی میں ڈال دیئے جاتے انہیں بہت بڑا سرمایہ نظر آتے تھے وہ ان کی لذت سے پہروں مزا لیتے رہتے۔

محلے بھر میں ایک بھی فرد ایسا نہیں تھا جسے ان سے شکایت ہو سوائے ان کی اپنی بیوی کے گھر کے باہر ان کی بے پناہ مشغولیت کی وجہ سے گھر بے توجہی کا شکار ہو گیا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ دوسروں کے کاموں میں اپنی جیب سے پیسے خرچ کر دیتے تھے اور گھر میں پیسوں کی کمی پڑ جاتی تھی۔ بیوی ناراض ہو جاتی تو اس کی شکایت کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کرتے اور جھگڑا بڑھ جاتا۔

محلے کے نوجوانوں کے جذباتی اور نفسیاتی مسائل میں وہ ان کے مشیر تھے۔ ایک روز ماسٹر گل محمد کا لڑکا آیا۔ اور کہنے لگا۔ بھائی قیصر آپ سے ایک کام ہے۔"

"بولو۔ بولو---- کیا بات ہے۔" انہوں نے حسب عادت بے صبری سے کہا۔

"نہیں، پہلے وعدہ کریں کہ آپ کر دیں گے۔"

"اوہو تو کوئی ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ خیر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ پوری پوری کوشش کریں گے۔"

"وہ شبیر صاحب ہیں نا۔ شبیر صاحب کبوتر والے۔"

"ہاں- ہاں میں سمجھ گیا- ان سے کیا کام آ پڑا ہے-"

"نہیں ان سے تو کوئی کام نہیں- ان کی لڑکی ہے نا زہرہ!"

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا- تم اسے پسند کرتے ہو- اس سے محبت کرتے ہو ____ یہی نا-"

"جی ہاں---- مگر ہمارے ان سے تعلقات اچھے نہیں ہیں- آپ کسی طرح سے صلح کرا دیجئے اور---- اور تمہاری زہرہ سے شادی بھی!" بھائی قیصر نے اس کی بات کاٹ کر کہا-

"جی ہاں----!"

"اچھا اچھا---- سب ٹھیک ہو جائے گا- انشاء اللہ- وہ بولے-"

بھائی قیصر ایک فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے- شام کو جب وہاں سے چھٹی ملی تو وہ سائیکل لے کر نکل کھڑے ہوتے اور اپنے محلے والوں کے کام نمٹاتے پھرتے- کہیں رات گئے ان چکروں سے فرصت ملتی- وہ تھکن سے بری طرح نڈھال گھر پہنچتے مگر بہت مطمئن اور بہت خوش- وہ سوچتے تھوڑی سی تکلیف تو ضرور اٹھانی پڑتی ہے مگر اس کی وجہ سے محلہ کا ہر فرد مجھ سے محبت کرتا ہے- اور ہر ایک کی نگاہوں میں میری اہمیت ہے-

مگر اب کچھ دنوں سے ان کے دل میں ایک پھانس چبھ گئی تھی- جس نے انہیں ایک دائمی عذاب میں مبتلا کر دیا تھا- ان کے گھر کے پاس ایک چھوٹا سا پلاٹ خالی پڑا ہوا تھا- کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس چھوٹے سے پلاٹ پر کسی کو گھر بنانے کا خیال بھی آئے گا- مگر ایک دن انہوں نے دیکھا کہ وہاں پر اینٹیں پڑی ہوئی ہیں- پھر دوسرے دن جب وہ اپنے دفتر سے لوٹے تو ان کے نئے پڑوسی گھر میں آ چکے تھے- اینٹوں کو یونہی اوپر تلے رکھ کر چھوٹی چھوٹی دیواریں اور ان پر چٹائی کی چھت ڈال کر کمرہ بنا لیا گیا تھا- چٹائی ہی کی چہار دیواری تھی---- گھر کی حالت سے غربت صاف ظاہر تھی- اگلے دن ان کا نئے پڑوسی سے سامنا بھی ہو گیا---- وہ نوجوان تھا' صحت مند اور خاصا خوبصورت! انہوں نے اسے روک کر پوچھا- "بھائی کیا آپ ہی ہمارے نئے پڑوسی ہیں؟"

"جی ہاں----"

"میں آپ کا قریب ترین پڑوسی ہوں-" بھائی قیصر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا- "مجھے قیصر کہتے ہیں- آپ کا اسم گرامی!"

"طارق---- طارق علی-!"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر- آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف----"

"جی شکریہ!" طارق نے ان کی بات کاٹتے ہوئے روکھائی سے کہا- "اللہ کا دیا سب کچھ ہے- ویسے میں امداد لینے کا قائل نہیں ہوں-"

"خیر خیر خدا کا شکر ہے---- مگر تکلف "نہ کیجئے" بھائی قیصر نے بوکھلا کر کہا اور دفتر کی طرف چل دیئے- وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کی پیش کش اس ترشی سے بھی ٹھکرائی جا سکتی ہے- اب انہیں اس بات کی عادت بھی نہیں رہی تھی-

شام کو جب وہ گھر آئے تو انہوں نے پانی کی دو بالٹیاں بھریں اور طارق کو دینے کے لئے چل دیئے ان کا خیال تھا کہ وہ پانی کو تو کیا انکار کرے گا اور اگر وہ پانی رکھ لیتا تو صبح کا زخم اتنا گہرا نہیں تھا کہ مندمل نہ ہوتا- مگر اس نے پانی لینے سے بھی انکار کر دیا-

"وہ بولا- پانی میں نے مسجد کے نلکے سے بھر لیا ہے-"

"خیر یہ بھی رکھ لیجئے- پانی کی ضرورت رہتی ہی ہے-" بھائی قیصر بولے-

"نہیں ہم دو آدمی ہیں- اتنا پانی کیا کریں گے-" اس نے یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی- بھائی قیصر تلملا کر رہ گئے- انا کے زخم میں ایک اور ٹھیس لگی- پھر بار بار ایسی چوٹیں لگتی رہیں- اور زخم گہرا ہوتا چلا گیا- درد بڑھتا گیا-

بھائی قیصر کی زندگی میں یہ دوسری ہستی تھی جس نے ان کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا-

طارق علی سے پہلے، بہت پہلے---- صفیہ نے بھی ہی طرز اختیار کیا تھا- اس وقت وہ چھوٹے سے لڑکے تھے- گھر کے اکلوتے تھے- لاڈ پیار نے عادتیں بگاڑ دیں تھیں- ادھر زبان سے کوئی بات نکلی ادھر پوری ہوئی- مگر گھر کی چہار دیواری کے باہر ایک دوسری دنیا تھی- وہ جب اپنے ہم جولیوں کے حلقے میں آئے تو حالات بدلے ہوئے ملے- ان کی بات پر کوئی کان ہی نہیں دھرتا تھا- انہیں اس بات پر غصہ آ جاتا اور وہ اپنے ساتھیوں سے لڑ پڑتے- اٹھان اچھی تھی اکثر لڑائی میں وہ اپنے ساتھیوں کو مار لیا کرتے تھے- رفتہ رفتہ ان کے تمام ہی ہمجولی ان سے دور دور رہنے لگے- ان کے ساتھ کھیلتے نہ انہیں اپنے ساتھ کھلاتے! محسن ان کا خاص حریف تھا- وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے کا عادی تھا اور ان کے رعب میں کبھی نہ آتا تھا- لڑائی میں بھی وہ ان سے کمزور نہیں تھا- اس لئے اس پر ان کا کوئی بس

نہ چلتا تھا۔

انہیں دنوں ان کے محلے میں نئے کرائے دار آئے۔ صفیہ ان کی لڑکی تھی۔ صفیہ اتنی اچھی تھی کہ ہر لڑکے کا اس کے ساتھ کھیلنے کو جی چاہتا تھا۔ محسن کے ساتھ اس کی پکی دوستی ہو گئی۔ انہیں یہ بات بہت ناگوار گذری وہ بہت چاہتے تھے کہ صفیہ انہیں بھی اپنے کھیل میں شامل کر لیا کرے۔ مگر وہ انہیں پسند نہیں کرتی تھی اور ان کی ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا کرتی تھی۔ ایک دن انہوں نے اس سے کہا۔ "صفیہ" ہمیں بھی اپنے ساتھ کھلا لیا کرو۔"

صفیہ نے ان کو دیکھا اور تحقیر آمیز لہجہ میں بولی۔ "تمہیں۔ نا بابا۔ تم تو اتنے جھگڑالو اور اتنے برے ہو۔۔۔۔ تمہیں کون کھلائے اپنے ساتھ۔"

اس دن انہیں بڑی شدت سے اپنی اس کوتاہی کا احساس ہوا۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ آئندہ کسی سے نہیں لڑیں گے۔ کسی کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے مگر ان کی سرکش روح انہیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔ وہ بہت دنوں تک اپنے آپ سے لڑتے رہے۔ وہ اپنی سرکش روح کو تو بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے مگر انہوں نے اپنے اوپر ایک ایسا خول چڑھا لیا جس سے وہ ایک دوسرے ہی انسان نظر آنے لگے۔ لیکن جب وہ اس قابل ہوئے کہ صفیہ سے کہہ سکیں کہ دیکھو اب میں جھگڑالو نہیں رہا اب تو میں سب کے ساتھ مل کر کھیلتا ہوں۔ اپنے تمام ساتھیوں کے کام آتا ہوں۔ اور ان کی مدد کرتا ہوں۔ تو صفیہ کے والد کا تبادلہ ہو چکا تھا اور وہ کسی دوسری جگہ چلی گئی تھی۔

صفیہ چلی گئی تو وہ بہت جھنجھلائے اور ان کی فطرت کی سرکشی پھر لوٹ آئی مگر انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور وہ خول جو انہوں نے اپنے اوپر چڑھا رکھا تھا اترنے نہ دیا۔ آج بھی کوئی ان کی بات ماننے سے انکار کر دیتا تھا تو ان کی فطرت کی غضبناکی زندہ ہو جاتی اور وہ اسے نقصان پہنچانے اور تکلیف دینے کے منصوبے سوچنے لگتے۔

طارق علی کی طرف انہوں نے جب بھی دوستی کا ہاتھ بڑھایا اپنے انا کے زخم پر ایک تازہ چوٹ کھائی۔ وہ ان کی ہر پیشکش کو لاتوجہی اور کبھی کبھی تمسخر اور نفرت سے ٹھکراتا رہا۔

وہ طارق کے خیال سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے مگر وہ ان کے ذہن پر آسیب کی طرح چھایا رہتا تھا۔ ایک روز وہ اسی الجھن میں رات گئے تک جاگتے رہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاند کی خنک چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی مگر ان کے اندر ایک الاؤ دھک رہا تھا۔ گھر کا ہر فرد گہری نیند سویا ہوا تھا۔ مگر وہ انگاروں پر چل رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے

اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے پھر وہ اٹھے اور چھت پر جا کر ٹہلنے لگے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ طارق سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔ چھت پر ٹہلتے ٹہلتے وہ پردے کی دیوار تک چلے گئے اور پھر لاشعوری طور پر دیوار کی جالی میں سے طارق کے گھر میں جھانکنے لگے۔ ان کے گھر میں ایک ہی پلنگ تھا اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ جھانکتے رہے اور سوچتے رہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں کتنا والہانہ پن ہے دونوں کی زندگی میں ایسا پیار اور ایسا والہانہ پن تو ان کی زندگی میں انہیں کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ معاً ان کے ذہن میں ایک خیال آیا اور ان کے چہرے کا تناؤ یکلخت ختم ہو گیا۔ انہوں نے اپنی جلتی ہوئی سگریٹ پردے کی دیوار کے اوپر سے اچھال دی جو طارق کے کمرے کی چٹائی کی چھت پر جا گری اور جب دھواں شعلوں میں تبدیل ہو گیا تو اطمینان سے نیچے اتر آئے۔ پھر جب محلے میں شور ہوا تو وہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے آگ بجھانے والوں میں جا کر شامل ہو گئے۔

صبح وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے باہر نکل کر دیکھا---- طارق تھا۔

طارق نے شرم سے نگاہیں نیچے جھکائیں ہوئیں تھیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ سے ایک کام ہے بھائی قیصر!"

"آؤ اندر آ جاؤ----" وہ بولے اسے گھر کے اندر لے آئے اور اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے بولے۔ ہاں بھئی اب بتاؤ میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں۔

"بات یہ ہے کہ اصل میں میرا اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ رات کی آگ میں آپ کو معلوم ہے گھر کا سب کچھ جل گیا۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کر سکیں تو مجھے کچھ عرصے کے لئے دو سو روپے قرض دے دیں----!"

"بس دو سو روپے" "سوچ لو زیادہ کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔"

"نہیں کافی ہوں گے----!"

"اللہ مالک ہے۔ شام کو لے لینا۔ اور ہاں! بھابی سے کہنا ہمارے ہاں آ جائیں۔"

ان کے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس روز گھر سے فیکٹری تک کا چار میل کا راستہ انہیں ایسا لگا جیسے مشکل سے ایک فرلانگ ہو۔ راستے بھر وہ خوشی سے آپ ہی آپ ہنستے رہے۔ کبھی صاف سڑک پر بھی سائیکل کی گھنٹی بجا بجا کر جھومنے لگے۔

دفتر جاتے ہی انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دو سو روپے قرض کی درخواست لکھی اور سیٹھ کے پاس بھجوا دی انہیں یقین تھا کہ ان کی درخواست منظور ہو جائے گی مگر شام تک اس پر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ آخر وہ خود سیٹھ کے پاس گئے مگر اس نے انہیں ٹال دیا۔

دفتر سے نکلے تو سوچ رہے تھے اب دو سو روپے کہاں سے لائیں۔ سوچتے سوچتے وہ بازار کی طرف مڑ گئے۔ اور جب گھر لوٹے تو ان کی جیب میں سوا دو سو روپے کے نوٹ تھے۔ دو سو روپے انہوں نے طارق کو دے دیئے۔

دوسرے دن وہ معمول سے بہت پہلے دفتر کے لئے نکلے۔ گھر سے باہر آتے ہی طارق سے سامنا ہو گیا۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔ "بھائی قیصر سائیکل کیا ہوئی۔"

سائیکل---- وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "پرانی ہو گئی تھی۔ آئے دن بگڑتی رہتی تھی۔ میں نے بیچ دی۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے بھائی قیصر!" "طارق کی آنکھوں میں احسان مندی کے آنسو امنڈ آئے۔"

"آپ نے میرے لئے اپنی سائیکل بیچ دی۔ آپ تو سچ مچ فرشتہ ہیں۔"

اس کے دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹیں۔ چہرے پر ملکوتی مسکراہٹ کا نور پھیل گیا۔ "کیوں شرمندہ کرتے ہو بھائی۔" وہ نہایت انکساری سے بولے۔ "میرے یہ نصیب کہاں کہ فرشتہ کہلاؤں----!!"

"خدا پرست"

"السلام علیکم!"

"و علیکم السلام۔"

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا کرم ہے بابو صاحب' اپنی سنایئے!"

"یہ کیا ہو رہا ہے صبح ہی صبح حاجی صاحب!---- یہ کیا ہے؟

"کیا پسی ہوئی مرچوں میں گیرو ملا رہے ہیں!"

"ہی- ہی- ہی---- کیا کریں بابو صاحب! اتنی بڑی دکان لے کر بیٹھے ہیں تو آخر دو پیسے کمانے کے لئے نا----؟ دھندا اتنا خراب ہو گیا ہے کہ سیدھے سیدھے چلیں تو دو پیسے تو کیا ایک پیسہ بھی نہ ملے بلکہ سچ پوچھو تو گرہ کی رقم بھی ہاتھ سے جائے۔ برا زمانہ آ گیا ہے۔!"

"سچ فرماتے ہیں حاجی صاحب---- اور ایسے کام کرنے والوں کے لئے تو کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ سنا ہے ملاوٹ کرنے والے پکڑے جا رہے ہیں اور ان کو بڑی بڑی سزائیں اور جرمانے ہو رہے ہیں!"

"اللہ مالک ہے جی!"

صبوحی کا ساتھی

صبوحی کا امتحان سر پر آ گیا تھا اور اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

اس کی چھوٹی بہن شہلا اس سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ اس نے ساری کتابیں شروع سے آخر تک پڑھ ڈالیں تھیں۔ انہیں دہرا بھی لیا تھا خاص خاص سوال تو اسے ازبر تھے مگر صبوحی کا ابھی سارا کام باقی تھا جب اسے خیال آتا تھا کہ چھوٹی بہن شہلا اس سے بہت آگے نکل گئی ہے تو اسے بڑی شرمندگی ہوتی تھی----!

یہ بات نہیں تھی کہ صبوحی کو پڑھنے کا شوق نہ تھا اسے شوق تو بہت تھا مگر جب وہ رات کو پڑھنے کے لئے بیٹھتی تو نیند اسے اس بری طرح ستاتی تھی کہ کتاب کے صفحوں پر نگاہیں جمانا اس کے لئے دشوار ہو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر اگر وہ کوشش کر کے بیٹھی بھی رہتی تھی تو الفاظ گڈ مڈ ہو کر ناچنے لگتے اور کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی---- ہاں اگر صبح سویرے اٹھ کر وہ پڑھنے بیٹھ جاتی تو بات دوسری تھی---- اس وقت وہ جو سبق ایک بار پڑھ لیتی اسے ازبر ہو جاتا۔ اس لئے وہ صبح سویرے اٹھ کر پڑھنا زیادہ پسند کرتی تھی۔

مگر اب کچھ دنوں سے ہوتا یہ تھا کہ صبح کو اس کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ سورج نکل آتا اور وہ پڑی سوتی رہ جاتی۔ گھر میں سب اٹھ کر اپنے کام کاج میں لگ جاتے اور اسے جگانے کا کسی کو خیال ہی نہ آتا۔ جب اسکول کا وقت قریب آتا تو شہلا آ کر اسے جگاتی: "اٹھو آپی اسکول کا وقت قریب ہو گیا ہے۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی مگر صحن میں پھیلی ہوئی دھوپ دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوتا' پھر شہلا بھی بڑی شریر تھی۔ وہ اس کو چڑانے کے لئے کہتی۔ "آپی اس مرتبہ پاس ہونے سے رہیں۔ شہلا کی یہ بات سن کر یوں تو اسے بہت غصہ آتا مگر دل میں یہ سوچ کر کہ بات تو ٹھیک ہی ہے وہ خاموش ہو جاتی۔

وہ چاہتی تو شہلا سے کہہ سکتی تھی کہ صبح جب وہ اٹھا کرے۔ تو اسے بھی اٹھا دیا کرے مگر یہ بات اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ دونوں بہنوں کی عمروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا'

صبوحی شہلا سے صرف ڈیڑھ سال بڑی تھی اور اسکول میں اس سے صرف ایک سال آگے تھی۔ اس پر شہلا یہ شیخی بگھارتی رہتی تھی کہ وہ ایک سال میں دو امتحان پاس کر کے اس کی کلاس میں آ جائے گی۔ ایسی صورت میں وہ شہلا کا احسان اٹھانا نہیں چاہتی تھی مگر صبح جلدی اٹھنے کی کوئی دوسری صورت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا چلا جا رہا تھا اور اس کی پریشانی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

صبوحی نے ایک مرغا پال رکھا تھا۔ رنگین پروں والا خوبصورت اور موٹا تازہ مرغا۔ وہ اسے روزانہ اپنے ہاتھوں سے دانا کھلاتی اور ڈھیروں پیار کرتی۔ مرغا بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا اور جب ان کو کوئی دوسرا کام نہ ہوتا تو وہ دونوں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ مرغا تھا بھی بہت ہی باتونی----!

مگر اس روز صبوحی کو صبح سے شام تک مرغ کو دانا کھلانے کا خیال ہی نہ آیا۔ وہ بے چارہ دن بھر بھوکا پھرتا رہا۔ آخر شام کو وہ شکایت کرنے کے لئے صبوحی کے پاس آیا مگر صبوحی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ صبوحی کسی وجہ سے پریشان ہے۔ اس نے پوچھا "اچھی صبوحی۔ آج آپ اتنی پریشان کیوں ہیں----؟"

صبوحی کے خیالات کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ اس نے مرغ کی طرف دیکھا اور اس سے کہا۔ "میرا امتحان سر پر آ گیا ہے میاں مرغے مگر مجھے کچھ یاد ہی نہیں ہے' اگر میں پڑھوں گی' نہیں تو فیل ہو جاؤں گی۔"

"تو آپ پڑھتی کیوں نہیں ہیں؟" مرغ نے پوچھا۔ "آپ تو کتابیں پڑھنے کی بہت شوقین ہیں۔"

"پڑھوں کیسے؟" اس نے بے بسی سے کہا۔ "رات کو نیند آ جاتی ہے۔ اس وقت مجھ سے کچھ پڑھا نہیں جاتا اور صبح آنکھ نہیں کھلتی۔ اگر مجھے کوئی صبح سویرے جگا دیا کرے تو میں جلدی جلدی اپنا سارا کورس ختم کر لوں۔"

"تو یہ کونسی مشکل بات ہے۔" مرغ نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں بہت جلدی اٹھنے کا عادی ہوں میں آپ کو جگا دیا کروں گا۔"

صبوحی خوش ہو گئی۔ وہ بولی۔ "بہت بہت شکریہ میرے اچھے مرغے' میں تمہارے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کروں گی اور ہمیشہ تمہارا بہت ہی زیادہ خیال رکھا کروں گی جس چیز کو تمہارا دل چاہا کرے گا۔ وہی کھلایا کروں گی۔"

مرغ نے اسے صبح سویرے اٹھانے کا وعدہ تو کر لیا مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ دن کی طرح رات کو اسے آزادی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

صبح ہوئی تو اس نے زور زور سے چلا کر صبوحی کو پکارا۔

"صبوحی بی بی! اٹھو صبح ہو گئی---- اٹھو صبح ہو گئی۔ اب اپنی کتابیں لے کر بیٹھ جاؤ' صبح ہو گئی اٹھو۔ اب اٹھ بھی جاؤ صبح ہو گئی۔" مگر اس کا ڈربہ صبوحی کے کمرے سے بہت دور تھا وہاں سے اس کی آواز کمرے تک پہنچتی تو ضرور تھی مگر اتنی دھیمی کہ صبوحی کو جگا نہیں سکتی تھی۔ ڈربہ بند تھا۔ اس لئے باہر نکل کر صبوحی کے کمرے میں جانا اس کے بس میں نہ تھا۔ چیختے چیختے اس کی آواز بیٹھ گئی مگر صبوحی کی آنکھ نہیں کھلی اور جب آنکھ کھلی تو دھوپ سارے آنگن میں پھیل چکی تھی اور شہلا اپنا بستہ لئے سکول جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

صبوحی کو بہت غصہ آیا۔ وہ دوڑی دوڑی مرغ کے پاس گئی اور اس سے شکایت کرنے لگی۔ "واہ میاں مرغے خوب جگایا تم نے----! اچھی دوستی نباہی! ایک دن بھی تم سے مجھے وقت پر نہ جگایا جا سکا۔"

مرغ کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے کڑکڑا کر کہا۔ "صبوحی بی بی----! ایک تو مجھ پر بے وجہ الزام رکھ ہی ہیں میں تو صبح سویرے ہی اٹھ گیا اور آپ کو جگانے کے لئے چیخ چیخ کر پکارتا رہا۔ پکارتے پکارتے مری آواز بیٹھ گی مگر آپ نے کروٹ ہی نہ بدلی اب میں تو اس ڈربے میں بند ہونے کی وجہ سے مجبور تھا ورنہ آپ کو آپ کے کمرے میں جا کر کان پکڑ کر اٹھاتا۔"

صبوحی پھر سوچ میں پڑ گئی---- مرغ کو کھلا چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ پڑوسیوں کی کالی بلی اس کی جان کی دشمن تھی' اگر وہ رات کو اس کو کھلا دیکھ لے گی تو اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ یوں تو وہ بڑا بہادر اور نڈر مرغ تھا مگر پھر بھی آخر مرغ ہی تھا نا۔ اس کا بلی سے بھلا کیا مقابلہ!

اس روز وہ بہت اداس تھی وہ اسکول بھی نہیں گئی اور اپنے کمرے میں بستر پر لیٹ کر سوچتی رہی مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ بس اس کا یہ جی چاہ رہا تھا کہ خوب جی بھر کے روئے۔ اب ان حالات میں اس کا فیل ہو جانا یقینی ہو چکا تھا اور اگر وہ فیل ہو جاتی ہے تو اس کا کتنا مذاق بنے گا۔ سب اسے برا بھلا کہیں گے اور سب سے بری بات یہ

ہو گی کہ اس کی چھوٹی بہن شہلا اس کی کلاس میں آ جائے گی۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ابلنے لگے۔

آنسو اس کے گالوں پر بہہ کر تکیے پر گرے، کسی نے آہستہ سے اس سے کہا۔ "ننھی صبوحی آج تم اتنی اداس کیوں ہو۔ تم رو کیوں رہی ہو؟"

صبوحی یہ آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے ایک دم سے ڈر لگنے لگا، وہ چاہتی تھی کہ چیخ مار کر سارے گھر والوں کو اپنے کمرے میں جمع کر لے کہ اسے وہی آواز پھر سنائی دی۔" ڈرو مت ننھی صبوحی تعجب ہے کہ تم مجھے پہچانتی نہیں ہو میں تو تمہارا بہت پرانا ساتھی ہوں۔ روز تمہارا سر اپنے سینے پر رکھ کر تمہیں میٹھے میٹھے سپنوں کی دنیا میں پہنچا دیتا ہوں جہاں تم پریوں کے محلوں کی سیر کرتی ہو۔ میری طرف دیکھو میں تمہارا تکیہ ہوں۔"

"اوہ مجھے معاف کر دینا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ میں تمہارے سینے پر سر رکھے لیٹی ہوں۔۔۔۔ میں ناشکری ہرگز نہیں ہوں بس مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا اور پھر آج میں بہت پریشان بھی تو ہوں۔"

"کوئی بات نہیں ننھی صبوحی پریشانی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے مگر تم پریشان کیوں ہو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی ہیں۔ مجھے کچھ بتاؤ شاید میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔"

"اچھے مہربان تکیے۔" صبوحی نے کہنا شروع کیا۔ "تمہاری ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔ میں پریشان اس لئے ہوں کہ میرا امتحان سر پر آ گیا ہے اور مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ رات کو پڑھا نہیں جاتا نیند آ جاتی ہے۔ صبح کو آنکھ نہیں کھلتی۔ اس سال تو بس فیل ہو جاؤں گی۔" اور اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

"ہا ہا ہا۔" تکیہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے میں تمہیں سلا ہی نہیں جگا بھی سکتا ہوں۔ تم صبح کس وقت اٹھنا چاہتی ہو مجھے بتاؤ تو سہی۔ میں تمہیں اسی وقت جگا دوں گا۔"

صبوحی نے کہا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟ اگر تم میرا یہ کام کر دو گے تو میری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔"

"میرے لئے یہ کونسا مشکل کام ہے۔" تکیے نے کہا۔ "تم کس وقت اٹھنا چاہتی ہو؟"

"میں۔۔۔۔" صبوحی نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بس جس وقت فجر کی اذان ہوتی ہے اس وقت جگا دیا کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" تکیہ بولا۔ "میں ٹھیک اذان کے وقت تمہیں جگا دوں گا' بلکہ روز جگا دیا کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ سونے سے پہلے مجھے روزانہ یہ بتا کر سویا کرو کہ تم کس وقت اٹھنا چاہتی ہو۔"

اس روز صبوحی سونے کے لئے لیٹی تو اس نے تکئے سے کہا۔

"مہربان تکئے مجھے صبح فجر کی اذان کے وقت اٹھا دینا۔"

اور پھر وہ اطمینان سے سو گئی۔

صبوحی گہری نیند سو رہی تھی کہ کسی نے چپکے چپکے اس کے کان میں کہنا شروع کیا۔ "ننھی صبوحی اٹھو اذان کا وقت ہو گیا ہے۔ اب اٹھ جاؤ اذان کا وقت ہو گیا ہے۔"

پہلے تو اسے یہ خیال آیا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے مگر یہ آواز لحہ بہ لحہ اونچی ہوتی چلی گئی اور پھر آنکھیں بند رکھنا اس کے بس میں نہ رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ صحن میں دھوپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ تمام گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ اس کے پاس ہی دوسرے بیڈ پر اس کی چھوٹی بہن شہلا بے خبر لیٹی ہوئی تھی۔

"بہت بہت شکریہ!" اچھے مہربان تکئے۔ تم نے میری بڑی مشکل آسان کر دی۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" صبوحی کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے مگر یہ پریشانی کے نہیں خوشی کے آنسو تھے۔

"شکریہ کس بات کا ننھی صبوحی!" تکئے نے کہا "تمہاری کامیابی سے مجھے خوشی ہو گی اور تمہاری کامیابی کے لئے میں ہر تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں۔ تم کو آرام پہنچانا ہی میری زندگی کا سب سے بڑا حاصل ہے۔"

"تم کتنے اچھے کتنے مہربان ہو۔" صبوحی نے کہا۔

پھر وہ ٹیبل لیمپ جلا کر پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔ اس وقت اس نے جو کچھ پڑھا' سب پانی کی طرح یاد ہو گیا۔

اب اس کا روزانہ معمول بن گیا تھا کہ سوتے وقت وہ تکئے سے کہہ دیتی۔ "اچھے مہربان تکئے اذان کے وقت جگا دینا۔" اور تکیہ اسے ٹھیک اذان کے وقت جگا دیتا۔ وہ اس وقت اٹھ کر پڑھنا ہوتا پڑھ لیتی اور جب شہلا کے اٹھنے کا وقت ہوتا لیمپ بجھا کر چپ چاپ اس وقت

لیٹ جاتی جیسے ابھی تک سو رہی ہو۔

شہلا یہ سمجھ رہی تھی کہ صبوحی اس سال ابھی تیاری نہیں کر رہی ہے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس سال ضرور صبوحی کے ساتھ آ جائے گی جب امتحان کا نتیجہ آیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

صبوحی اپنی کلاس میں اول آئی تھی۔

سندھی کہانی/ آغا سلیم

قہقہہ

کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ کون ہے' کہاں سے آئی ہے اور اس کا نام کیا ہے' سب ہی اسے "کالی" کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ کالی تھی بھی بہت!۔۔۔۔ جیسے الٹا توا۔ خدوخال بھی اچھے نہیں تھے۔ موٹے اور کالے ہونٹ' چھوٹی چھوٹی آنکھیں' پھولے ہوئے نکسورے۔ پیشانی پر بال تھے جن کی وجہ سے اس کی پیشانی تنگ نظر آتی تھی۔ اس کو گھر میں ہر ایک دھتکارتا رہتا تھا' اٹھتے بیٹھتے لعنت ملامت کرتا رہتا تھا مگر وہ ہمیشہ خاموش رہتی تھی جیسے اس نے بات کرنا سیکھا ہی نہ ہو جیسے اس میں احساس موجود ہی نہ ہو' جیسے وہ ریل کا کالا لوہے کا انجن ہو جو زندگی کی پٹڑیوں پر چل رہا ہو..... وہ ہمیشہ لال رنگ کے کپڑے پہنتی تھی جن پر اس کا کالا کالا رنگ چمکتا رہتا تھا۔ وہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتی تھی جس میں اس کے ہونٹوں کی کالک جھلکتی رہتی تھی۔ خدا جانے اسے تیز اور چبھتی ہوئی خوشبوئیں کیوں پسند تھیں اور وہ مٹھاس بھی زیادہ پسند کرتی تھی۔ اسے خود بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے اس کے ماں باپ کون ہیں۔ نام کے بارے میں اسے پورا یقین تھا کہ وہ "کالی" ہی ہے۔ "کالی" کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا نام ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اس کو وحید کی ماں نے بتایا تھا کہ جب وہ ایک چھوٹی سی بچی تھی تو ایک دن روتے ہوئے اس کے گھر میں چلی آئی تھی۔ وحید کی ماں کو اس کی روتی بسورتی صورت پر رحم آگیا تھا اس نے پیار سے دلاسہ دیتے ہوئے اس سے اس کے ماں باپ کا اتا پتہ پوچھا تھا لیکن کالی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا' وہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں کو ٹپپاتے ہوئے وحید کی ماں کو دیکھتی رہی تھی۔

وحید کی ماں نے کالی کے ماں باپ یا کسی دوسرے وارث کو بہت تلاش کروایا لیکن جب کالی کا کوئی وارث بننے کے لئے تیار نہ ہوا تو وحید کی ماں نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ بچپن سے ہی وحید کی ماں اور وحید کے سوا گھر کے تمام افراد اسے دھتکارتے رہتے تھے۔ وحید کی چھوٹی بہن تو اٹھتے بیٹھتے اس کی چٹکیاں بھرتی رہتی تھی' اس کا چوٹڈا اکھاڑتی رہتی تھی بعد

میں جب اس کی شادی ہو گئی تب کہیں جا کر کالی کی جان چھوٹی تھی۔ لیکن اب بھی جب وہ اپنے میکے آتی تھی تو کسی نہ کسی بہانے سے کالی کو ایسی مار لگاتی تھی کہ اس کی ہڈی ہڈی دکھنے لگتی تھی۔

وحید اور کالی دونوں ہم عمر تھے یا وحید ایک دو سال بڑا ہو گا۔ بچپن میں وحید کو کالی سے بہت پیار تھا۔ وہ سارا دن بیٹھا کالی کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا ایک پل کے لئے بھی کالی کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا لیکن بعد میں جیسے جیسے وحید بڑا ہوتا گیا وہ کالی کے ساتھ بات چیت کم کرتا گیا اور کالی بھی خاموشی سے گھر کا کام کاج کرتی رہی۔ رات کو جب وہ تھک کر چور ہو جاتی اور اپنے اکیلے کمرے میں چارپائی پر لیٹتی تو اس کو اپنا سارا بدن دکھتا ہوا محسوس ہوتا۔ اسے اپنے سینے میں بارود بھری معلوم ہوتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ اگر ایک مرتبہ وحید اس کے سینے میں بھری ہوئی اس بارود کو ماچس کی تیلی لگا دے تو یہ بارود پھٹ پڑے گی اور اس کا سارا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گا۔

ایک دن کالی نے سنا کہ وحید پڑھنے کے لئے کراچی جا رہا ہے۔ اس روز کالی اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ پلنگ پر الٹی پڑی روتی رہی اسے معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ پڑھی لکھی نہیں تھی کہ افسانوں اور ناولوں میں پڑھ کر محبت سیکھ لیتی نہ ہی اس نے کبھی کوئی کھیل دیکھا تھا۔ اسے صرف اتنا احساس تھا کہ اس کے اندر کوئی زخم کھل گیا ہے کوئی اس کے دل کو چھری سے چیر رہا ہے جیسے مچھلی یا بلے کو درمیان سے چیرا جاتا ہے۔

پورے ایک سال کے بعد جب وحید چھٹیاں گذارنے کے لئے گھر واپس آیا تو کالی کی نس نس میں خوشیوں کے گیت مچلنے لگے۔ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ بیدار ہو گیا ایک عجیب اور انجانہ جذبہ اس کے دل میں گدگدیاں کرنے لگا اس روز بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہ آئی۔ اسے ڈر لگنے لگا تھا کہ کہیں کوئی سینے میں اٹھنے والی گدگدیوں کے ردعمل کا اس کے چہرے سے اندازہ نہ لگا لے۔ وہ پیٹ کے درد کا بہانہ کر کے تکیئے کو سینے سے لگائے پلنگ پر کروٹیں بدلتی رہی۔ ساری رات وہ بہت عجیب اور بہت ہی ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی۔ کبھی اس نے دیکھا کہ وہ ایک اونچے بانس کے آخری سرے پر بیٹھی ہوا میں جھول رہی ہے اور زمین پر گرنے کے خوف سے شور مچا رہی ہے۔ کبھی اس نے دیکھا کہ اس کے چاروں طرف کالے ناگ پھن اٹھائے اس کے بدن پر رینگ رہے ہیں۔ صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی تو اس کا عضو عضو دکھ رہا تھا۔ صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا' لال رنگ کا جوڑا پہنا'

ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی اور سارے بدن کو تیز اور چبھتی ہوئی خوشبو میں بسایا۔ اس کے بعد اس نے چائے تیار کی۔ گھر کے تمام لوگوں کو چائے پلانے کے بعد' وہ بڑے اہتمام سے وحید کے لئے چائے لے کر چلی۔ اس کو خبر تھی کہ وحید چائے میں شکر بہت کم پیتا ہے۔ اس کے باوجود اس نے چائے میں بہت زیادہ شکر ڈالی اور لرزتے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ وحید کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کے اندر ایک طوفان آیا ہوا تھا جس طوفان میں اس کا وجود ایک سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا جب وہ وحید کے پلنگ کے پاس پہنچ گئی تو اس نے ٹھہر کر وحید کے چہرے کو دیکھنا شروع کیا۔ ایک سال کے اس مختصر سے عرصے میں وحید کتنا خوبصورت اور کیسا وجیہہ جوان بن گیا تھا۔ وہ دل تھام کر وحید کو پکارنا چاہتی تھی مگر آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔ آخر وہ آگے بڑھی اور اپنی کالی اور بدصورت انگلیوں سے وحید کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی وحید نے نیند سے بوجھل آنکھوں سے کالی کی طرف دیکھا پھر ایک دم آنکھیں کھول دیں۔

تجھ سے کس نے کہا تھا کہ "تو صبح صبح اپنی صورت دکھانے کے لئے آ جا۔ آج صبح تیری صورت دیکھی ہے خدا جانے کھانا بھی نصیب ہو گا یا نہیں....."

کالی کو جیسے کسی نے ساتویں آسمان سے دھکا دے کر پاتال میں گرا دیا۔ اس کے سینے کا طوفان یکلخت تھم گیا اور اس کے اندر ایسی خاموشی پھیل گئی کہ اسے دل کے دھڑکنے کی آواز یوں لگے جیسے کوئی پہاڑوں میں پتھر توڑ رہا ہو۔ اندر کے دل کے جلنے والے محبت کے الاؤ کے پر پانی کا مٹکا الٹ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ کمرے میں واپس آ کر وہ آئینے میں اپنے کالے ہونٹوں' چھوٹی چھوٹی آنکھوں' پھیلے ہوئے نکسوروں اور کالے رنگ کو دیکھنے لگی۔ اس نے سوچا اگر وہ کالی نہ ہوتی تو اس کے خدوخال اتنے بدصورت نظر نہ آتے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ باورچی خانے کے بے نوک چاقو سے اپنے چہرے کی ساری کالونچ کھرچ کر پھینک دے اور اندر سے اس کا لال لال جیتا جاگتا لہو جیسا رنگ نکل آئے۔ اس دن کے بعد سے کالی نے سرخ کپڑے پہننا' لپ اسٹک' اور خوشبو لگانا بالکل چھوڑ دیا۔ لیکن پھر جب وحید کی شادی ہوئی تو نہا دھو کر اس نے اپنا لال جوڑا پہنا۔ لپ اسٹک اور خوشبو لگائی اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ کتنے ہی دنوں سے اس نے بالوں میں کنگھی نہیں کی تھی۔ اس نے لپک اسٹک ہی لگائی تھی نہ لال رنگ کے کپڑے پہنے تھے۔ بنا سنورا اور لال کپڑے پہنے ہوئے دیکھ کر وہ اپنے آپ کو دلہن تصور کرنے لگی۔ اس

کے کانوں میں شہنائیوں کا گریہ گونجنے لگا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر اس کے کالے کالے گالوں پر چمکنے لگے۔

وحید کی بیوی عائشہ بہت خوبصورت تھی جیسے کوہ قاف کی پری ہو۔ رنگ تو ایسا سفید جیسے دودھ۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی رگوں اور شریانوں میں لال خون نہیں' سفید دودھ دوڑ رہا ہو۔ جیسی صورت اچھی تھی ویسی ہی سیرت بھی بھلی تھی۔ عائشہ کو دیکھ کر کالی کو اپنا رنگ زیادہ کالا نظر آتا تھا۔ عائشہ کو کالی بہت اچھی لگتی تھی۔ اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ اور بہت پیار سے پیش آتی تھی اگر گھر کا کوئی فرد کالی پر ناراض ہوتا تھا تو وہ اس کی حمایت کرتی تھی۔ ساری زندگی کالی کو لعنت ملامت نصیب ہوئی تھی سو پیار کے دو بولوں نے کالی کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ اس کے دل کو سکون نصیب ہو گیا۔ جیسے کسی ازل کے پیاسے کو امرت مل گیا ہو۔ جب وحید گھر میں نہیں ہوتا تھا تو عائشہ رات گئے تک کالی کے ساتھ وحید کی باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ کالی سے اپنا بدن دبواتی رہتی اور اس کو اپنی شادی اور وحید کے پیار کی باتیں بتاتی رہتی۔ بدن دباتے دباتے کالی کے کالے کالے اور بدصورت ہاتھ جب عائشہ کے نرم' ملائم اور پھیلتی ہوئی رانوں پر پہنچتے تو کالی کو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ' وہ کالی نہیں بلکہ کوئی دوسری کالی ہے۔ اس کے جذبات کا دھارا الٹا بہنے لگتا' نشیب سے فراز کی طرف' سمندر سے پہاڑوں کی سمت! اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ عائشہ کو اپنی مضبوط بانہوں میں لے کر اس طرح نچوڑ دے جیسے وہ شکنجے میں لیموں نچوڑتی تھی' مگر وہ پھر وہی کالی بن جاتی تھی جس کے جسم میں ادھوری اور ناآسودہ خواہشیں کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپتی اور پھڑکتی رہتی تھیں اس کا جی چاہتا تھا کہ کوئی اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے بدن کو گوند ڈالے جیسے وہ آٹا گوندا کرتی تھی اور اس کی تھکن ایک مرتبہ اپنے عروج کو پہنچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ کوئی اس کے سینے میں بھرے ہوئے بارود کو ماچس کی تیلی دکھا دے اور اس کا سارا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے!

ایک رات کالی عائشہ کا بدن دبا رہی تھی اور اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ سرماء کی رات تھی۔ باہر پالا پڑ رہا تھا۔ کمرے کو گرم رکھنے کے لئے کالی نے انگیٹھی عائشہ کے پلنگ کے نزدیک رکھ دی۔ بدن دبواتے دبواتے اور باتیں کرتے کرتے عائشہ کو نیند آ گئی۔ اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے' کالی آہستگی سے اٹھی اور عائشہ کو اچھی طرح لحاف سے ڈھک کر کمرے سے چلی آئی۔

رات کا خدا جانے کونسا پہر تھا جب عائشہ نے کروٹ بدلی اور اس کے گلے میں پڑے ہوئے نائلون کے دوپٹے کا آنچل انگیٹھی میں گرا اور عائشہ کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ عائشہ چونک کر بیدار ہوئی اور جلتے ہوئے کپڑوں سمیت شور مچاتی ہوئی باہر بھاگی۔ جب تک گھر کے افراد پہنچے اس کا کومل جسم آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ گھر کے تمام افراد نے مل جل کر آگ بجھائی اور عائشہ کو فوراً" اسپتال پہنچا دیا گیا۔

اس واقعے کا اثر گھر کے ہر فرد پر ہوا مگر کالی تو جیسے پاگل ہو گئی۔ دہشت زدہ لوگوں کی طرح ایک ایک کو تکتی تھی اور ایک سے عائشہ کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ ایک روز وحید کی ماں اسے اسپتال لے گئی۔ عائشہ کا پورا جسم' پورا چہرہ سفید پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا صرف اس کا منہ اور ناک کے نکسورے کھلے ہوئے تھے۔ عائشہ کو دیکھ کر کالی کو کفن میں لپٹے ہوئے کسی ایسے مردے کا خیال آیا جسے قبر میں اتارنے کے لئے لوگ تیار بیٹھے ہوں' کالی عائشہ کی طرف تیزی سے دوڑی مگر وحید کی ماں نے اسے پکڑ لیا۔ عائشہ نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ عائشہ نے اس کو دلاسہ دیا کہ وہ مری نہیں ہے صرف اس کے جسم پر دو تین زخم ہو گئے ہیں جو جلدی ہی ٹھیک ہو جائیں گے اور اس کے بعد وہ گھر آ جائے گی۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے سنا کہ عائشہ صحتیاب ہو کر گھر واپس آ رہی ہے۔ اس روز اس سے خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ اس نے سارے گھر کو صاف کر کے سجایا۔ وہ بہت خوش تھی مگر اس نے دیکھا کہ اس کے علاوہ گھر کا کوئی فرد خوش نہیں ہے۔ ہر ایک کے چہرے پر پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

گھر کا سارا کام کاج نمٹانے کے بعد وہ عائشہ کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔ آخر شام کو گھر کے سبھی افراد عائشہ کو واپس لے آئے۔ عائشہ کو ایک طرف سے وحید کی ماں نے پکڑا ہوا تھا اور دوسری طرف سے وحید نے۔ عائشہ کو دیکھ کر کالی کود کر اس کی طرف بڑھی پھر یکلخت ٹھہر گئی اور ٹکٹکی لگا کر عائشہ کی طرف دیکھنے لگی----

عائشہ کا سارا حسن جل چکا تھا۔ اس کے ماتھے کے بال اور پلکیں اور بھنویں بھی جل گئیں تھیں۔ اس کے چہرے پر سیاہ و سفید داغ عجیب ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ جیسے شمشان میں کوئی مردہ جلتے جلتے چتا میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ کالی پلک جھپکائے بغیر عائشہ کو دیکھتی رہی اس کے بعد وہ پاگلوں کی طرح ایک طرف رکھی ہوئی سنگھار میز کے آئینے میں اپنے موٹے

اور کالے ہونٹوں' چھوٹی چھوٹی آنکھوں' پھیلے ہوئے نکسوروں اور الٹے توے جیسی کالی رنگت کو دیکھنے لگی۔ اس نے پلٹ کر عائشہ کے بھیانک چہرے کی طرف دیکھا' پھر اس نے وحید کی طرف دیکھا اور قہقہے لگانے لگی' زور دار قہقہے! جیسے وہ اپنے جسم کی پوری طاقت کے ساتھ قہقہے لگا رہی ہو۔ جیسے اس کے سینے میں بھری ہوئی بارود کو کسی نے جلتی ہوئی تیلی دکھا دی ہو' اس کا سارا وجود ٹھنڈا ہو گیا---- وہ پاگلوں کی طرح قہقہہ لگاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ وحید نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی ماں نے آرام سے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شاید عائشہ کے صدمہ سے بیچاری پاگل ہو گئی ہے!"

ناچو

اس ہوٹل میں زیادہ تر ناچنے والوں کی ٹولیاں آ کر ٹھہرا کرتی تھیں ان ٹولیوں میں ایک یا دو حسین چھوکرے ضرور ہوتے ہیں۔ بہت ہی حسین چھوکرے! ہوٹل کے عقبی حصہ میں میدان ہے جس میں کچی پکی چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تعمیر کی گئی ہیں' ان کوٹھڑیوں میں ہر وقت گھنگروؤں کی جھنکار ہوتی رہتی ہے۔ سروؤں کی بارش ہوتی ہے اور قہقہے برستے رہتے ہیں سر اور خوبصورتی کے پیاسے عاشقوں کا میلہ لگا رہتا ہے ناچنے والوں کی ہر ٹولی کسی دعوتمیں جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے اس ہوٹل میں ضرور قیام کرتی ہے جہاں رات گزارنے کے ساتھ ساتھ نئے چھوکروں کو گانے اور ناچنے کی تربیت بھی ملتی ہے ان ٹولیوں میں رانجھے فقیر کی ٹولی کی پورے علاقے میں دھوم تھی۔ یہ سب ناٹے کے سبب تھا جب سے رانجھے فقیر کو ناٹا ملا تھا تب سے اس کے پو بارہ ہو گئے تھے۔ شام ہو گئی تھی ہر ایک ٹولی ریاض میں مشغول الٹر ناچنے والوں کو ناچنے اور گانے کے گر سکھائے جا رہے تھے' ہاتھوں کو کیسے حرکت دی جائے' صدا کیسے لگائی جائے' جسم کو کیسے خم دیا جائے اور گھنگرو کس طرح چھنکائے جائیں..... اس وقت ہوٹل کے باہر ایک جیپ آ کر ٹھہری بوسکی کے پٹکے والے تین افراد اتر کر ہوٹل کے اندر آئے' دخل پر بیٹھے ہوئے سیٹھ سے کچھ پوچھا اور پھر سیٹھ کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے جیسے ہی استاد کالے کی نظر ان پر پڑی وہ ساز بند کر کے ان سے ملنے کے لئے بڑھا۔

"سائیں' آج کون سی خوشی میں راستہ بھول گئے ہیں؟" کالے نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا اور ایک ناچنے والے کو آواز دی۔ "بھورل۔ ادھر تو آ۔"

بھورل گھنگرو چھنکاتا اور بدن لہراتا گرو کے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضر ہو گیا۔ "بھورل تین چائے لے آ۔ دودھ پتی والی!"

"نہ نہ کالا تجھ سے کوئی تکلف نہیں ہے۔" ان تینوں میں سے ایک نے جس کی پگڑی

میں طرہ لگا ہوا تھا کہا "تجھ سے کوئی غیریت تو ہے نہیں مگر ابھی کچھ جلدی ہے' ذبح کے جانور لینے ہیں' چاول خریدنے ہیں۔ شامیانے والے سے بات کرنی ہے .... چائے پھر کبھی۔ بھورل سے بھی ملاقات رہے گی!" اس نے جیب میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر بھورل کی ہتھیلی پر رکھ دیا' بھورل نے اپنی ہتھیلی پر سے نوٹ اٹھایا تو طرہ والے شخص نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور کالے سے کہنے لگا۔

"یار کالا۔ رانجھے فقیر کی کوٹھڑی کون سی ہے؟ کالے کا رنگ اڑ گیا مگر اس نے جواب دیا "استاد رانجھے والا نا؟ وہ سامنے چوتھے نمبر والی کوٹھڑی میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

"اچھا کالا۔ اب اجازت۔"

"چائے تو....."

"چائے پھر کسی پھیرے پر..... اچھا سوہنا سائیں!" اس نے بھورل کا ہاتھ زور سے دبایا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

رانجھے کی ٹولی گانے میں لگی ہوئی تھی اس کے سامنے بیٹھا ناٹا گانے کا ریاض کر رہا تھا۔ ان تینوں افراد کو کمرے میں آتے دیکھا تو رانجھے نے ساز بند کیا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا "رئیس بلوچ خاں۔ مولا کا لاکھ شکر ہے" رانجھے کو طرے والے شخص نے اپنی طرف کھینچ کر سینے سے لگایا---- خیر خیریت کے بعد گفتگو اصل مقصد کی طرف آئی۔

"بس رانجھے تجھے تو معلوم ہی ہے کہ مجھے تیرے سوا کسی کا راگ پسند ہی نہیں آتا ہے کل شام اپنے رئیس احمد خاں کے بیٹے کی شادی ہے رئیس نے تیری ذمہ داری میرے سپرد کی ہے سو میں حاضر ہو گیا ہوں باقی سب خیر ہے!"

رانجھا کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہا ہے : مجھے خبر ہے کہ علی پور والوں نے تجھے بلاوا نہیں بھیجا تھا مگر اس وقت نہ رئیس تھانہ میں تھا---- لوفر چھوکروں کو کیا خبر عزت کی---- انہیں کیا خبر تعلقات کی---- اب تمام میری ذمہ داری ہے تو کوئی فکر ہی نہ کر" طرہ والے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا "لے آٹھ سو روپے کرائے کے اور یہ شادی کا دعوت نامہ۔"

اس دوران ناٹے نے ان کے سامنے چائے پیش کی اور وہ تینوں صدقے صدقے! کرتے ہوئے چائے کی چسکیاں لینے لگے۔

"میں بلاؤں اور رانجھا نہ آئے" طرے والے نے رانجھے کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے

کہا۔ اس کے بعد اس نے سو روپیہ کا نوٹ اپنی جیب سے نکال کر ناٹے کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "اچھا سوہنے! صبح شام میں سجنوں سے ملاقات ہو گی" اس کے بعد وہ چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد رانجھا سوچ میں پڑ گیا پہلے بھی وہ علی پور گیا تھا۔ اس وقت اس کے ناچو کو کوئی اٹھا لے گیا تھا بلوچ خاں اور رئیس کی خوشامد کرنے پر مہینے بھر بعد ناچو واپس ملا تھا وہ دن اور آج کا دن بہت سی دعوتیں ملیں مگر رانجھے کو علی پور نہ جانا تھا نہ گیا اس کو رئیس کی تو پرواہ نہیں تھی مگر بلوچ خاں سے تعلقات اچھے تھے بلوچ خاں بھی اس کا بہت خیال رکھتا تھا کوئی کام کاج ہو یا نہ ہو رانجھے سے ملاقات ہوتی تھی تو سو یا پچاس روپیہ کا نوٹ ضرور اس کی جیب میں پڑا ہوتا تھا چائے پانی کے لئے بلوچ خاں اچھی صورتوں کا شیدائی تھا اور رانجھا پیسے کا پجاری! اور اس طرح ان دونوں کی آپس میں نبھ رہی تھی وہ نیا نیا چھوکرا پھنساتا تھا اور بوہنی ہمیشہ بلوچ خاں سے ہی کراتا تھا کوئی وقت تھا کہ رئیس بھی رانجھے فقیر کے آگے ہاتھ باندھے بیٹھا رہتا تھا مگر علی پور والے واقعے کے بعد تو جیسے لوگوں کو اس کا نام یاد نہیں رہا تھا لیکن قسمت نے رانجھے کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ رانجھے کو ناٹا مل گیا اور اس کی قسمت ایک مرتبہ پھر جاگ گئی---- ناٹا---- اس کے حسن کی کیا تعریف کی جائے کاجل لگی سوہنی آنکھیں جس طرف اٹھاتا تھا قتل ہی کر دیتا تھا۔ ناچتا تھا تو بجلی سی گرتی تھی اور گاتا تھا تو یوں لگتا تھا جیسے کوئل کوک رہی ہو۔

رانجھے کو پریشان دیکھ کر ناٹے سے رہا نہ گیا۔

"استاد کیا بات ہے؟ اداس دکھائی دیتے ہو خیر تو ہے نا؟"

"اڑے بچہ' کیا بات پوچھتے ہو' علی پور جانے کو دل تو نہیں چاہتا پر بلوچ خاں کے مجھ پر احسان ہیں اس لئے انکار بھی نہیں کر سکتا خیر.....!"

شامیانہ کیا تھا' جیسے میلے میں دکھنی ہوٹل لگا ہوا ہو۔ پورے اوطاق میں شامیانہ لگا ہوا تھا گانا سننے کے علاوہ اگر کوئی بیٹھا صرف شامیانے کی سجاوٹ ہی دیکھتا رہے تو اسے نیند نہ آئے۔ پہلے تو ناچنے والوں کے لئے اسٹیج نہیں بنایا جاتا تھا مگر یہاں تو اسٹیج تھا خاص ناٹے کے لئے کاغذ کاٹ کر اسے اتنا خوبصورتی سے کسی ہنرمند کاریگر نے سجایا تھا کہ دیکھنے والا انگلیاں دانتوں تلے دبا لیتا تھا مرکزی دروازے پر بہترین کام کیا گیا تھا مرکزی دروازے کے پاس ہی بیٹھا ہوا ریکارڈنگ والا فرمائش پر مختلف ریکارڈ بجا رہا تھا' عابدہ پروین' جلال چانڈیو' چاکر

چانڈیو..... شامیانے کے ایک طرف ایک کمرہ علیحدہ سے سجایا گیا تھا۔ جہاں پر رانجھے کی ٹولی آ کر اتری تھی شامیانے میں آج رات صرف ناٹے کا سکہ ہی چلے گا۔ کچھ نے تو اسے پہلے بھی دیکھا تھا لیکن جنہیں پہلے یہ موقع نہیں ملا تھا وہ وقفے وقفے سے کمرے کے آگے چکر لگا رہے تھے۔

کھانا ختم ہوا تمام آدمی شامیانے میں بچھائے ہوئے بستروں پر آ کر بیٹھ گئے پہلے تو لیرے کو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا مگر آج وہ بھی کپڑوں پر درباری عطر کی پوری شیشی الٹ آیا غا شلوار کا پائنچا پنڈلیوں تک اوپر اٹھایا ہوا تھا سبھی کا "ماما" کہہ کر استقبال کر رہا تھا اور پانی پلا رہا تھا جیسے ہی کسی نے پانی میں طلب کیا یا اسے پکارا وہ فوراً" اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور پانی کا گلاس دیتے ہوئے بولا "بھر کر دے میرے مامے کو---- پیو میرے ماما" اور اگر ی وقت کوئی دوسرا پکارتا تو وہیں سے جواب دیتا "آیا ماما آیا" اور دوسرے ہی لمحے پکارنے الے کے سامنے موجود ہوتا۔ مطلب تھا ہنسی مذاق قہقہہ---- کسی کو پان کسی کو سگریٹ۔ نے والوں میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کے پاس پان سگریٹ کی کمی تھی جن کے پاس ن تھے آج رات ان کی چاندی تھی پورے شامیانے میں بلوچ خاں زمین سے کوئی ایک فٹ ونچا رہا تھا رئیس بھی ہر آنے والے مہمان کا استقبال کر رہا تھا اور کام کرنے والوں کو ایتیں بھی دیتا جا رہا تھا کہ کسی کو شکایت نہ ہونے پائے۔ شامیانے کے ایک کونے میں کھسر سر ہو رہی تھی۔

"درایا پتہ چلا ہے کہ ناٹا بھی آیا ہے گیدڑ کی موت آتی ہے تو شہر کی طرف جاتا ہے وڑنا تو بلوچوں والی شادی میں بھی نہیں تھا مگر بلوچ زور آور لوگ ہیں' غصہ بڑھ گیا ہوتا' رساتھی بھی نہیں تھے۔ سوبھا' بات سن تو کہیں ساتھ مت چھوڑ جانا صبح بلوچ خاں والے ں بنائیں گے کہ پٹکا باندھ کر سوبھا اور درایا بھی گئے تھے ناٹے کو لینے مگر آئے خالی ہاتھ۔ چھوکرے ہم پر ہنسیں گے۔ اگر میں آج خالی ہاتھ واپس گیا تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں ں گا۔"

"چھوڑو ایسا کیسے ہو سکتا ہے درایا! یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ بدلہ لینا ہے اور ڈنکے چوٹ لینا ہے۔ بلوچ خاں پگڑی اچھالنا چاہتا ہے اور وہ بھی سوبھا اور درایا کی! پھر تو ہمیں یاں پہن کر عورتوں میں جا کر بیٹھ جانا چاہئے۔ اس بڈھے کھوسٹ کو دیکھ لیں گے' جیسے نے پینہ ہی نہیں دیا تھا' بیگار میں بلایا تھا۔"

"خیر اب چھوڑ ان باتوں کو' دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں پھر یہ سامنے جو مونگ بیٹھا ہے بڑا ہی چغل خور ہے۔ دونوں طرف لگاتا بجھاتا رہتا ہے اب سر جھکائے بیٹھا ہے۔"

"اس کے باپ کو بھی جانتا ہوں۔ دیکھتے نہیں ہو کہ دوسروں کے کام میں بھی مونچھوں پر تاؤ دیئے پھرتا ہے جیسے اسی کے بیٹے کی شادی ہے تم صرف مکڑی کو آ جانے دو پھر بیٹھ کر سوبھا کا کام دیکھنا۔"

"آدمی بھیجا ہے؟"

"ہاں ناچو بھیجا ہے۔"

شامیانے کے دوسرے گوشے میں ہونے والی گفتگو ماما ناٹے کی تو بات ہی مت پوچھو۔"

"بس ماما بس۔ گویا درد نہ رکا۔ جیسا حسن---- ویسی ہی ادائیں ہیں کیا روپ ہے کیا غرور ہے۔ کیا مسکراتا ہے۔ اللہ اللہ ماما۔ قدرت نے بھی فرصت میں بنایا ہے ناٹے کو!"

"اڑے ہاں بس کرو بس!" دوسرے نے دہائی دی "قسم خدا کی اپنی بکری بیچ کر آیا ہوں اور بکری بھی وہ جو پورے ریوڑ میں منتخب تھی۔"

اڑے ہاں باتیں کرتا ہے ناٹے کے لئے بکری بیچنا بھی کوئی بات ہے۔ ماما یہاں تو چاکر کلوٹی کے بیلوں جیسے بیل بیچنے پڑے ہیں میں تو بیلوں کی جوڑی بیچ کر شامیانے میں آ کر بیٹھا ہوں" تیسرے نے کہا۔

"واہ ماما۔ قدر والے ہو۔ ناٹے پر ہیں جوڑیاں قربان۔ اس کی تو نظر پر لاکھوں قربان! اپنے پاس تو بیل تھے نہیں مگر زمیندار کے پاس دل مار کر بیٹھا رہا اور کہا کہ سائیں جب تک پانچ سو روپیہ نہیں دیں گے میں اٹھوں گا نہیں" چوتھا بولا۔

بلوچ خاں نے ریکارڈنگ کرنے والے کے پاس آ کر مائیک پر اعلان کیا۔

"ہیلو ہیلو---- میرے دوستو اب انتظار ختم ہونے والا ہے آپ کی پسند____ ناٹا اسٹیج پر آ رہا ہے۔" اعلان سنتے ہی سب کی نگاہیں اسٹیج پر جم گئیں اور پھر ان کا انتظار ختم ہو گیا۔ رانجھے کی ٹولی اسٹیج پر پہنچ چکی تھی مگر ناٹے کی بجائے لوگوں کو اسٹیج پر ایک لڑکی دکھائی دی جس کے بال پشت پر پڑے ہوئے تھے اور دو چوٹیاں سامنے اس طرح ڈالی ہوئی تھیں جیسے زہریلے ناگ پھن اٹھائے بیٹھے ہوں باجے والے کا ہاتھ حرکت کرنے لگا' طبلے والے کی انگلیاں چلیں اور سر لگنے شروع ہوئے' سروں کے ساتھ ہی اسٹیج پر موجود پتلی کے بدن میں جان پڑنے لگی ٹھیک اس وقت ایک شخص اسٹیج کی طرف آیا اور اس پتلی کے سامنے ہاتھ

باندھ کر کہنے لگا "سوہنا' پانچ منٹ ٹھہرو' جب تک درایا آ جائے یہ کہہ کر وہ شخص اس طرف کھسک گیا جیسے مغل شہنشاہ کا کوئی غلام کوئی بات کہلوا کے قدموں پلٹ جاتا ہو گا۔

پھر شہنائیوں اور ڈھولک کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی شامیانے میں در آئی آگے پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا تھا جس کے سر پر سہرا بندھا ہوا تھا ادھر ادھر دوسرے لوگ تھے جو پیسہ لٹاتے ہوئے دولہا کے ساتھ آ رہے تھے۔ پھر یہ پورا مجمع شامیانے میں آ گیا ایک خاص جگہ پر جو اسٹیج کے قریب تھی۔ ریشمی گدے پر ایک شاندار رلی بچھائی گئی تھی دولہا اس رلی پر آ کر بیٹھ گیا۔ ساز پھر شروع ہوا گھنگروؤں کی جھنکار پر دولہا کے پاس بیٹھے ہوئے بلوچ خاں کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان پھنسا ہوا پچاس روپیہ کا نوٹ جیسے اپنے مالک سے کہہ رہا تھا' چھوڑ کہ میں محبوب کے ہاتھوں میں جاؤں تیرے ہاتھ سخت ہیں دوسرے ہی لمحے دولہا کے ہاتھ میں سو روپیہ کا نوٹ دکھائی دے رہا تھا ناٹے نے دولہا کے ہاتھ سے نوٹ لیا اور شامیانے میں نظر ڈالی ہر طرف نوٹ ہی نوٹ نظر آ رہے تھے۔ وہ چھم چھم کرتا ہر شخص کے پاس گیا اور باری باری سب سے پیسے لیتا رہا مختلف آوازیں تھیں' ہائے ہائے' ظالم جلا کر راکھ کر دیا۔ قتل کر دیا۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ اللہ صدقے صدقے' واہ سوہنا واہ' پیسے دیتے ہوئے کسی نے ناٹے کے رخسار پر چونٹی بھر لی اور کسی نے اپنے ساتھی کی گال پر پیسے رکھ دیئے' پیسے اٹھاتے وقت ناٹا اس کے گال کو زور سے نوچتا تو فرط مسرت سے اس کے بدن میں سرسراہٹ سی ہونے لگتی۔ کسی نے ناٹے کی ران پر ہاتھ لگایا تو کوئی اس کے کپڑے پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچتا وہ مسکراتا سب ہی سے پیسے لیتا جاتا تھا درمیان میں پیسے دینے پر دو ایک بار جھگڑا بھی ہوا مگر رئیس نے اٹھ کر ہر مرتبہ جھگڑے کو فوراً ہی ختم کرا دیا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ ناٹا اپنی مدھر آواز میں "سر رانو" الاپ رہا تھا شامیانے میں اب وہ سرگرمی باقی نہیں رہی تھی جو جہاں تھا وہیں خاموش بیٹھا تھا کئی تو پیسے دے دے کر خالی ہو چکے تھے اور اب اپنا تولیہ کاندھے پر ڈال کر شرمساری سے سر جھکائے رخصت ہو چکے تھے۔ کئی کنگال ہونے کے باوجود ابھی تک آنکھیں سینک رہے تھے ریکارڈنگ والی جگہ پر شروع میں ہاریوں کی رونق تھی اب وہ رونق خدا جانے کہاں رخصت ہو چکی تھی وہ سب نشے میں دھت تھے زیادہ پینے اور دیر تک جاگنے کے بعد اب وہ سب ایک دوسرے کے اوپر ڑھک چکے تھے۔ بلوچ خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسٹیج کے ایک طرف بیٹھا ہوا تھا طبلہ

نواز کو بھی نیند آ رہی تھی اس کی آنکھ جھپکتی تو رانجھا اسے کہنی مار کر پھر سے جاگنے پر مجبور کر دیتا ناٹا اب دوزانو بیٹھا "سر رانو" میں سے شاہ (عبداللطیف بھٹائی) کے اشعار پڑھ رہا تھا اسی وقت شامیانے کے مرکزی دروازے کے پاس سے کسی نے ہانک لگائی سوہنا سائیں ادھر " ناٹا گھنگرو پھنکارتا۔ راستے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے پیسے لیتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگا جیسے ہی اس نے پیسے لینے کے لئے ہاتھ پھیلایا' ایک شخص نے اسے کھینچ کر اپنی آغوش میں لے لیا' ابھی اس شخص نے گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے چھلانگ لگائی ہی تھی کہ اسٹیج کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے گولی چلائی گھوڑے والا تو گھوڑا دوڑاتا ہوا غائب ہو گیا مگر لوگوں نے اس جگہ پر ایک ناچو کی لاش گرتے ہوئے دیکھی۔

غیر ملکی ادب
البرٹو مورادویا

حکم کا غلام

میں ایک بینک میں کام کرتا تھا۔ مگر جب مجھے اسٹاف کی تنظیم نو کے سلسلے میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔

مجھے احکامات بجا لانے کی عادت تھی۔ یہ احکامات ہر قسم کے ہوتے تھے کبھی گھنٹی کی صورت میں کبھی سرخ و سبز روشنیوں کی صورت، کبھی بینک آنے والوں کی درخواستوں کی صورت میں اور کبھی چھوٹے چھوٹے بینک کے باہر کے کاموں کی صورت میں۔ اور اب یکلخت کوئی حکم باقی نہ بچا تھا۔ کرنے کے لئے کام ہی نہیں رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ میں بیکار لیٹا ہوا خلا میں گھورتا رہوں۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ میری بات کو غلط طور پر سمجھا جائے۔ میرے پاس کرنے کے لئے کام نہیں تھا مگر اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں بے روزگار تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی حکم دینے والا نہیں تھا، ممکن ہے کچھ لوگوں کو ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نظر نہ آئے مگر ان میں فرق موجود ہے۔ کم از کم میرے لئے بہت بڑا فرق موجود ہے۔

دیکھئے میں وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہوں چند روز تک تو میں نے اپنے لئے کوئی روزگار تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جب ایک روز میں بستر میں دراز تھا اور اپنے آپ کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ جیسے میں کچھ سوچ رہا ہوں، میں حقیقت میں سو رہا تھا مگر اس وقت میری بیوی کی آواز نے مجھے بستر سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سخت برہمی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔ "تم اس وقت تک بستر میں پڑے ہوئے کیا کر رہے ہو۔ کچھ پتہ ہے کیا وقت ہو گیا ہے۔ تمہیں تو شرم بھی نہیں آتی۔ چلو اٹھو، غسل کرو اور اتنے میں لباس تبدیل کروں تم اپنے آپ کو مفید ثابت کرو اور ناشتہ تیار کر لو۔"

یہ الفاظ بظاہر بہت ہی عام اور غیر اہم تھے مگر مجھ پر ان کا قطعی مختلف اثر ہوا میں نے اپنے آپ سے کہا۔

"چلو اٹھو' کپڑے پہنو' اپنے آپ کو مفید بناؤ اور ناشتہ تیار کرو..... مگر یہ احکامات ہیں۔ حقیقی اور غیر مبہم۔ یہ احکامات بالکل ایسے ہی تھے جیسے مجھے بینک کی ملازمت کے دوران ملا کرتے تھے۔ یہ احکامات ہیں!" اور اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ ان احکامات کی تحریک پر توانائی کی ایک لہر میرے سر سے چلی اور میری ٹانگوں تک اترتی چلی آئی۔ فوراً" میں نے کمبل کو اتار پھینکا اپنے پاؤں فرش پر رکھے' ہاتھ روم کی طرف بڑھا' دروازہ کھولا' اندر گیا اور شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ میں نے وہ سب کچھ کیا جس کا مجھے حکم دیا گیا تھا۔

اس کے بعد میں نے کپڑے پہنے۔ مجھے احساس ہوا کہ بظاہر یہ حکم بہت سادہ نظر آتے تھے۔ مگر ان میں سے ہر حکم میں کئی اور احکامات پوشیدہ تھے۔ مثال کے طور پر اس سادہ سے جملے پر غور کیجئے۔ "ناشتہ تیار کر لو۔" اس ایک جملے کا مطلب کیا ہوا؟ نمبر ایک کچن میں جاؤ' نمبر دو گیس کا چولہا جلاؤ' نمبر تین کافی اور پانی کو کافی مشین میں ڈالو' نمبر چار ڈبل روٹی کاٹو' نمبر پانچ چائے آگ پر رکھو اور روٹی کے سلائس کو جالی پر' نمبر چھ کپ' شکر دانی' اور مکھن وغیرہ رکھ کر ٹرے تیار کرو' نمبر سات' کافی کے برتن اور ٹوسٹ کو بھی ٹرے میں منتقل کرو۔ نمبر آٹھ اب ٹرے کو اٹھا کر خواب گاہ میں جاؤ اور اسے بستر پر رکھ دو۔ گویا یہ احکامات کا ایک سلسلہ ہے۔ اور اگر اس وقت جب میری بیوی احکامات جاری کر رہی تھی۔ میں نے ذرا بھی بے توجہی سے کام لیا ہوتا تو اب میرے لئے ان کی صحیح تفصیلات کے ساتھ انجام دینا ناممکن ہو جاتا۔ یہ ایک خاصا پیچیدہ سلسلہ ہے۔ اس کے علاوہ ان دوسرے درجے کے احکامات میں تیسرے درجے کے احکامات بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ٹرے میں مکھن رکھنے کے کام میں مکھن کو فرج سے نکالنا۔ اس کا کاغذ علیحدہ کرنا۔ اسے چھری سے کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنا اور پھر ان ٹکڑوں کو خوب صورتی سے ٹرے میں سجانا وغیرہ شامل ہیں ان تمام باتوں کا کیا مقصد ہوا؟ ان باتوں کا مقصد یہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر میرا وجود کار آمد ہو گیا۔ مجھے کرنے کے لئے کچھ کام مل گیا اور بینک سے نکالے جانے کے بعد ان بیکاری کے تمام ایام کے بعد مجھے از سرنو احکامات ملنے شروع ہو گئے۔ اب میں ایک کامل شخص تھا۔ کیونکہ میں ایک مرتبہ پھر عمل پیرا تھا۔

میری بیوی اسٹینو گرافر تھی اور ایک دفتر میں کام کرتی تھی۔ اس صبح اس نے مجھے کوئی حکم نہ دیا۔ اس نے دفتر جانے کی جلدی میں' تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ "دیکھو ٹیلیفون کال کا خیال رکھنا اور ہاں نام لکھنا مت بھولنا۔"

میرے لئے یہ کافی تھا۔ میں ٹیلیفون کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور کال کا انتظار کرنے لگا۔ میں کسی چیز کا انتظار کر رہا تھا؟ ٹیلیفون کی گھنٹی کا جس کا میری بیوی نے حکم دیا تھا۔ ان ٹیلیفون کرنے والوں کا شکریہ کہ میرا وجود بیس چالیس یا ساٹھ سیکنڈ کے لئے کار آمد ہو جاتا یعنی گھنٹے دو گھنٹے کی بیکاری اور جمود کے بعد۔ مگر میرے خیال میں یہ بھی بڑی بات ہے۔ اس کے علاوہ اگر ٹیلیفون کال ایک سے زائد ہوئیں تو میرا وجود ایک کردار کا روپ دھارے گا جو مسلسل اور باقاعدہ ہو گا۔ میں نے ان باتوں پر غور کیا اور پھر نگاہ اٹھا کر اپنے سامنے دیکھا جہاں ایک چھوٹی میز پر میری بیوی کا ٹائپ رائٹر رکھا ہوا تھا۔ اگر میری بیوی کے پاس زیادہ کام ہوتا تھا تو وہ شام کو اس مشین پر کام کرتی تھی پھر میری نگاہ ٹائپ رائٹر کی کلید پر گئی اور مجھے خیال آیا کہ وہ الفاظ کے کس قدر احکامات سے لبریز ہیں مگر انہیں بھی میری بیوی کی انگلیوں کے لمس کی ضرورت تھی ورنہ وہ گونگی اور ساکت تھیں۔ یہ سوچ کر مجھے احساس ہوا کہ اس مشین اور میرے درمیان بھائی چارے کا ایک رشتہ موجود ہے۔ میں خود بھی تو بیوی کی عدم موجودگی میں اس ٹائپ رائٹر کی طرح بے حس و حرکت اور ناکارہ تھا۔ وہ جب موجود ہوتی تھی تو مجھ میں بھی جان پڑ جاتی تھی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ میں بھائی ہوں اور یہ مشین میری بہن ہے بلکہ دیکھا جائے تو مشین مجھ سے زیادہ جاندار تھی کیونکہ اس کی اپنی ایک آواز تو تھی، تیز اور گونجتی ہوئی جبکہ میں تو بیشتر اوقات خاموش ہی رہتا تھا۔

اس روز حالانکہ ٹیلیفون کی گھنٹی بھی نہیں بجی مگر مجھے ادراک ہوا کہ اگر چاہے تو انسان کسی بھی وقت احکامات حاصل کر سکتا ہے۔ صرف توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ اب یہ ایک حکم ہے کہ اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھو۔ جاؤ اور دروازہ کھول کر دیکھو کہ کون آیا ہے۔ دو عورتیں باہر صحن میں لڑ رہی ہیں۔ اب یہ بھی ایک حکم ہے۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھو کہ کیا ماجرا ہے! کچن میں پانی ٹپک رہا ہے یہ حکم ہے کہ جا کر نلکا بند کر دو ایسے کتنے ہی احکامات ہو سکتے ہیں۔

قدرتی طور پر میں خوش تھا کہ میں نے ضرورت کو ایک خوبی بنا لیا تھا مگر کوئی محض اس لئے تو زندہ نہیں رہ سکتا کہ وہ ٹپکتے ہوئے نلکے کو بند کر دے اس سے زیادہ اہم کام درکار ہیں۔ زیادہ اہم بھی اور زیادہ مسلسل بھی۔ اگر نلکے ہی بند کرنے ہوں تو کم از کم سو نلکے تو ہوں جنہیں دس دس منٹ کے وقفے کے بعد بند کرنا ہو مگر بہرحال یہ بھی ایک مصروفیت تو تھی اور جب سب کچھ کہہ اور کر لیا گیا ہو تو کم از کم یہ مصروفیت ٹائپ رائٹر کے مقابلے میں

تو بہتر تھی جو میری بیوی کے گھر واپس آنے تک ساکت و جامد پڑا رہتا ہے۔

پھر غالباً میری بیوی کو اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ اس کو میری زندگی میں وہ مقام حاصل ہو چکا ہے جو کبھی میرے بینک منیجر کو تھا۔ کیونکہ اب اس کے احکامات بہت تہہ در تہہ اور مختصر ہوتے تھے۔

"تم قطعی ناکارہ ہو' ایک عادی آوارہ گرد بھک ننگے' کبھی تو کوئی کام کر لیا کرو۔ چلو گھر کی صفائی ہی کر لو۔ کپڑے دھو ڈالو۔ میری قمیض پر استری کر دو۔ مارکیٹ چلے جاؤ' فلیٹ کی حالت کا ہی خیال کر لو..... وغیرہ وغیرہ۔

میں نے گھر کی صفائی کرنے والے اور کپڑے دھونے والی جز وقتی ملازمہ کو بھی برطرف کر دیا۔ خیال یہ ہوتا تھا کہ مجھے یہ حکم دے کر وہ میری بے مصرف زندگی کی وجہ سے مجھے سزا دینا چاہتی ہے وہ چاہتی ہے کہ میں کوئی ملازمت ڈھونڈوں اور گھر کے لئے کچھ رقم لے کر آیا کروں۔ اسے بھی اس بات کا گمان بھی نہیں گزرا ہو گا کہ اس طرح وہ مجھے ایک عظیم مسرت فراہم کر رہی ہے۔

میں کیا کہہ رہا ہوں؟ عظیم مسرت! حقیقت میں وہ مجھے متحرک بنا رہی تھی۔ میرے وجود کا اثبات کر رہی تھی' صبح دفتر جانے سے قبل وہ جو احکامات جاری کرتی میں انہیں احتیاط سے لکھ لیتا اور دن بھر ان پر میکانکی پابندی کے ساتھ عمل کرتا۔ ان اوقات میں جب میرے پاس کوئی کام نہ ہوتا۔ مجھے یہ احساس زیادہ شدت سے ہوتا کہ میں اپنے وجود کے اثبات کے لئے زیادہ سے زیادہ اپنی بیوی کا دست نگر بنتا جا رہا ہوں اب صرف اسی کی ذات تھی جو مجھے اپنے پاؤں کو' اپنے ہاتھ کو اپنی انگلیوں کو حرکت دینے پر مجبور کر سکتی تھی اور تب میں نے اپنے دل میں شدید محبت کے جذبے کو محسوس کیا۔ اس جذبے میں احساس ممنونیت اور اعتماد بھی آمر تھا۔

کوئی سال بھر تک ہمارا یہی معمول برقرار رہا پھر کئی ایسی علامات ظاہر ہوئیں۔ جن سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہمارا یہ رشتہ جو میرے نزدیک تو انتہائی مثالی اور باضابطہ تھا شکست و ریخت کی زد میں ہے۔ یہ ایک ایسا ہی رشتہ تھا جو ایک ٹائپ رائٹر اور ٹائپسٹ کے درمیان ہوتا ہے مگر اب ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ یہ رشتہ اس تعلق میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا جو ایک کباڑیہ کو ایک مشین سے ہوتا ہے۔

شاید میری بیوی کو بھی اس کا علم ہو گیا تھا۔ اب مجھے احکامات کے ذریعے جھلسانے میں

سزا کا اتنا عنصر شامل نہیں ہوتا تھا جتنا اس تعاون کا جو وہ میرے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے میرے ساتھ کر رہی تھی یا شاید اب اسے کوئی اور مل گیا تھا جو مجھ سے زیادہ اس کے احکامات کو توجہ سے سنتا اور ان پر عمل کرتا تھا۔ بہرحال یہ حقیقت اٹل تھی کہ صبح گھر سے باہر جانے سے قبل وہ اب مجھے میرے فرائض نہیں بتاتی تھی یعنی یہ ہدایت نہیں دیتی تھی کہ اس روز مجھے کون کون سے کام کرنے ہیں۔ چنانچہ اب عموماً یہ ہونے لگا تھا کہ میں دن بھر اپنی ٹانگیں تہہ کئے اپنے مخصوص گوشے میں بے حس و حرکت پڑا رہتا اور خلا میں گھورتا رہتا۔ گویا میں انسان نہیں ایک ایسا گڈا تھا جس کی چابی اس کی پشت میں لگی ہوتی تھی۔ میری بیوی قابل ملامت جلدی میں دکھائی دیتی تھی۔ وہ مجھ سے بات کئے بغیر اپنا لباس تبدیل کرتی، صرف اپنے لئے کافی تیار کرتی اور پھر مجھے خدا حافظ کہے بغیر گھر سے باہر نکل جاتی۔ وہ سارا دن گھر سے باہر رہتی اور کبھی کبھی رات کو بھی واپس نہ آتی۔

اس دوران میں ٹیلی فون کالیں بھی آنا بند ہو گئیں۔ دروازے پر بھی اب دستک نہیں ہوتی تھی۔ میں گھر کی صفائی بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ اس کے حکم کی عدم موجودگی میں، میں تذبذب کا شکار رہتا تھا۔ جہاں تک کھانے پینے کا تعلق تھا تو جب معدے میں اینٹھن سی ہونے لگتی تو میں مجبور ہو جاتا اور یہ اینٹھن وہ واحد "کام تھا جو مجھے ملتا تھا۔"

جیسے جیسے وقت گذرتا جاتا تھا ہمارا گھر لاتوجہی اور اداسی کی آماجگاہ بنتا جاتا تھا، دروازے گندے، فرنیچر بکھرا ہوا بے ترتیب، کچن میں برتن بے دھلے، کاغذ کے ٹکڑے ہر سو بکھرے ہوئے، کپڑے کرسیوں پر اور بستر میلے دکھائی دیتے تھے۔ ظاہر ہے میری بیوی یہ سب کچھ دیکھتی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ اب اسے اس بے ترتیبی کی پرواہ نہیں رہی یا شاید اس ساری بدنظمی کے ذریعے وہ مجھے ایک ایسا پیغام دینا چاہتی تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اتوار کے دن وہ چند گھنٹوں کے لئے گھر میں موجود رہتی اور بہت ہی سرسری انداز سے فلیٹ کے دونوں کمروں کو ٹھیک ٹھاک کر دیتی۔

ایک روز جو صبح میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ لباس تبدیل کر چکی ہے اور باہر جانے کے لئے تیاری کر رہی ہے۔ اس کا سوٹ کیس بستر پر رکھا ہوا تھا اور وہ اس میں اپنی چیزیں رکھ رہی تھی۔ میں بستر پر لیٹا ہوا بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ وہ فلیٹ کے مختلف گوشوں اور اپنے سوٹ کیس کے درمیان مستقل چکر لگا رہی تھی اور اپنی چیزیں سمیٹ کر رکھ رہی تھی۔ آخر اس کی یہ مسلسل حرکت مجھے ایک حکم محسوس ہونے لگی۔ ایک ایسا حکم

جس میں یہ بات شامل تھی کہ میں اس سے معلوم کروں کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ میرے اندر کوئی چیز دھماکے سے پھٹ گئی۔ میرے ہونٹوں پر الفاظ آ گئے :

"یہ تم کیا کر رہی ہو----؟"

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا پھر میرے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی :

"ٹونی! وہ وقت آ چکا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ میں نے ہر طریقے سے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے مگر تم یہ ظاہر کرتے رہے کہ جیسے تم کچھ دیکھ ہی نہیں رہے ہو۔ چنانچہ میں اب مجبور ہوں کہ صاف صاف الفاظ میں بات کروں۔ ہماری شادی ناکام ہو چکی ہے۔ مجھے ایک ایسا آدمی مل گیا ہے جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ میں کوئی دو ماہ سے اس کے ساتھ رہ رہی ہوں اور اب میں یہاں حاضری دینے کے لئے بھی نہیں آ سکتی۔ تم نے تو اس کا مشاہدہ نہیں کیا مگر اس فلیٹ میں میرے چند پرانے کپڑے اور اس ٹائپ رائٹر کے علاوہ کوئی ایسی چیز باقی نہیں بچی ہے جس سے میرا تعلق ہو۔ مجھے امید ہے تم ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی میرے ساتھ ہمدردی اور احسان کا سلوک کرو گے میں جس آدمی کے ساتھ جا رہی ہوں وہ باہر سڑک پر میرا انتظار کر رہا ہے۔ مہربانی کر کے میرا یہ سوٹ کیس اور ٹائپ رائٹر نیچے گاڑی تک پہنچا دو۔ یہ آخری تکلیف ہے جو میں تمہیں دے رہی ہوں۔"

میں نے شدید درد محسوس کیا۔ ایک ایسا شدید درد کہ اس کی شدت سے مجھے محسوس ہوا کہ حکم کی صورت اختیار کرے گی۔ میں نے کہا!

"مگر میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔؟"

یہ حقیقت تھی۔ اس سے اگر حکم نہیں ملیں گے تو میرے وجود کا اثبات کیسے ہو گا۔ مگر اس نے میرے الفاظ کی اپنے طور پر توضیح کی :

"بدنصیبی ہے۔" اس نے کہا : "کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تمہارے بغیر بہت اچھی طرح زندہ رہ سکتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ تم خود کو کار آمد ثابت کرتے ہو مگر جب رشتہ شوہر اور بیوی کا ہو تو محض کار آمد ثابت کرنا کافی نہیں ہوتا۔ اس صورت میں انسان کو ضرورت بننا پڑتا ہے اور تم اب میری ضرورت نہیں ہو۔ میں تمہیں آسانی سے ویکیوم کلینر یا واشنگ مشین یا اس آلے سے تبدیل کر سکتی ہوں جو ٹیلی فون کال کا خود بخود جواب دیتا ہے مثلاً

اس پر بھی میں نے درد کے حکم پر عمل کرتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں جانے نہیں دوں گا----"

اس نے پختہ ارادے کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"چھوڑو! بچوں جیسی باتیں مت کرو۔ چلو اٹھو' کپڑے بدلو' ٹائپ رائٹر اٹھاؤ اور نیچے جا کر اسے کار میں رکھ دو۔ سوٹ کیس میں خود اٹھالوں گی۔"

جب سے ہم ساتھ رہ رہے تھے۔ پہلا موقع تھا کہ میرے سامنے دو حکم تھے جو ایک دوسرے کی ضد بھی تھے۔ ایک طرف میرا درد یہ کہہ رہا تھا کہ میں اسے جانے نہ دوں۔ اور دوسری طرف خود اس کا یہ حکم تھا کہ میں اس کی ٹائپ مشین اٹھا کے نیچے کار میں رکھ آؤں۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ اس دوران میں اس کے حکم کے مطابق لباس تبدیل کرتا رہا۔ میری بیوی فلیٹ میں گھوم پھر کر اپنی چیزیں جمع کر رہی تھی پھر اس نے سوٹ کیس تبدیل کیا اور میری طرف سے منہ موڑ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

تب اندرونی ہیجان نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ میں اچھل کر اس کی طرف بڑھا اور چلایا: "تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔" اور اس کے بعد میرے ہاتھ اس کی طرف گردن پر جم گئے۔ ہر بات انتہائی مختصر وقت میں خود بخود ہو گئی۔ جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا ہے اور نیچے کی طرف گر رہا ہے تو میں نے گھسیٹ کر اسے بستر پر چت لٹا دیا۔ اور اس کی بے نور آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں اور اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

اب یہ مناسب ترین وقت تھا کہ میں دوسرے احکامات پر بھی عمل کروں۔ میں نے ٹائپ رائٹر کو اس کے سوٹ کیس میں رکھا۔ فلیٹ سے باہر آیا اور لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ کار سامنے ہی کھڑی تھی اس کے شیشے ایسے تھے کہ میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا ٹائپ رائٹر کو اندر رکھ دیا۔

اس کے بعد میں فلیٹ میں واپس آ گیا اور صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے میری آنکھیں خلا میں تک رہی تھیں اور میں تازہ حکم کا منتظر تھا----!

غیر ملکی ادب
اسٹیفن لیکز

کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

پرانے تذکروں میں ایک ایسی سرزمین کا ذکر ملتا ہے جہاں یہ رواج تھا کہ مرد اور عورتیں نگاہیں جھکا کر چلیں۔

انہیں آسمان کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگر کبھی کسی سے یہ جرم سرزد ہو جاتا تھا تو قانون اور رواج کے مطابق اسے سخت سزا کا حقدار ٹھہرایا جاتا تھا' یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس رسم کا آغاز ایک ظالم و جابر فرمانروا کے دور میں ہوا جو اپنی رعایا سے اپنے آپ کو اس قدر بلند و بالاتر تصور کرتا تھا کہ اس نے اپنی ذات یا اپنے تخت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کو جرم قرار دے دیا تھا۔ حد یہ ہے کہ خود اس کے خاندان کے افراد بھی اس کی اس تحقیر آمیز روش سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ چنانچہ اس کے انتقال کے بعد جب نیا فرمانروا اپنا سر جھکائے اور نگاہیں زمین پر گاڑے اپنے تخت کی طرف بڑھا تو اپنے پیش رو سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس مقدس حکم کی پابندی کرنے اور کروانے لگا۔

مذہبی پیشوا اور سرکاری عملدار اس حکم کی نشر و اشاعت میں لگ گئے۔ لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ حکم صاحب علم و فضل بزرگوں کی طرف سے جاری کیا گیا ہے۔ اور جو بھی آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کی جرات کرے گا وہ یقیناً وہیں پر ہی ہلاک ہو جائے گا آسمان سے آنی والی شعاعیں زہریلی قرار دی گئیں۔ اور وقتاً" فوقتاً" جو بجلی سی چمک جاتی تھی اس کی یہ توجیح کی گئی کہ یہ اس گستاخ کو سزا دی جاتی ہے جو اپنی ناعاقبت اندیشی میں سر اٹھا کر دیکھنے کی حماقت کر بیٹھتا ہے۔ طبیعات دان اور فنکار دونوں ہی اس بات پر متفق تھے کہ آسمان کا رنگ پیلا ہے۔ اور پیلا بھی ایسا کہ جسے دیکھ کر قے آئے اور جس کی کوئی مثال زمین پر موجود نہ ہو——

اس عقیدے پر جنوں کی حد تک ایمان رکھنے والوں کی تو ساری زندگی الٹا لیٹ کر رینگتے رہنے میں گزر جاتی بہت جلد اس سرزمین کے سماجی ڈھانچے نے یہ شکل اختیار کر لی کہ سب

سے زیادہ اہم اور اعلیٰ منصب اس شخص کو دیا جاتا جس نے سب سے زیادہ طویل عرصے تک اپنا سر جھکائے رکھا ہو۔ چنانچہ پست ترین افراد اس مقام پر آ گئے جنہیں ہم اعلیٰ ترین مراتب کہتے ہیں۔ بچوں کو جھولنے میں منہ نیچا کر کے لٹایا جاتا اور مردوں کو قبروں میں اس طرح دفن کیا جاتا کہ ان کا رخ خاک کی طرف ہوتا۔

اس سرزمین پر بسنے والے کیونکہ کسی اور طریق زندگی سے آگاہ نہیں تھے اس لئے کسی کو خوف و جبر کے اس ماحول میں مقید ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

تذکرہ نویسوں کے مطابق موسم بہار کی ایک صبح ایک نوجوان لڑکی اور لڑکا ایک سبزہ زار سے گزر رہے تھے۔ اپنے چہار جانب کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر انہیں بے انتہا مسرت ہو رہی تھی۔ نوجوان لڑکی کا خیال تھا نیلے شگوفے سب سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ لڑکے کو اس خیال سے اتفاق تھا مگر دونوں کو اس بات کا دکھ تھا کہ نیلا جو سب سے زیادہ مسرور کن اور مسحور کن رنگ ہے۔ بہت ہی کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہر چند کہ وہ فرمان شاہی کی پابندی کرتے ہوئے نگاہیں جھکائے ٹہل رہے تھے مگر یوں لگتا ہے کہ وہ یقیناً تھوڑے بہت لاپرواہ ہو گئے ہوں گے کیونکہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ انہیں ٹھوکر لگی اور وہ گھاس پر گر گئے۔ پہلے تو انہوں نے لمبی لمبی گھاس میں اپنا منہ چھپا لیا مگر پھر نوجوان لڑکی نے اپنے ساتھی کو دیکھنے کے خیال سے اپنا چہرہ اس طرف موڑا۔ اپنے محبوب کا چہرہ دیکھتے دیکھتے جو اس کی نگاہیں اٹھیں تو آسمان نظر آ گیا۔ "دیکھو آسمان نیلا ہے" اس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

نوجوان لڑکے کو کفر کے ان کلمات کے خوف سے نجات ملی تو اس نے خود آسمان کی طرف دیکھنے کی ہمت کی اور پھر اپنی اس دریافت کی خوشی میں دیوانہ ہو کر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور شہر کی طرف بھاگنے لگا۔

"آسمان نیلا ہے!"

وہ بار بار چلا رہا تھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر آسمان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

تم خود دیکھ لو کہ آسمان نیلا ہے یا نہیں!

"مگر وہ جس طرف سے گزرتا لوگ اس کی بات سن کر زمین پر اور بھی زیادہ جھک جاتے اور اس خوف سے کہ اب آسمان سے بجلی گرنے ہی والی ہے' پناہیں ڈھونڈنے لگتے۔"

نوجوان بازار کے درمیان میں کھڑا ہوا تھا اور آسمان کو دیکھے جا رہا تھا کہ بادشاہ کے

سپاہیوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا اور اسے قیدی بنا کر لے گئے۔ پھر اسے اس کے کفر بکنے کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارنے کی سزا دی گئی۔ اسے بیڑیاں پہنا کر معبد کی دیوار تک لے جایا گیا اور بندوق چیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ تیار ہو جائیں۔

بد قسمت نوجوان کے چہرے پر بکھری ہوئی مسکراہٹ سے گمراہ ہو کر ایک سپاہی اپنی اس خواہش پر قابو نہ رکھ سکا کہ وہ خود کم از کم ایک نظر آسمان کی طرف دیکھ کر یہ معلوم کر لے کہ کیا واقعی نوجوان غلط کہہ رہا ہے۔ اپنی بندوق کو آزمانے کا بہانہ بنا کر اس نے چوری چوری آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے ساتھ کھڑے ہوئے سپاہی کو کہنی ماری۔

"نوجوان سچ کہہ رہا ہے۔ آسمان نیلا ہے!"

"قطار ٹھیک کرو۔ افسر نے حکم دیا۔ تیار ہو جاؤ۔"

"آسمان سچ مچ نیلا ہے!" دوسرے سپاہی نے تیسرے کے کان میں کہا۔

"نشانہ لو۔ افسر دہاڑا۔"

"نیلا..... اور ہمیں کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

ہمیں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

"گولی چلاؤ..... افسر نے کڑک دار آواز میں حکم دیا۔"

مگر سپاہی جو آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے گولی چلانا بھول گئے۔

جب باغی سپاہیوں کو سزا دینے کے لئے آسمان سے کوئی پیلی روشنی کی تلوار نہیں گری تو تماشائیوں میں سے کچھ نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور ذرا سی دیر میں بازار میں موجود تمام لوگ سیدھے کھڑے ہو کر دنیا کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے لگے۔ وہ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔

سو تذکرے ہمیں بتاتے ہیں کہ اس بازار میں ایک نوجوان جوڑے کا مجسمہ جن کی مضطرب نگاہیں آسمان کو تک رہی تھیں، صدیوں تک نصب رہا۔

غیر ملکی ادب
البرٹو مورادیا

ایزیکا بیلی

آج صبح مجھے مندرجہ ذیل خط وصول ہوا:

"یہ خط وینی زولا سے روانہ کیا گیا ہے اور مشہور و معروف بر لیگو کی طرف سے تحریر کیا گیا ہے۔ اب یہ خط ساری دنیا میں جانا چاہئے' تمہیں چاہئے کہ تم اس کی چوبیس نقلیں تیار کرو اور انہیں مختلف پتوں پر روانہ کر دو۔ نو دن کے بعد تمہیں ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ پیش آئے گا۔ اگر تم توہم پرست نہیں ہو تب بھی نتائج سے بے خبر مت رہنا۔ شمالی امریکہ کے جنرل بانگا کو پانچ ملین ڈالر انعام ملا۔ ورسیلی (کولمبیا) کی ایزیکا بیلی کو بھی اسی سلسلے کا خط ملا۔ اس نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ اس کا خاندان آفات میں گھر گیا اس کے عزیز و اقارب مر گئے اور وہ پیسے پیسے کو محتاج ہو گئی۔

"1940ء میں وینی زولا کی فوج کے ایک جنرل والٹر بیروچ نے اس خط کی نقلیں اپنی سیکریٹری سے بنوائیں۔ نتائج فوری طور پر سامنے آئے اور اس کے حالات بہترین ہو گئے۔ ایک اور ملازم کو اس خط کی نقل ملی مگر وہ آگے نقلیں روانہ کرنا بھول گیا جس کے نتیجے میں اس کی ملازمت جاتی رہی۔ پھر اس نے نقلیں بھیجنے کا فیصلہ کیا اور چند ہی روز میں اسے پہلے سے بہتر ملازمت مل گئی۔ سلا میں ایک اور شخص کو اس سلسلے کا ایک خط ملا جسے اس نے لاپرواہی سے پھینک دیا اور نو دن کے بعد وہ کار کے ایک حادثے میں تباہ ہو گیا۔ یہ سلسلہ ٹوٹنا نہیں چاہئے!"

میں نے یہ خط پڑھا اور خیالات کے دھارے میں بہہ گیا۔ ان چند سطور میں کتنے دلچسپ سوالات اٹھائے گئے تھے۔ میں فطرتاً" خواب دیکھنے کا عادی ہوں۔ یہ خط مجھے دن میں خواب دکھانے کے لئے کافی تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ کسی پراسرار اتفاق کے تحت ان تمام افراد کا جن کا اس خط میں تذکرہ تھا خواہ وہ خوش نصیب تھے یا بد نصیب لاطینی امریکہ سے تعلق تھا اور ان سب کے نام "ب" سے شروع ہوتے تھے برانگو' بانگا' بیلی یا بیروچ۔

پھر تفصیلات کا خوبصورت اختصار تھا: مشہور و معروف (مگر مشہور و معروف کیوں؟) برانگو سلا کا قصبہ (رومن ڈکٹیٹر سے) پانچ ملین ڈالر کا انعام (کیسا انعام؟ کس چیز کا انعام؟) ایک ملازم (اس کی ملازمت کہاں تھی؟) اس کی ملازمت! (ملازمت کیا تھی؟) ایک حادثہ (کیسا حادثہ؟ کون سا حادثہ؟)

ان تمام چیزوں سے زیادہ پرکشش ایزیکا بیلی کی ذات تھی جس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ پیسے پیسے کو محتاج ہو کر ابھی تک زندہ تھی۔ ایزیکا بیلی نے میرے خوابوں کا تانا بانا بننا شروع کر دیا تھا۔ خوبصورت' خوددار اور جرات مند۔ اس نے خط کی نقلیں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ بدنصیبی کا شکار ہو گئی تھی۔ (مگر کیسی بدنصیبی!) اس نے عزیز و اقارب کا صدمہ جھیلا (کون سے عزیز و اقارب؟) اور پیسے پیسے کو محتاج ہو گئی تھی۔ اس پر کیا بیتی؟ اس نے اس آفت کا کس طرح مقابلہ کیا؟ وہ اب کہاں تھی؟

میری بیوی کی آمد نے میرے خوابوں کے سلسلے کو منتشر کر دیا۔ "لو ابھی تک بیٹھے سگریٹ پھونک رہے ہو اور خواب دیکھ رہے ہو جب کہ اب تک تمہیں کام پر چلا جانا چاہئے تھا۔ کیا بات ہے----؟ کیسے بیٹھے ہو----؟---- اپنے اخبار کے دفتر کیوں نہیں گئے؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ چار بج چکے ہیں؟"

میں نے محتاط انداز میں جواب دیا۔ "مجھے روم سے گذرنے والی کسی مشہور و معروف شخصیت کا انٹرویو لینا تھا۔ لیکن آج کوئی بھی مشہور و معروف شخص روم سے نہیں آ رہا ہے اس لئے میرے پاس کوئی کام نہیں ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک تجویز ہے' تم جنرل بانگا سے انٹرویو کیوں نہیں لے لیتے----؟"

"میں چونک سا گیا۔ تمہیں کیسے علم ہے؟"

"کس چیز کا علم؟ اس جنرل کی وجہ سے اتنا بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔ تمہیں اس کی کچھ خبر ہی نہیں ہے---- تم بیٹھے خواب دیکھ رہے ہو----!"

"کیسا ہنگامہ؟"

"تمام اخبارات میں تفصیلات چھپی ہیں! تم بھی کس قدر غافل ہو---- ہو نا؟---- لو دیکھو!"

اس نے اخبار میرے سامنے کر دیا۔ پہلے ہی صفحے پر تین کالمی سرخی تھی۔ "جنرل بانگا

کے خلاف مظاہرے۔" جنرل ایک ہوٹل میں مورچہ بند تھا اور اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ دارالخلافہ میں تین روز تک قیام کرے گا۔

"چلو اب اٹھو۔۔۔۔ تیاری کرو۔۔۔۔ اور جنرل کا انٹرویو لے ڈالو۔" میری بیوی نے کہا۔

"مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص خون کا پیاسا ہے اس کی گردن پر ہزاروں افراد کا خون ہے۔ اس کے علاوہ بنیادی طور پر وہ چور نظر آتا ہے۔"

"اس سے تمہیں کیا واسطہ؟" تم صحافی ہو یا نہیں؟۔۔۔۔ جنرل بانگا کی اخباری اہمیت ہے یا نہیں؟"

مختصر یہ کہ میری بیوی نے مجھے آمادہ کر لیا۔ میری بیوی نے میری سیکریٹری بن کر ہوٹل فون کیا اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انٹرویو کے لئے مجھے فوری طور پر وقت مل گیا۔ بانگا ایک گھنٹے بعد ہوٹل کے کمرہ نمبر 415 میں مجھ سے ملاقات کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

میری بیوی مشوروں کے معاملے میں بڑی فراغ دل واقع ہوئی ہے۔ وہ بولی۔ "اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا۔ ایسا انٹرویو لینا جس سے ذرا گہما گہمی پیدا ہو۔ کسی طرح اس سے یہ اگلوا لینا کہ وہ اب تک کتنے انسانوں کو ٹھکانے لگا چکا ہے۔ کتنے کروڑ روپے اب تک چرا چکا ہے اور ایسی ہی دوسری تمام باتیں جو کسی نہ کسی طرح اس کی زبان پر آ جائیں۔ بس تھوڑی سی خوشامد کی ضرورت پیش آئے گی۔ تم اپنے ان ساتھیوں کی روش مت اختیار کر لینا جو اپنے آپ کو مصلح قوم سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان احمقوں کو بھی اہمیت دینے کی ضرورت نہیں جنہوں نے مظاہرے شروع کر رکھے ہیں۔ ایسا محض حسد کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اگر موقع ملے تو دولت حاصل کرنے کے لئے جنرل سے دوگنی لوٹ مار اور قتل و غارت گری پر نہ اتر آئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جنرل کروڑ پتی ہے بلکہ ارب پتی ہے! خوش نصیب ہے! اٹھو اب اپنا نیلا سوٹ پہنو۔ اس کے ساتھ سیاہ جوتے' سفید قمیص اور گہرے رنگ کی ٹائی مناسب رہے گی۔۔۔۔ آخر وہ جنرل ہے! اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب بھی اسے مخاطب کرو ہمیشہ "ایکسی لینسی ضرور کہو۔۔۔۔ سمجھ گئے نا؟"

چنانچہ میں نے اپنا نیلا سوٹ پہنا اور نئی نوٹ بک اور نیا قلم لے کر ہوٹل کی راہ اختیار کی۔ ہوٹل کے سامنے مشتعل لوگوں کا ایک ہجوم تھا جسے باوردی پولیس والے ایک حلقہ بنا

کر بادقت تمام روکے ہوئے تھے۔ ہجوم میں کچھ افراد نے پلے کارڈ بھی اٹھائے ہوئے تھے جن پر "بانگا واپس جاؤ"____ "قاتل مردہ باد"____ "بانگا کو نکالو۔" "بانگا کو سولی پر لٹکاؤ۔" اور ایسی ہی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن جب میں ہوٹل کی عمارت کے اندر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کی زندگی باہر کے مظاہروں سے قطعی متاثر نہیں ہوئی ہے ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ روشنیوں سے ہوٹل جگمگا رہا تھا۔ گاہک آ جا رہے تھے اور آرکسٹرا ایک دلکش دھن بجانے میں مصروف تھا۔ میں استقبالیہ کاؤنٹر پر گیا اور وہاں جب میں نے اپنا نام بتایا تو جواب ملا کہ میرا انتظار کیا جا رہا ہے۔ پھر مجھے لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر پہنچا دیا گیا۔ لمبے لمبے کاریڈور' دھندلائی ہوئی روشنیاں اور دبیز بے آواز قالین۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا کمرہ نمبر415 کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔

مجھے بیٹھنے کے کمرے میں لے آیا گیا۔ یہ کمرہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے سجایا گیا تھا' تمام سفید اور سنہرا۔۔۔۔ ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور ملحقہ کمرے میں ایک بے ترتیب بستر نظر آ رہا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا جس کے چہرے پر داڑھی تھی اور جس کی مونچھیں انتہائی نفاست سے ترشی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "میں سیکریٹری ہوں۔ جنرل ابھی قیلولے کے بعد بیدار ہوئے ہیں اور اپنا لباس تبدیل کر رہے ہیں۔ جیسے ہی وہ تیار ہو جائیں گے وہ آپ سے ملاقات کریں گے۔"

"شکریہ!"

میں بیٹھ گیا اور میں نے نوٹ بک اور قلم نکال لیا۔ سیکریٹری کھڑکی کے نزدیک گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ ایک بوڑھے آدمی کی بھرائی ہوئی زکام زدہ اور عمر رسیدگی کی وجہ سے لرزتی ہوئی آواز ابھری اور اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"میرے جوتے!"

سیکریٹری۔ تیزی سے آواز کی طرف بڑھا۔ اور دوسرے کمرے میں غائب ہو گیا۔ لمحہ بھر کی خاموشی اور پھر آواز آئی۔

"میری پتلون!"

"میری پیٹی!"

"میرا پستول!"

"میری ٹوپی!"

پھر خاموشی---- اور طویل تر خاموشی! آخر سیکریٹری دروازے میں نظر آیا اور اس نے کہا:

"جنرل اب انٹرویو کے لئے تیار ہیں!"

"لیکن جنرل ہیں کہاں؟"

"جنرل سامنے آئے بغیر ہی انٹرویو دیتے ہیں آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھیں وہ اپنی خواب گاہ سے جواب دیں گے!"

"لیکن کیوں----؟"

"اس میں کسی "کیوں" کی گنجائش نہیں ہے- یہ بس ایسا ہی ہے!"

مجھے خیال آیا کہ جنرل اپنی غیر مقبولیت کے پیش نظر قاتلانہ حملے سے خوفزدہ ہے- سیکریٹری نے جلدی سے یہ کہنا بھی ضروری خیال کیا- "بر سبیل تذکرہ جنرل سیاسی' مذہبی' معاشی' سماجی یا مختصراً" عوام الناس سے تعلق رکھنے والے سوالوں کے جواب دینا پسند نہیں کرتے- جنرل قطعی ذاتی نوعیت کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں!"

"ذاتی سے کیا مراد ہے؟"

"مثلاً ایسے سوالات جن کا تعلق فنون لطیفہ کے میدان میں ذاتی پسند یا ناپسند سے ہو- سیرو سیاحت سے ہو' فیشن سے ہو یا اسی قسم کے دوسرے موضوعات سے ہو-"

"افراد کے بارے میں کیا خیال ہے- کیا جنرل کسی خاص فرد کے بارے میں جواب دینا پسند کریں گے!"

"ہاں بشرطیکہ وہ فرد عوام الناس کا نمائندہ نہ ہو!"

چنانچہ میں نے کمر کسی اور کہا- "اس صورت میں میں چاہوں گا کہ جنرل میرے اس سوال کا جواب دیں: کیا آپ کبھی ایزیکا بیلی نام کی کسی خاتون سے واقف تھے-"

مجھے حیرت ہوئی جب ایک بھاری آواز میں مجھے جواب ملا---- "ہاں!"

"ایزیکا بیلی کون ہے؟"

"ایک مغموم آفت رسیدہ!"

"آفت رسیدہ کیوں؟"

"ایزیکا کا شوہر میری مخالفت پر تل گیا تھا- میرے چند پرستار ایک رات بیلی کے گھر میں گھس گئے- انہوں نے ایزیکا بیلی کے خلاف تشدد کا مظاہرہ کیا- انہوں نے اس کے شوہر' اس

کے بچوں اور ملازموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور گھر کو آگ لگا دی۔ زیادتی ہوئی مگر یہ واقعہ سیاسی جدوجہد کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے!"

"اس وقت ایزیکا کی عمر کیا تھی۔"

"پچیس سال۔"

"کیا وہ خوبصورت تھی!"

"انتہائی خوبصورت۔۔۔۔ مگر آگ سے اس کا چہرہ بری طرح جھلس گیا تھا۔"

"اور اب وہ کہاں ہے؟"

"وہ اب میرے دارالخلافہ کے بدترین علاقے میں رہتی ہے!"

"وہ اب کرتی کیا ہے۔"

"خواری!"

"خواری سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"وہ بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ رات کو ایک جھونپڑی میں سو رہتی ہے۔ جھوٹے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھرتی ہے اور چیتھڑے لگائے پھرتی ہے۔"

ایک مرتبہ پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ آ گیا۔ میں سوالات کرنے کے لئے نیا زاویہ تلاش کر رہا تھا۔ آخرکار میں نے سوال کیا۔

"ایکسی لینسی' کیا آپ کو یاد ہے کہ کبھی آپ کو پانچ ملین ڈالر کا انعام ملا ہو۔ اور اگر کبھی آپ کو ایسا کوئی انعام ملا ہے تو کیا آپ یہ فرمائیں گے کہ وہ کس بات کا انعام تھا اور آپ کو کیوں دیا گیا تھا!"

میں بے تابی سے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہا تھا کہ پھر وہی بھاری آواز ابھری۔

"پانچ ملین ڈالر کا انعام مجھے اس وجہ سے دیا گیا تھا کہ ایک فوجی کارروائی کے دوران جو تین مہینے تک جاری رہی تھی' میں نے دارالحکومت کے قریب پہاڑوں میں چھپے ہوئے دہشت پسندوں کے ایک گروہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔"

"اور یہ انعام آپ کو کس نے دیا تھا؟"

"حکومت نے!"

"اس وقت حکومت کا سربراہ کون تھا؟"

"میں خود اس حکومت کا سربراہ تھا۔"

"تو گویا صورت یہ ہوئی کہ آپ نے خود اپنے آپ کو انعام دیا۔"

"یقیناً۔"

میں ہکا بکا رہ گیا۔۔۔۔ سیکریٹری نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "انٹرویو ختم ہو چکا ہے۔۔۔۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں!"

"مگر ابھی مجھے کچھ اور باتیں دریافت کرنی ہیں!"

"اب ممکن نہیں ہے۔ انٹرویو ختم ہو چکا ہے!"

اس نے مجھے انتہائی بد تہذیبی سے دھکے دے کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ اب میرے پاس گھر لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ گھر جا کر میں نے انٹرویو کی ہر تفصیل کو۔۔۔۔ یعنی خط' احتجاجی مظاہرے' جنرل اور اس کے سیکرٹری اور ایزیکا بیلی پر مشتمل ہر بات کو پوری احتیاط سے قلمبند کیا۔ مگر کیا آپ یقین کریں گے کہ ایڈیٹر نے مجھ سے کہا کہ وہ انٹرویو شائع نہیں کر سکتا کیونکہ میں جنرل کو خود اس کی اپنی ذات کے بارے میں بولنے پر اکسانے میں بری طرح ناکام رہا تھا۔ بس کسی ایزیکا بیلی کا تذکرہ ضرور تھا جو ایک قطعی غیر معروف فرد تھی یہی وجہ تھی کہ اس کی کوئی "خبری قدر" ہی تھی نہ وہ اخبار کے نقطہ نظر سے دلچسپ تھی!

غیر ملکی ادب

لیلیٰ .علبکی (بیروت)

محبت کا سیارچہ

لیلیٰ .علبکی بیروت میں پیدا ہوئیں اور وہیں قیام پذیر ہیں۔ انہیں ان کے پہلے ناول "میں زندہ ہوں" ہی سے بین الاقوامی شہرت مل گئی تھی۔ یہ ناول عربی سے فرانسیسی اور دوسری مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک اور ناول لکھا ہے۔ ان کے افسانوں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جدید عربی ادب میں انہیں ایک ممتاز اور مقتدر حیثیت حاصل ہے۔ وہ بیروت کے ایک بڑے ہفت روزہ جریدے میں بحیثیت کالم نگار کام کرتی ہیں۔ انہیں صاف گوئی' بے باکی اور جراتِ اظہار کے سلسلے میں خاصی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ یہاں ان کی ایک کہانی "محبت کا سیارچہ" پیش کی جا رہی ہے' جس پر بیروت پولیس کی طرف سے ان کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا تھا' مگر وہ مقدمہ جیت گئی تھیں۔ کہانی پڑھ کر آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ مقدمہ کیوں دائر کیا گیا تھا اور وہ یہ مقدمہ کیوں جیت گئی تھیں۔

میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو مجھے کمرے کی ایک ایک چیز دکھائی دینے لگتی ہے۔ وہ دہرا بیڈ جو کمرے کے بڑے حصے میں پھیلا ہوا ہے اور اس کی لمبائی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہے' سامنے کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے شیلف' چھوٹی میز' قالین پر رکھے ہوئے رنگ برنگے کشن' سفید لمپ جو شکل و صورت میں مٹی کے تیل کے اس لیمپ کی طرح ہے جسے ضرورت کے وقت دیوار میں لٹکایا جا سکتا ہے اور فرش پر بھی رکھا جا سکتا ہے حد یہ ہے کہ وہ کھڑکیاں بھی جن پر ہم نے پردے نہیں ڈالے ہیں۔ دوسرے کمرے میں ایک بڑا صوفہ ہے' ایک ڈریسنگ ٹیبل ہے' ایک الماری ہے اور دو کرسیاں بھی ہیں جن پر

مخمل کے غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے' ہم نے اس چھوٹے سے گھر کی ایک چیز بھی تبدیل نہیں کی ہے۔ میں ان چیزوں میں سے کسی چیز کو کم کرنے کی بھی شدید مخالف ہوں۔

میں نے اپنی آنکھیں ذرا سی کھولیں' میرے شوہر بڑبڑا رہے تھے۔ ''روشنی ہو گئی ہے اور پورے شہر میں ایک ہم ہی ہیں جو جاگ رہے ہیں۔'' میں نے دیکھا کہ وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہیں اور صبح کی روپہلی روشنی ان کے چہرے اور ننگے بدن پر پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے ان کا عریاں جسم بہت پسند ہے۔

ایک مرتبہ پھر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اب میں انہیں سر سے پاؤں تک دیکھ سکتی تھی۔ تمام چھوٹی چھوٹی تفصیلات بھی میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ ان کے نرم ملائم بال' کشادہ پیشانی' ناک' ٹھوڑی' گردن کی رگیں' سینے کے بادل' ان کا پیٹ' ٹانگیں اور ان کی انگلیوں کے ناخن..... میں نے انہیں پکارا اور ان سے کہا کہ میرے پاس آ کر لیٹ جائیں' میں انہیں پیار کرنا چاہتی ہوں ..... مگر انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ جس طرح میرے پاس سے اٹھے تھے اور دور جا کر کھڑے ہو گئے تھے اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کہنے والے ہیں۔ ایسے موقعوں پر وہ انتہائی سفاک اور ضدی بن جاتے ہیں۔ وہ فیصلے کرتے ہیں اور ان پر عمل بھی کر گزرتے ہیں۔ میرا حال قطعی مختلف ہے۔ میں اگر کسی معاملے میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں تو پہلے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہوں یا کم از کم ان کے لباس کو ہی اپنے ہاتھ میں تھام لیتی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس تکیے کو جسے میں نے ابھی تک اپنے سینے سے لگایا ہوا تھا ایک طرف پھینکا پھر..... ان کی قمیض اٹھائی اور اسے اپنی چھاتیوں پر پھیلا لیا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے ان سے سوال کیا کہ کیا انہیں سمندر نظر آ رہا ہے؟

''ہاں! میں سمندر دیکھ رہا ہوں!'' انہوں نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا اس کا رنگ کیسا ہے؟

''ایک طرف گہرا نیلا۔'' وہ بولے۔ ''اور دوسری طرف مٹیالا سفید!''

میں نے پوچھا کہ کیا سرو کے درخت ابھی تک موجود ہیں؟

''ہاں وہ ابھی تک ان مکانات میں موجود ہیں جو یہاں سے ایک دوسرے میں پیوست دکھائی دیتے ہیں۔'' انہوں نے کہا ''اور عمارتوں کی چھتوں پر پانی پڑا ہوا ہے۔''

میں نے کہا کہ مجھے کھجور کا وہ تنہا درخت بہت اچھا لگتا ہے جو ہمارے گھر سے ایسا نظر آتا ہے جیسے سمندر اگ رہا ہو حالانکہ سرو کے درختوں سے میرے ذہن میں قبرستان کا منظر ابھر رہا ہے۔

بڑی دیر تک وہ خاموش کھڑے رہے اور میں چھت کو گھورتی رہی۔ پھر انہوں نے کہا۔ "مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔" اور میں نے انہیں فوراً بتایا کہ مجھے چوزے پسند نہیں ہیں کیونکہ وہ اڑ نہیں سکتے' میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ جب میں چھوٹی سی تھی تو انہیں چھت پر سے نیچے پھینک دیا کرتی تھی تاکہ وہ اڑنا سیکھ سکیں مگر ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ وہ چوزے خواہ وہ مرغ ہوں یا مرغی ایک بے جان شے کی طرح زمین پر گر جاتے تھے!

کچھ دیر وہ خاموش کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ انہیں سامنے کی عمارت کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آئی ہے تاہم میں نے کہا کہ ابھی تک شہر میں ہم ہی دو ایسے افراد ہیں جو جاگ رہے ہیں اور جنہوں نے ساری رات ایک دوسرے کی بانہوں میں سمٹ کر گزار دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ گزشتہ رات وہ کچھ زیادہ ہی پی گئے تھے۔ میں نے تیزی سے مداخلت کی اور کہا کہ مجھے ان کے یہ الفاظ کہ وہ زیادہ پی گئے تھے ناگوار گزرتے ہیں کیونکہ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس بات پر تاسف ہے کہ انہوں نے رات اتنے ڈوب کر مجھے پیار کیوں کیا۔ میری ناگواری کو دیکھتے ہوئے انہوں نے موضوع بدل دیا۔ "شہر یوں نظر آتا ہے جیسے چھوٹے بڑے رنگ برنگے پتھروں کا ایک ڈھیر لگا ہوا ہے۔"

میں نے جواب دیا کہ میرے نزدیک شہر رنگین ڈبوں کا ایک سلسلہ ہے جو پھونک مارنے سے بکھر سکتا ہے۔ بس دو کمروں پر مشتمل ہمارا یہ گھر ایک بادل سے بندھا ہوا میں معلق ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کا منہ خشک ہو رہا ہے اور انہیں ایک سگرٹ چاہئے۔ میں نے اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا کہ ہرچند میں نے کوئی دوسرا شہر نہیں دیکھا تاہم مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ مجھے ایک نہ ایک دن ایک ایسا شخص ضرور مل جائے گا جو مجھے اس شہر سے کہیں بہت دور لے جائے گا تو میں کبھی کی مایوسی اور بددلی کا شکار ہو کر مر چکی ہوتی۔ انہوں نے کچھ یوں ظاہر کیا کہ جیسے انہوں نے میری بات سنی ہی نہ ہو اور کہا "مجھے ایک سگرٹ چاہئے میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔" میں نے ان کی درخواست نظر انداز کر دی اور کہا کہ ان کے ساتھ مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ ہم کہاں رہ رہے ہیں میرے لئے یہ زمین اپنے تمام درختوں' پہاڑوں' دریاؤں' جانوروں اور انسانوں سمیت غائب ہو چکی ہے۔ اب مزید انتظار

کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے چیخ کر کہا "تم بچوں سے نفرت کیوں کرتی ہو۔ تم ماں بننے سے انکار کیوں کرتی ہو؟"

میں اداس تھی' میرا دل مرجھایا ہوا تھا' آنسو میری پلکوں پر آ کر ٹھہر گئے تھے مگر میں نے اپنے لب نہ کھولے۔

"ہماری شادی کو کتنے دن ہو چکے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ بس لیٹی ہوئی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ تن کر کھڑے ہو گئے اور بولے "ہماری شادی ہوئے ایک سال اور کئی مہینے گزر چکے ہیں اور تم مسلسل انکار کئے چلی جا رہی ہو۔ حالانکہ شادی سے پہلے تم بچوں کی دیوانی تھیں' تم ان کے لئے مری جا رہیں تھیں۔"

وہ بستر پر بیٹھ گئے اور گدے پر زور سے ہاتھ مار کر بولے "اے گدے کیا تجھے اس کی فریادیں یاد نہیں ہیں' اے لیمپ تو ہی بتا کیا تو نے اس کے سسکنے کی آوازیں نہیں سنیں تھیں اور اے تکیو کیا اس نے تمہیں اپنا منا بنا کر اپنے سینے سے نہیں لگایا تھا اور اور سوتے میں اپنی چھاتیوں سے چمٹائے نہیں رکھا تھا۔ بولو اے بے جان چیزوں! بولو تم اسے اس کی وہ آواز لوٹا دو جو تمہارے اندر جذب ہو چکی ہے۔"

میں نے نہایت آہستگی سے کہا کہ "بے جان چیزیں نہ محسوس کرتی ہیں نہ بولتی ہیں اور نہ حرکت کرتی ہیں۔" انہوں نے خفگی سے پوچھا "تمہیں یہ کیسے معلوم ہے کہ یہ بے جان ہیں؟" میں نے جواب دیا "اگر اشیاء بے جان نہیں ہوتیں تو وہ اپنی نبض کی دھڑکن لوگوں سے مستعار لیتی ہیں۔" انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا کہ وہ اس وقت اشیاء کے بارے میں گفتگو نہیں کریں گے اور مجھے بھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ میں اپنی عادت کے مطابق اشیاء کے مسائل حل کرتے کرتے اصل مسئلے کو طرح دے جاؤں۔ بے خیالی کے عالم میں' میں نے انہیں بتانا شروع کیا کہ میرے اردگرد بکھری ہوئی چیزیں گویا یہ بستر' یہ قالین' یہ دیواریں' یہ لیمپ' یہ گلدان' کتابوں کی شیلف اور یہ چھت ایسا آئینہ ہیں جن میں میں تمام دنیا کا عکس دیکھتی ہوں۔ اس آئینے میں مجھے مکانات' سمندر' درخت' آسمان' سورج' ستارے اور بادل ساری ہی چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس آئینے میں' میں ان کے ساتھ گزرے ہوئے ایام کا عکس دیکھتی ہوں' وہ گھڑیاں دیکھتی ہوں جو بدحالی اور مایوسی سے عبارت تھیں' میں انبساط اور مسرت کے وہ لمحات بھی دیکھتی ہوں جب ہماری ملاقات ہوئی تھی اور ہم نے

ایک دوسرے سے پیار کرنا شروع کیا تھا اور پھر یہ تمام عکس جمع کر کے میں ان ایام کی تصویر بناتی ہوں جو اب آنے والے ہیں' میں انہیں خیرباد نہیں کہہ سکتی!"

انہیں غصہ آ گیا اور وہ چلانے لگے۔ "تم پھر اشیاء کا تذکرہ لے بیٹھی ہو۔ میں ابھی اور اسی وقت جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھے کیوں انکار کرتی ہو..... "اب میری برداشت کی بھی حد ہو چکی تھی میں نے بھی چلا کر کہا "ایک وقت وہ بھی تھا جب تم نے بچے سے انکار کیا تھا۔" وہ چند ثانیوں کے لئے خاموش رہے اور پھر بولے "میں نے شادی سے پہلے انکار کیا تھا کیونکہ اس وقت یہ بڑی حماقت کی بات ہوتی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا کہ وہ ڈرتے تھے۔ ان تمام لوگوں سے' ان گدھوں سے جو شہر میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی رضامندی' آمادگی اور خوش نودی کے طلب گار رہا کرتے تھے۔ وہ اس بات کے منتظر رہا کرتے تھے کہ لوگ ہمیں اس بات کی اجازت دیں کہ وہ مجھ سے اور میں ان سے مل سکوں تاکہ میں انہیں اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا سکیں تاکہ ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی محبتوں میں شرابور کر سکیں۔ وہ لوگ ہماری ملاقات کے مقامات کا تعین کیا کرتے تھے اور اس بات کا بھی کہ ہم وہاں تک پہنچنے کے لئے کتنے قدم اٹھائیں۔ وہ ہمارے وقت کا حساب رکھتے اور اس بات کا دھیان بھی کہ ہم اپنی آواز کس درجہ بلند کر سکتے ہیں' ہم محبت کے کتنے سانس لے سکتے ہیں اور میں انہیں دیکھتی رہتی تھی جب وہ ہم پر رازدارانہ انداز میں فقرے چست کرتے رہتے تھے۔ وہ بے شرمی کے ساتھ اپنی پسند کے جسموں کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ دن میں تین تین مرتبہ کھانا کھاتے تھے' کافی کے ساتھ سگار پیتے تھے اور قہقہے لگا لگا کر ہمارے بارے میں فحش کہانیاں گھڑتے تھے اور آنے والے دن کے لئے ہمارا طرز عمل متعین کرتے تھے۔ وہ بولے تو ان کی آواز میں غم کی گھٹن رچی ہوئی تھی۔ "میں دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتا مگر اس وقت میں ایک دوسری عورت کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔"

اوہ! میں بھلا یہ صدمات کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ میری ان کے لئے والہانہ محبت! مگر ان میں اتنی اخلاقی جرات نہیں تھی کہ وہ اس سے اس تلخ حقیقت کا اظہار کر سکیں کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتے' کر ہی نہیں سکتے! انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور وہ اتنے سنگ دل نہیں بن سکتے تھے کہ کسی کے ساتھ زندگی کے نو سال ایک ہی چھت کے نیچے گزار کر اس سے ایسی بات کہہ دیں۔ اب کھیل ختم ہو چکا ہے۔ "بھول جاؤ اور آگے بڑھ جاؤ" میں نے ان سے کہا۔ "ذرا میرے دائیں ہاتھ کی طرف

دیکھیں اور بتائیں کہ کیا اس سے گرم گرم خون اب بھی ٹپک رہا ہے۔" "تم پاگل ہو گئی تھیں۔" وہ بڑبڑائے "سچ مچ پاگل کہ تم نے اتنے احمقانہ فیصلے پر عمل کیا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اس کمرے میں داخل ہوا تو تمہیں بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ تمہارے ہاتھ کی رگ کٹی ہوئی تھی اور تمہاری انگلیاں خون کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تم پاگل ہو گئی تھیں ممکن تھا میں تم سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔" میں افسردگی سے مسکرائی اور میں نے ان کی قمیض میں اپنے آپ کو چھپا لیا۔ ان کی قمیض میں سے ان کی خوشبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ اس ڈرامے میں میرا کردار یہی تھا کہ انجام سے قبل میں اپنے آپ کو ختم کر دوں اور وہ موت جو مجھے گوارا ہو سکتی تھی یہی تھی۔ فوری موت' لمحاتی موت..... سسک سسک کر مرنا مجھے گوارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں ان کے بارے میں سنجیدہ ہوں۔ میں نے انہیں چھیڑتے ہوئے کہا کہ کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ انہیں احساس دلانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جاؤں..... میں نے بتایا کہ ان کے پیار میں اپنے آپ کو گم کر چکی تھی۔ میں لوگوں کے درمیان سے ہوا کی طرح گزرتی ہوئی ان تک آ گئی تھی اور اب سوائے ان کے ہر چیز میری نگاہوں میں دھندلا چکی تھی۔ مجھے جن چیزوں کا احساس تھا ان میں عمارتوں کی بلندی' جسموں کا وزن اور ان کے ہاتھوں کا لمس شامل تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ میرے نزدیک آ جائیں اور اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیں مگر وہ مجھ سے دور کھڑے رہے۔ ان کے رویے میں نرمی کی کوئی جھلک موجود نہیں تھی۔ وہ مجھے الزام دے رہے تھے کہ میں نے یہ تمام دکھ یقیناً اٹھائے مگر اب ماں بننے سے انکار کر رہی ہوں' بار بار انکار کر چکی ہوں اور میرے انکار سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے اب ان سے محبت نہیں رہی.....

"کیا.....؟" میں چلائی..... "آپ زندگی بھر مجھے اس کا مجرم نہیں ٹھہرا سکتے!" کل ہی کی تو بات ہے میں ان کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ وہ گہری نیند سو رہے تھے اور میں پوری طرح بیدار تھی اور اپنا گال ان کی ٹھوڑی سے رگڑ رہی تھی۔ ان کی چھاتی کو چوم رہی تھی اور جب وہ کسی صورت بیدار نہیں ہوئے تھے تو ان کی بغل میں منہ چھپا کر سونے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ میں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ جتنی جلدی سو جاتے ہیں اور مجھے تنہا جاگتا ہوا چھوڑ دیتے تو میں سخت پریشان ہو جاتی ہوں۔ انہوں نے میری تردید کرنے میں ایک لمحہ نہ لگایا اور کہا کہ انہیں آج تک کبھی احساس نہیں ہوا کہ میں جاگتی رہی ہوں۔ وہ یہ

سمجھتے ہیں کہ جیسے ہی وہ سوتے ہیں میں بھی سو جاتی ہوں۔ میں نے قدرے ترش روئی سے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا ہے کہ انہوں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا ہو اور پھر میں نے گزشتہ شب کا پورا واقعہ تفصیل سے سنایا۔ وہ پڑے سو رہے تھے اور میں ان سے چپکی لیٹی تھی کہ اچانک کمرے کی تنہائی میں مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے چادر کے نیچے ایک پیر کو حرکت کرتے دیکھا ہے۔ میں نے اپنے پیر کو حرکت دینی چاہی مگر اس میں حرکت نہ ہوئی۔ پھر سردی کی ایک تیز لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ میں نے جسم کو حرکت دینی چاہی مگر وہ بھی ساکت رہا۔ مجھے خیال آیا کہ میں چیخ ماروں مگر میں نے جلدی سے اپنا چہرا ان کے بالوں میں چھپا لیا۔ میں بری طرح ڈری ہوئی تھی۔ انہوں نے حرکت کی اور ان کے پیر نے بھی حرکت کی۔ میں چپ چپ روتی رہی۔ میں نے یہ تصور کیا تھا یہ محسوس کیا تھا اور اپنے اور ان کے پیر میں فرق محسوس کرنے سے قاصر رہی تھی۔ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا "اس عہد میں لوگ محبت میں نہیں مرتے۔" میں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "اس عہد میں لوگ بچے بھی پیدا نہیں کرتے۔ اگلے زمانے میں لوگ جانتے تھے کہ بچہ کہاں پیدا ہو گا لڑکا ہو گا یا لڑکی' وہ کس سے مشابہ ہو گا۔ وہ اس کے لئے اونی کپڑے تیار کرتے تھے۔ اس کے خوبصورت' رنگا رنگ اور پھولوں اور چڑیوں والے لباس تیار کرتے تھے۔ ان کے لئے تحفے تحائف اور کھلونے جمع کئے جاتے تھے۔ دائی کا پہلے سے انتظام کر لیا جاتا تھا جو حساب کتاب لگا کر وضع حمل کے دن کا پہلے سے تعین کر لیا کرتی تھی اور اس طرح وقت مقررہ پر بچہ تاریکی سے دنیا کی روشنیوں میں وارد ہوتا تھا۔

وہ لوگ بچے کے لئے ایک قطعہ اراضی وقف کر دیتے تھے' اس کے لئے ایک مکان کرائے پر لیا جاتا تھا اس کے ہمجولیوں کا بڑی احتیاط سے انتخاب ہوتا تھا اور یہ فیصلہ کیا جاتا تھا کہ اسے کس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا جائے گا اور کس پیشے کے لئے اسے تعلیم دلوائی جائے گی۔ حد یہ ہے کہ یہ بھی طے کر دیا جاتا تھا کہ وہ کس سے محبت کر سکتا ہے اور کون شریک زندگی بننے کا اہل ہے۔ مگر یہ بہت پرانی بات ہے' میرے یا تمہارے والد کے زمانے کی یا اس سے بھی پہلے کی۔" انہوں نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس بات کا اعتبار ہے کہ بیس سال پہلے کا زمانہ ماضی بعید کا دور ہے؟ آخر بدلا ہی کیا ہے؟ کیا میں اور تم۔ ہم دونوں بچوں کی ضروریات فراہم نہیں کر سکتے؟" اپنے درد کی شدت کو کم کرنے کے لئے میں نے کہا۔ "شادی سے پہلے میں ایک بچے کی مانند تھی جو کھڑکی کے پاس لیٹا آسمان کو تکتا رہتا

ہے اور آسمان میں چمکتے ہوئے تارے دیکھ کر انہیں نوچنے کے لئے اپنا منا سا ہاتھ ان کی طرف بڑھاتا ہے۔ میں اس خواب سے محظوظ ہوا کرتی تھی میں اس خواب سے وابستہ رہنا۔

اب مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے گفتگو کو ذاتی حملے میں تبدیل کر دیا ہے تاکہ اس طرح وہ یہ جنگ جیت جائیں میں نے انہیں بتایا کہ صرف وہی عورت بچے کی تمنا کرتی ہے جو اپنے سے لبریز نہیں ہوتی تاکہ وہ اپنی خلوت میں جاگزیں ہو کر اپنی تمام تر توجہات اپنے بچے کے لئے وقف کر دے اور خود کو آزاد محسوس کرے۔ انہوں نے تیزی سے مداخلت کی۔ "اور کیا تم غیر مطمئن تھیں؟" میں نے انہیں جواب دیا تم خوف زدہ تھے ہم نے تجربات کی خوبصورت وادی کے آخری سرے تک سفر نہیں کیا ہے۔ ہم خوف سے تھر تھر کانپتے رہے ہیں ہم دوسرے لوگوں کے چہروں سے ٹکراتے رہے ہیں اور ان کی آوازیں سنتے رہے ہیں میں نے اپنے شوہر کے لئے' اپنے لئے موت کو ٹال دیا تھا تاکہ میں زندہ رہ سکوں انہیں میری محبت کے بارے سخت غلط فہمی ہے' انتہائی شدید غلط فہمی ہے میری دیوانہ وار چاہت کے بارے میں!"

"میں حیران ہوں۔ میں تمہیں سمجھ نہیں سکا ہوں۔" انہوں نے زیر لب کہا۔ میں نے یہ کہہ کر ان پر حملہ کیا کہ یہی تو تلخ حقیقت ہے اور کہا کہ اگر میں یہ کہوں میں حاملہ ہونا گوارہ نہیں کر سکتی تو یہ بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں شعوری طور پر ایسی غلطی نہیں کروں گی.....

"غلطی!" وہ چلائے۔ "غلطی؟" میں ان کی قمیض سے چمٹ گئی اور اس سے کسب حوصلہ کرتے ہوئے میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں اپنے اس ہونے والے بچے کی قسمت کی طرف سے کس قدر پریشان ہوں جسے دنیا میں لا کر چھوڑ دیں گے۔ میں اس خیال کو کیسے گوارہ کر سکتی ہوں کہ میرا وہ بچہ جس نے میرے لہو سے پرورش پائی ہو جو میرے رحم میں پروان چڑھا ہو جو میرے تنفس' میرے دل کی دھڑکن اور میرے روزمرہ کے کھانے میں شریک رہا ہو۔ جسے میں نے اپنے خدوخال اور اپنی عادات دی ہوں مستقبل میں مجھے چھوڑ کر راکٹ میں سوار ہو جائے تاکہ چاند پر ایک نئی دنیا بسائے اور پھر کسے خبر ہے کہ وہاں بھی اسے خوشی نصیب ہو گی یا نہیں! میں تصور میں دیکھتی ہوں کے میرا بیٹا سفید خلائی سوٹ میں ملبوس ہے اور اس کا چہرہ شدت اضطراب سے گلابی ہو رہا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ کانچ ایسے ایک گولے کے اندر ایک کرسی سے بندھا ہوا ہے اور وہ گولا ایک طویل خاکی رنگ کی

دھات کے مخروطی سرے پر آویزاں ہے۔ میرا بیٹا ایک بٹن دباتا ہے' دھوئیں اور غبار کا ایک بادل اٹھتا ہے اور ایک تیز برق رفتاری سے فضا میں بلند ہونا شروع ہوتا ہے' نہیں میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی میں یہ برداشت نہیں کر سکتی!"

وہ ت دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ صبح کی روشنی ان کے چہرے سے منعطف ہو کر کمرے کے کونے کونے میں بکھر گئی تھی۔ ان کے چہرے سے غائب دماغی صاف ظاہر تھی اور ان کی نگاہیں خلا میں برق رفتار تیز اور بچے کے تمتمائے ہوئے گلابی چہرے کو تلاش کر رہی تھیں بھوؤں کے درمیان ماتھے پر شکن ابھر آئی تھی۔ خیالات کا تناؤ اور حیرت چہرے سے عیاں تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں تھیں اور خاموش تھی۔

پھر جب وہ فضا میں راکٹ پھینکنے کے اسٹیشن کے کسی ٹاور کی طرح میرے نزدیک آ کر کھڑے ہو گئے تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستہ سے کہا کہ میں ان کے بے لباس جسم کی پرستش کرتی ہوں۔ جب وہ کپڑے پہن لیتے ہیں اور بالخصوص جب ٹائی لگا لیتے ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک اجنبی خاندان کے کسی بڑے سے ملنے کے لئے آیا ہو۔ انہوں نے اپنے بازو پھیلائے اور میرے اوپر جھک گئے۔ میں تیزی سے ان کے سینے سے چمٹ گئی۔ "میں آپ سے محبت کرتی ہوں..... محبت کرتی ہوں'..... پاگلوں کی طرح محبت کرتی ہوں..... محبت کرتی ہوں۔" میں بڑبڑاتی رہی۔ انہوں نے میرے بالوں میں منہ چھپا کر سرگوشی کی۔

"تم میرا موتی ہو۔" پھر انہوں نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی میرے ہونٹوں پر رکھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے مجھے حکم دیا۔ "آؤ چلو چاند کے سفر پر چلیں.....!"

غیر ملکی ادب
جیک کیڈی

پیاس کا صحرا

جھٹ پٹا سرپا فلک عمارتوں کے عقب میں سرخ اور پیلے دھوئیں کی مانند فضا میں معلق تھا۔ بادل بہت اونچے تھے۔ عمارتوں کے سائے اس دائرے میں پڑ رہے تھے جو اس عظیم شہر کا کاروباری اور تجارتی علاقہ تھا۔ جنگ کے مقتولین کی یاد میں بنائی گئی بلند و بالا یادگار لمحہ بہ لمحہ تاریک ہوتے ہوئے افق کے پس منظر میں وحشت انگیز دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یادگار کا جسم منجمد اذیت سے ڈھالا گیا ہو۔ البتہ اس کی آنکھوں کے گوشوں میں زندگی کی رمق نظر آتی تھی۔ اور ان کی آنکھوں سے جب کسی کی نگاہیں ملتی تھیں تو ان میں دیکھنے والے کا اپنا درد سمٹا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

دائرے کے اردگرد ہزاروں آدمی تیزی سے قدم اٹھا رہے تھے۔ سردی کی لہر کی کوئی سمت متعین نہیں تھی۔ کیونکہ ہوا دائرے میں گھر کر ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ درجہ حرارت نقطہ انجماد کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ دکانوں پر روشنیاں اہم اور پرکشش انداز میں جلنے لگی تھیں۔ ہر طرف حرکت ہی حرکت نظر آتی تھی۔

وہ ایک دکان کی کھڑکی کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ وہ کمزور جسم کا نوجوان تھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور وہ شوکیس میں ٹنگے ہوئے کوٹوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے اندرونی تذبذب کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ رہ رہ کر اس کے ہونٹ ہلتے تھے۔ وہ کچھ زیر لب کہتا اور پھر اس کے چہرے پر جذبات کے تموج سے کھنچاؤ سا دکھائی دینے لگتا۔

کھڑکی میں سجے ہوئے مجسمے مسکرا رہے تھے۔ ان کی ٹانگیں جڑی ہوئی اور چھاتیاں پلاسٹر سے بنائی گئی تھی مگر ان کے ہونٹوں پر چپکی ہوئی خفیف سی مسکراہٹ دلاویز تھی۔ کچھ کوٹوں کے رنگ شوخ تھے۔ کچھ گہرے رنگوں میں تھے اور ان کے سر سمور کے تھے اور کچھ پورے سمور کے بنے ہوئے تھے۔ سرد ہوا اس کی گھسی ہوئی باریک جیکٹ سے ٹکرا رہی تھی مگر اس

کو سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس سے بھی زیادہ شدید موسم کا عادی تھا۔

اسے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ کچھ تھوڑا سا پاگل ہے وہ سسکیاں لینے لگا۔ اس لئے نہیں کہ وہ تھوڑا سا پاگل تھا بلکہ اس لئے کہ وہ کبھی اپنی بیوی کو کوئی اچھا کوٹ نہیں دلا سکا تھا۔ وہ مواقع بھی انگلیوں پر گنوائے جا سکتے تھے۔ جب اس بے چاری کو پہننے کے لئے اچھے کپڑے مل گئے ہوں۔ اسے اپنے آپ پر شرم آ رہی تھی۔ اس نے زندگی کا اتنا سفر اس کے ساتھ کاٹ دیا تھا۔ وہ سسکیاں لینے اور اپنے خیالات کے دھارے کا رخ بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا آج تک کسی شخص نے اپنے پاگل پن کو تسلیم کیا ہے۔ وہ اس آدمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ جو اس کی بیوی کا نیا شوہر ہو گا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ شاید اسے بہترین لباس مہیا کر سکے۔

اسی سڑک پر کچھ آگے' اسے یقین تھا کہ ایسی ہی ایک دکان ہو گی۔ وہ آہستہ آہستہ دکانوں کو دیکھتا ہوا چل پڑا۔ اداسی نے اس کے جسم کو بھی پژمردہ بنا دیا تھا۔ اس وقت وہ سر جھکائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی دوسری دکان پر پہنچتا ایک لڑکی اس کے قریب آئی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"ہیلو!" وہ بولی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ لڑکی کی طرف توجہ ہو گیا مگر اس کے بارے میں سوچ نہیں رہا تھا۔ اس کا شعور صرف ایک نسوانی ہیولے سے آگاہ تھا۔ وہ ایک معمولی سی لڑکی نظر آتی تھی دبلی پتلی مگر خوبصورت خدوخال والی۔ شروع شروع میں وہ بیوقوف بن گیا۔ وہ سمجھا کہ لڑکی راستہ بھول گئی ہے یا وہ اس سے کوئی پتہ معلوم کرنا چاہتی ہے۔

"ہیلو" اس نے جواباً کہا۔ اور اسی رفتار سے چلتا رہا۔ وہ اس کے قریب آ گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کہیں جا رہے ہوں۔ گویا کوئی ایسی جگہ تھی جہاں وہ جا سکتے تھے اور وہاں جا کر کوئی خاص مصروفیت ان کی منتظر تھی۔

وہ کچھ دیر تک خاموش رہی۔ "کیا تمہیں معلوم ہے؟" اس نے آخر کہہ ہی دیا۔ "میں جب گھر سے نکلی تھی تو میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ میں کوئی مشروب یا سینڈوچ قبول کر لوں گی۔" اس نے آہستگی سے بولنا شروع کیا تھا۔ مگر بات ختم کرتے کرتے اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔

اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ "چلی آؤ---- یہاں سردی بہت ہے۔"

بار کی نیم تاریکی میں وہ لڑکی پہلے کے مقابلے میں زیادہ کم سن اور زیادہ مغموم نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کا جائزہ لیتا رہا اور جیب میں پندرہ ڈالر گنتا رہا۔ جو اس کو آئندہ چار دن تک کام پر جانے کے لئے بس کے کرائے اور ریسٹورنٹ کے کھانے کا بل ادا کرنے کے لئے درکار ہوں گے۔ اس کے دل میں لڑکی کو اپنانے کی بے پناہ خواہش پیدا ہوئی اور پھر اس کے جی میں آئی کہ وہ گھر واپس لوٹ جائے اور اپنی مایوسیوں کو گلے لگا لے۔ حالانکہ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب ایسا کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

عورتوں کے معاملے میں وہ ہمیشہ کا شرمیلا تھا۔ اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اس سے اپنے دل کی بات کہے۔ وہ اسے کسی غلط فہمی میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ "میرا بھی کچھ زیادہ اچھا حال نہیں ہے۔" اس نے لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اور یہ پورا ہفتہ ایسے ہی گزرے گا۔"

وہ اسی طرح اس کے سامنے بیٹھی رہی۔ یوں لگتا تھا جیسے پیسوں کے معاملے میں اسے کوئی تشویش نہیں ہے۔ "بل میں ادا کر دوں گی۔ چھوٹی کوڑی والی داستان سچی نہیں تھی۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

اچانک وہ اسے ایک ننھی منی بچی نظر آنے لگی۔

"باتیں کرو۔" وہ بولی۔ اس کی آواز بھی دھیمی تھی۔ وہ اس کی طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کہیں گم ہو گئی ہو۔ "باتیں کرو۔ ہوا میں تنہائی کا زہر رچا ہوا ہے---- میں بس اسٹاپ پر گئی تھی وہاں ہجوم میں بھی سناٹا گونج رہا تھا جیسے کوئی آفت نازل ہو چکی ہو---- مجھے کسی سے بات کئے ہوئے پورا ایک ہفتہ گذر چکا ہے۔" اس نے جو کچھ کہا تھا اس کی آوازوں سے اس کی تصدیق ہوئی تھی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔ "تم بھی پاگل ہو---- تم نے اچھا سننے والا تلاش کیا ہے تم نے اچھا بولنے والا پسند کیا ہے۔"

"ہاں پاگل ہوں---- میں صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا کسی کو میرا خیال ہے---- تھوڑا سا خیال ہے---- کیا کوئی تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے---- میرے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لئے رکی، ہچکچائی اور پھر بولی---- "تم اتنے غمگین ہو---- اتنے غمگین نظر آتے ہو---- اگر ایسا نہ ہوتا تو میں شاید تمہیں مخاطب نہیں کر

سکتی تھی۔"

"کون کس کی پرواہ کرتا ہے---- تم نے کہا تھا---- چہار سو تنہائی نے جال بچھائے ہوئے ہیں۔"

وہ اسے دیکھتی رہی۔

"نورما"____ وہ بولا---- "نورما میریا"

"یہ میرا نام ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارا کیا مطلب ہے۔"

نوجوان جوڑوں کا ایک ہجوم بار کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ ہنس رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ اور پھر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا----

"انہیں کس دولت کا سراغ مل گیا ہے؟"

"انہیں بہروپ کی دولت ہاتھ آ گئی ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "میرا کچھ پینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔ آؤ چلیں۔"

وہ دائرے سے باہر نکل آئے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کار پارکنگ کی جگہ تک چلے آئے۔ ہوا پاگل کتے کی طرح ان کی ٹانگوں کو جھنجھوڑ رہی تھی لڑکی ننگے سر تھی اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

کار اچھی تھی مگر نئی نہیں تھی۔ اس نے کار چلانی شروع کی اور بہت دیر تک چلاتی رہی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا لڑکی نے اس سے اظہار محبت کی توقع وابستہ کر لی ہے اور کیا وہ واقعی اظہار محبت میں کامیاب ہو سکے گا۔ وہ لڑکی کے قریب ہو کر نہیں بیٹھا۔ اس نے ایک سگریٹ جلائی اور لڑکی کی طرف بڑھا دی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"نہیں!" لڑکی نے سگریٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے ____ کم از کم اس وقت ایسا نہیں ہے۔" وہ اس کو دیکھ کر مسکرائی۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک اور واقعہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ جب اسے اس سے بھی زیادہ شدید شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ "میں آئندہ خیال رکھوں گا۔" اس نے سرگوشی میں اپنی بیوی سے کہا تھا۔ لڑکی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"کوئی بات کرو۔" وہ بولی---- "کوئی بات کرو کہ کسی طرح تنہائی کا یہ افسوں ٹوٹ جائے۔"

"پہلے تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ گی یا میں بتاؤں؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں۔" وہ چند لمحوں تک خاموشی سے کار چلاتی رہی۔

وہ سڑکوں کو تکتا رہا۔ پھر اس کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ جہاں یوں لگتا تھا جیسے بادل نیچے اتر آئے ہوں۔ سڑک کی روشنیوں کے علاوہ اب کوئی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اس نے ایک موڑ کاٹا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ بھی بہت گھبرائی ہوئی ہے۔ پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ---- "میرا گھر اس بلاک کے آخر میں ہے۔" لڑکی نے اسے بتایا۔ "میں اپنے گھر میں اکیلی رہتی ہوں۔"

"تم تو ابھی میرے نام سے بھی واقف نہیں ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارا نام جونی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تب تھوڑا سا جھوٹ بولنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" اس نے بات بنائی۔ "مگر برسہا برس گزر گئے کہ مجھے اس نام سے کسی نے نہیں پکارا۔" اور یہ بات کرتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ جیسے وہ سچ بول رہا ہو۔

"تم اچھا جھوٹ بولتے ہو۔" لڑکی نے کہا۔

"مگر صرف اپنے بارے میں۔"

اس کا گھر ایک بڑی سفید عمارت تھا۔ ڈرائیور وے پر اور پورچ میں اندھیرا تھا۔ اس نے ایک تاریک گوشے میں گاڑی کھڑی کر دی۔

"یہ میری نانی کا مکان ہے۔" اس نے بتایا۔ "پھر میری ماں کو ملا تھا اور اب میرا ہے۔ کوئی آواز آئے تو سمجھنا کہ نانی اماں کی ہے۔ جو ماضی کے اندھیروں سے باہر آنا چاہتی ہیں۔" وہ آہستہ سے ہنس دی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ مکان آسیب زدہ ہے۔" وہ اس کو' اس کی گھبراہٹ کو اور پھر اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ چوٹ کی تکلیف اور اس کا ذہنی دباؤ ابھی کم نہیں ہوا تھا مگر اب آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ اپنے غم سے پوری طرح مانوس ہو چکا تھا۔ "آسیب زدہ؟" اسے خیال آیا کہ لڑکی کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔

"یقیناً آسیب بھی اتنے ہی تنہا ہوتے ہوں گے جتنے انسان۔" اس نے مسکرانے کی

کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ "کم از کم میرا یہی خیال ہے" اس نے ونڈ شیلڈ میں سے آسمان کی طرف دیکھا "میرا خیال ہے آج برف ضرور گرے گی۔"

"لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔" میں بہت سی باتیں فرض کر لیتی ہوں---- میں جب چھوٹی سی تھی اس وقت ایسا نہیں کیا کرتی تھی مگر اب مجھے مفروضے قائم کرنے اور بہروپ بھرنے کی عادت ہو گئی ہے' مثلاً جب ہم چھوٹے سے تھے تو ہم چور سپاہی کا کھیل کھیلتے تھے۔ کوئی چور کا روپ اختیار کر لیتا تھا اور کوئی سپاہی کا۔"

"مجھے یاد ہے۔"

"ٹھیک ہے---- اب میں نورما کا بہروپ اختیار کر لوں گی اور تم جونی بن جانا۔ کہ ہم دونوں گھر کے اندر چلیں گے۔ اور میں تمہارے لئے کھانا تیار کروں گی۔ اور جب میں کھانا پکا رہی ہوں گی تو تم رسوئی میں میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرنا---- اچھے دوستوں کی طرح---- اور مجھے بتانا کہ میں کھانا کتنا اچھا پکا لیتی ہوں---- کیونکہ---- لڑکی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے جنہیں وہ ٹپکنے دینا نہیں چاہتی تھی---- "کیونکہ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔"

"مگر تم نے صرف بہروپ بھرا ہے۔" وہ اس کھیل میں دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکا۔

"یقیناً کیا تم نے بہروپ نہیں بھرا----؟"

وہ ونڈ شیلڈ میں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کتنے ہی لمحے گذر گئے۔ پھر اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں---- مگر میں اسے اپنے ساتھ جھوٹ بولنا کہتا ہوں۔"

"ایسا تو ہے---- مگر کیا تمہیں حقیقت زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

"نہیں!" جو مل نہیں سکتا تھا اس کی تمنا اس کے دل پر بوجھ بن گئی تھی اس بوجھ کو اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا۔ اس سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ "ٹھیک ہے ہم بہروپ بھر لیتے ہیں۔"

اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا---- وہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ باہر آیا اور کار کا چکر کاٹ کر دوسری طرف کا دروازہ کھولنے لگا۔ جب وہ کار سے باہر آئی تو اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے یہ بہروپ کبھی اختیار نہیں کیا ہو گا۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"مگر اب میں یہ بہروپ اختیار کر لوں گا۔" وہ بولا---- "میں اب زیادہ محتاط انداز اختیار کروں گا۔ مگر میں اب تک کے لئے شرمندہ ہوں۔"

"شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔" اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور گھر کی طرف چل دی۔ "لوگوں کو بڑے دروازے سے گھر میں داخل ہونا چاہئے اس طرح ان کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔"

گھر عجائب خانہ نظر آتا تھا۔ فرنیچر تاریخ کے مختلف ادوار سے تعلق رکھتا تھا۔ ان میں کچھ سامان بہت قدیم اور قیمتی تھا۔ کچھ قدیم زمانے کے کانچ کے برتن بھی تھے کمرے صاف ستھرے اور سلیقے سے سجائے ہوئے تھے۔

"یہ گھر چار پشتوں سے ہمارے پاس ہے۔" وہ بولی---- جب یہ خیال آتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

"اپنے خاندان کے بارے میں میری معلومات بہت محدود ہیں۔" اس نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ بولی---- "مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں اپنی ذات پر فخر ہونا چاہئے۔"

اس نے لڑکی کا کوٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا----

"شکریہ!" لڑکی نے کہا "زینے کے نیچے الماری ہے۔"

وہ کئی کمروں سے گزرتی ہوئی مکان کے عقبی حصے میں آ گئی۔ اس نے لڑکی کا کوٹ اور اپنی جیکٹ الماری میں ٹانگ دی۔ اور انہیں کمروں سے گذرتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ رسوئی میں جا کر کام میں مشغول ہو گئی۔ رسوئی کو مکان کی قدامت کے باوجود بالکل جدید طرز پر آراستہ کیا گیا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا---- اسے اندازہ نہیں تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔

"کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ مسکرائی۔ "بس یہاں بیٹھے رہو۔" وہ رسوئی میں ادھر ادھر آتی جاتی رہی اور جلدی جلدی کام نمٹاتی رہی---- ایک لمحے کے لئے وہ اس کے پاس ٹھہری غور سے اسے دیکھا اور کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم گھر لوٹ آئے ہو۔" اس کی آواز دھیمی مگر پر اعتماد تھی۔

اسے حیرت ہوئی پھر یاد آیا---- "مجھے بھی گھر لوٹ آنے کی بہت خوشی ہے۔"

اب اس کے چہرے پر ایک دوسری قسم کی تشویش تھی۔

"تم شارلوئی سے بہت زیادہ گھل مل گئے تھے۔ کاش کہ وہ شادی شدہ ہوتی۔"

"نہیں ایسی بات تو نہیں تھی---- وہ تو بس ایک دوست تھی۔"

"دوستی گہری تھی---- اور اس کی بددماغی بھی قابل دید تھی۔"

"ہاں۔" وہ بولا---- "میں چاہتا تھا وہ میرے ساتھ چلی چلے۔ میری یہی خواہش تھی---- بہت شدید خواہش۔"

"جب سے تم گئے تھے وہ بھی غائب ہو گئی تھی اور میں نے سوچا تھا....."

"بلاشبہ، مگر میں لوٹ آیا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ مگر کبھی کبھی تم بہت تکلیف پہنچاتے ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

وہ بوکھلا گیا---- پھر اس نے دفاعی انداز اختیار کر لیا۔ وہ کسی ایسی برائی کا الزام قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جو اس میں نہیں تھی۔ "اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ تمہیں معلوم ہے اب میں ایک مختلف انسان ہوں اب مجھے غصہ نہیں آتا۔" اسے خیال آیا کہ کیا وہ واقعی سچ بول رہا ہے۔ لڑکی کی پشت اس کی طرف تھی۔ اور وہ تیزی سے کام ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شرم کی سرخی بکھری ہوئی تھی۔

"مجھے بھی ایک بات کی شرمندگی ہے۔ اگر آج تم مجھے نہ ملتے تو میں اپنی جان لے لیتی---- تمہیں گئے ہوئے کتنے دن ہو گئے تھے۔"

اس نے گھبرا کر پوچھا "کتنے دن ہو گئے ہیں۔"

"کوئی پانچ ماہ---- تمہاری والدہ نے کل ٹرنک کال پر بات کی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تم ساحل پر ہو۔ وہ انگوٹھی واپس لینا چاہتی تھیں۔ ان کی آواز میں خنجر کی کاٹ تھی۔" پھر وہ کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "تم اتنی جلدی گھر کیسے لوٹ آئے۔"

"میں ہوائی جہاز سے آیا ہوں۔" ان تمام باتوں کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھا۔ اس کے نزدیک گیا۔ اور اس کے شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"کبھی کبھی" وہ بولی---- "تم اپنے ہاتھ یہاں رکھا کرتے تھے۔"

اس نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنے بالوں پر رکھ لئے۔ "اگر تم تھوڑا سا سہلا دو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" اس نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنی

شروع کر دیں۔

"شکریہ!" اس نے آہستہ سے کہا۔

پیالہ اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ "ایک مرتبہ پھر شکریہ!" وہ بولی۔ وہ اپنی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ "خودکشی؟" کیسی حیرت انگیز بات ہے۔ یہ لڑکی تو اس سے بھی زیادہ دکھی تھی۔ پھر اس نے سوچا نہیں اس کا اپنا غم سب سے زیادہ گہرا ہے اسے خیال آیا کہ نہ جانے ابھی کتنی اور پیچیدگیاں اس کے سامنے آنے والی ہیں۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر وہ کیوں اس معاملے میں الجھا ہوا ہے۔۔۔۔

"میری نانی اماں نے بڑی مطمئن اور مسرور زندگی گذاری لڑکی نے کہا۔ "بہترین مکان' محبت کرنے والا شوہر' پیارے پیارے بچے مگر میری اماں اتنی مطمئن اور مسرور نہیں تھیں۔ میں نے انہیں تہہ خانے میں پہنچا دیا ہے۔"

"اپنی اماں کو؟"

"نہیں۔ تم جانتے ہو ہم نے انہیں کب دفنایا تھا۔ مگر دادی اماں کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میں بالکل چھوٹی سی تھی۔ میں نے ان کی تمام چیزیں تہہ خانے میں پہنچائی تھیں۔۔۔۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔۔۔۔ پتہ نہیں کیا کہا تھا۔ وہ باتیں جو بچوں سے کہی جاتی ہیں۔ وہ اس وقت سے تہہ خانے میں رہتی چلی آ رہی ہیں مگر میں نے دروازہ مقفل کر دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں اور چلی جائیں۔ تم سمجھتے ہو نا؟"

"مگر خودکشی؟"

"سوتے میں۔۔۔۔ ایک خاص طریقے سے۔۔۔۔ کسی خاص دن۔۔۔۔ اور وہ دن آج رات کو آ جاتا۔۔۔۔ تنہائی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے جب تم چلے جاتے ہو۔۔۔۔ جب تم نہیں ہوتے ہو۔۔۔۔ جب کوئی نہ رہے جس سے دل کی بات کہی جا سکے۔ میرا مطلب ہے جب کوئی آشنا نہ ہو۔۔۔۔" ابھی تک لڑکی اس کی طرف پیٹھ کئے ہوئے کھڑی تھی۔ اس نے لڑکی کے جسم میں اضطراب کی رو کو مچلتا دیکھا' اس کو مٹھیاں بھینچتے ہوئے دیکھا اور اس کی آواز کی تلخی کو محسوس کیا۔ پھر اس کے ہاتھ ذرا ڈھیلے پڑے۔ اس کی آواز دھیمی ہوئی اور وہ بولنے میں دشواری محسوس کرنے لگی ____ حالات پہلے سے زیادہ بگڑ گئے تھے۔

"جب کوئی خیال رکھنے والا نہ رہے تو آخر کیا کیا جائے؟"

"تمہارا کیا کرنے کا ارادہ تھا؟" وہ اپنی آواز کے ٹھہراؤ پر اچنبھے میں رہ گیا۔

"میں چابی اٹھاتی اور دروازہ کھولنے کے لئے تالا کھولتی۔ پھر میں سیڑھیاں اتر جاتی۔ سیڑھیاں بہت تنگ اور عمودی ہیں۔ میں ان کے پاس جاتی اور سوتے میں انہیں پکڑ لیتی۔ میں پکارتی "نانی اماں---- نانی اماں۔" اور وہ میرے پاس چلی آتیں جیسے بچپن میں آ جایا کرتی تھیں۔ ایک زمانے میں میرے پاس ایک کتا تھا ____ تمہیں یاد ہے نا؟ میں نے تمہیں بتایا تھا مگر وہ مر گیا---- کتا مجھ سے محبت کرتا تھا۔ میں جب چھوٹی سی تھی تو اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اور نانی اماں مجھ سے محبت کرتی تھیں---- وہ مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیں گی---- اپنے سینے سے لگا لیں گی۔ اور ایک مرتبہ پھر مجھے چھوٹی سی بچی بنا دیں گی۔ کیونکہ ____ کیونکہ....." اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ جذبات آنسو بن کر آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ "کیونکہ میں عورت بن کر ہزاروں عیبوں کا مجموعہ بن گئی ہوں۔"

وہ جلدی سے اس کے پاس گیا---- اس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ روتی رہی۔ اس کے بازوؤں میں اس کا جسم پتھر کی سل بن گیا تھا---- اس کا جسم دبلا پتلا اور متناسب تھا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا وہ کون ہے! وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا نام کیا ہے؟

"نورما" اس نے کہا اور اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

لڑکی نے اپنا چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو بھرے ہوئے تھے---- "کیا تمہیں میری محبت کی ضرورت ہے---- کیا تمہیں میری محبت کی ضرورت ہو گی---- مجھے تو تمہارا بے انتہا پیار چاہئے۔" پھر اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

"میں کوشش کروں گی---- میں دیوانی ہوں---- میں بہت بڑی پاگل ہوں----"

"اپنے آپ کو سنبھالو۔" وہ بولا---- اب اسے ڈر لگنے لگا تھا۔

"آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔" وہ اسے کرسی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

"نہیں" وہ بولی---- "میں ٹھیک ہوں---- میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

وہ اس کی طرف بڑھی۔ اس نے اس کے بال سہلانے شروع کر دیئے۔ وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر اس کی سسکیاں رک گئیں۔ وہ چپ چاپ کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی۔ اور جب واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں رومال تھا۔ اب وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں نے تمہیں تلاش کرنے کے لئے چھٹیاں لے لی تھیں۔ پورے دو ہفتے کی۔" لڑکی نے کہا۔

اس مسلسل بہروپ پر اسے غصہ آنے لگا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے

ردعمل کا اظہار کیا اور ہونٹوں کو سی کر بیٹھ رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی کو اس کی ضرورت ہے اور یہ ایک نیا اور مسرت بخش احساس تھا۔

"میں نے ملازمت تبدیل کر لی ہے۔" اس نے لڑکی سے کہا۔ "پہلی ملازمت اتنی اچھی نہیں تھی۔ "اس کے گرد غلط بیانیوں کا ایک ہجوم لگتا چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی بہروپ بدلنے کی صلاحیت پر حیران تھا۔" میں کچھ بہتر کام کرنا چاہتا تھا۔"

"بہتر۔۔۔۔؟"

"اس کام کو اس وقت اچھا نہیں کہا جا سکتا۔" اسے اپنی آواز میں شرمساری کی جھلک محسوس ہوئی۔ "کچھ عرصے بعد ترقی ہو جائے گی۔"

"اوہ! پیسوں کی فکر مت کرو۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔۔۔۔ تم اس خیال کو دل سے نکال دو۔" وہ کھڑکی کی طرف گئی اور جب واپس آئی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"دیکھو۔" وہ بولی۔۔۔۔ "میرا خیال درست تھا۔۔۔۔ برف باری شروع ہو گئی ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ برف کے گالے ہوا میں اڑ رہے تھے۔۔۔۔

"ابھی تو بہت کم ہے۔"

"زیادہ بھی ہو جائے گی۔" وہ میز پر برتن لگا رہی تھی۔ "میں نے تھوڑی سی پی لی ہے۔" اس کی آواز میں معذرت کا انداز تھا۔۔۔۔ "بس ذرا سی پی ہے۔"

اس نے جلدی سے اس کی طرف دیکھا۔۔۔۔

"تمہیں میز سجانا خوب آتا ہے۔" اس نے کہا۔

"شکریہ!"

"اور گھر بھی بہت اچھا ہے۔"

"میں نے تمہارے انتظار میں گھر کو صاف ستھرا رکھا ہے۔۔۔۔ آؤ سردی بڑھنے سے پہلے کھانا کھا لیں۔"

کھانا لذیذ تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی کھانا ختم کر لیا۔۔۔۔ اب وہ اسے زیادہ پرسکون نظر آ رہی تھی۔ ایک یا دو مرتبہ ماحول کی اجنبیت نے اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یا وہ لڑکی کو دیکھتا تھا۔۔۔۔ اور اپنے کردار کے لبادے میں چھپ جاتا تھا۔ پھر اسے اپنی بیوی اور اس سے جدا ہونے کی باتیں اور زندگی کی بے مقصدیت یاد آ جاتی۔۔۔۔ اس کا ذہن اذیت کے

بھنور میں ڈوب جانا چاہتا تھا۔ مگر ہر مرتبہ وہ کوئی نئی بات چھیڑ دیتا۔

"جب میں چھوٹا سا تھا" اس نے لڑکی کو بتانا شروع کیا---- "ہم ایسی برفباری کو بڑے اشتیاق سے دیکھا کرتے تھے۔ ہم سب اس کے لئے ترستے تھے۔ اگر برفباری سال کے آغاز میں ہوتی جیسے آج ہو رہی ہے تو میرے ابا کچھ دیر کے لئے باہر نکل آتے اور اگر برف زیادہ گرتی تو وہ باڑے میں سے برف گاڑی نکال لاتے۔"

"میرے پرنانا کا ایسی ہی ایک رات میں انتقال ہوا تھا۔" لڑکی نے کہا۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ مجھے اس واقعے کی تفصیلات میں برف ہی سب سے زیادہ یاد ہے۔ مجھے برف سے ہمیشہ سے پیار ہے---- برف---- جیسے صبح سویرے کی تازگی اور شگفتگی کا آغاز ہو۔"

"ہمیشہ سے"____ وہ اسے شکایت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ تم کبھی دیہات میں بھی رہے ہو---- تمہیں پرنانا کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے۔"

"ہاں----!"

وہ مسکرائی اور پھر میز کی صفائی کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔

پھر جب وہ برتن دھونے لگی تو وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پہلو بہ پہلو کھڑے چپ چاپ کام کرتے رہے۔ وہ پلیٹیں خشک کر کے رکھتا رہا۔ جب کام ختم ہو گیا تو لڑکی نے پلیٹیں اٹھا کر الماری میں رکھ دیں۔

"کیا تمہیں معلوم ہے۔" لڑکی بولی۔ "میں بہت تھک گئی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج کل میں بہت جلدی تھک جاتی ہوں۔"

وہ اسے دیکھتا رہا۔ "مجھے اس کا احساس ہے کیونکہ میرا بھی یہی حال ہے۔" لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسری منزل پر جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ وہ اس سے علیحدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا----

"نہیں" وہ بولی۔ "اس طرف پرانی چیزوں کے گودام کا دروازہ ہے۔" اس کی آواز پراعتماد تھی۔ اس نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے خواب گاہ کی طرف لے چلی۔ کمرے میں

گہرا اندھیرا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ کھڑکی کے باہر درخت تھے جن کی شاخوں میں سے چھن چھن کر باہر کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ برف باری شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ ہوا بھی تیز ہو گئی تھی۔

"ذرا دیر کے لئے یہاں ٹھہرو۔" اس نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ وہ کھڑکی کے باہر دیکھتا اور اس کے لباس کی سرسراہٹ سنتا رہا۔۔۔۔

پھر لڑکی نے بولنا شروع کیا تو اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ "تم مجھے دیکھا کرتے تھے اور میں کس قدر شرمایا کرتی تھی۔ مجھے اب بھی شرم آتی ہے۔۔۔۔ مگر اتنی نہیں۔۔۔۔"

وہ برف کے گالوں کو آسمان کی چادر سے گرتے دیکھتا رہا۔ سڑک کی روشنیوں میں جب برف کے گالے ادھر ادھر اڑتے دکھائی دیئے تو اس کی نگاہوں میں برسوں کا جانا پہچانا منظر گھوم گیا۔۔۔۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کا آدھا دھڑ بے لباس تھا۔

"مجھے تم سے پیار ہے" اس نے کہا۔ "یہ میری حماقت تھی کہ میں نے تم پر شک کیا۔ برف میں دھندلائی ہوئی باہر سے آنے والی روشنی میں بھی اس کی چھاتیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ نیچے سایہ تھا۔ روشنی اس کے چہرے اور بالوں پر بھی بکھری ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت بے انتہا خوبصورت اور پرکشش نظر آ رہی تھی۔ پھر اس کے چہرے پر خوف کی ایک ہلکی سی پرچھائیں پڑنے لگی۔۔۔۔

"ہم ایک مرتبہ پہلے بھی یہاں اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔" لڑکی نے زیر لب کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔۔۔۔ مگر اسے احساس تھا کہ خوف کی موجودگی اور یہ بہروپ بھر کر وہ محبت نہیں کر سکتا۔۔۔۔

"کیا تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آ رہی ہے۔" لڑکی نے مسکراتے ہوئے۔ "مگر پہلے مجھے ایک مرتبہ سینے سے لگا لو۔"

اس نے لڑکی کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

"شکریہ!" وہ بولا۔۔۔۔ مگر شکریہ کس بات کا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا۔

"آؤ۔" لڑکی اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر کی طرف لے گئی۔ بستر کمرے کے ایک تاریک گوشے میں تھا۔ وہ لیٹ گئی۔ اس نے اپنے جوتے اتارے اور اس کے پاس لیٹ گیا۔ اس نے اسے چھوا نہیں۔ وہ خاموش تھے۔ وہ لڑکی کے تنفس کی آواز سنتا رہا۔ اسے یوں لگا جیسے

وہ نیم تاریک کمرہ سوالات سے بھرا ہوا ہے اور زیادہ تر سوالات اس کے اپنے بارے میں ہیں۔

"نورما۔"

"ہاں۔"

"کیا اب تک بہروپ قائم ہے۔"

"پتہ نہیں۔۔۔۔ شاید کسی حد تک۔"

"وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔"

"میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ہی مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میرے علاوہ کسی اور کی بھی غلطی ہو سکتی ہے۔"

اس نے لڑکی کا ہاتھ چھو کر دیکھا۔ کوئی رد عمل نہ ہوا۔ اس کا تنفس بہت دھیما تھا۔ لمحہ بھر کے لئے ہر بات اسے ناگوار نظر آنے لگی۔

"ہو سکتا ہے میرا فیصلہ درست ہو۔" وہ بولا۔۔۔۔ "کوئی کب کسی کی پرواہ کرتا ہے ہو سکتا ہے کہ کوئی کسی کا خیال کرتا ہی نہ ہو۔"

"نہیں ایسا مت سوچو۔" لڑکی نے کہا۔۔۔۔ "تمہارے احساسات غلط ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ صرف تمہارا ہی خیال نہ کرتے ہوں۔ ممکن ہے کسی کی بھی پرواہ نہ ہوتی ہو۔ میرا سوال نہیں ہے۔ مگر ہر شخص کو یہ خیال اذیت دیتا ہے کہ کوئی کسی کا خیال نہیں کرتا۔"

"مگر یہ بات کافی نہیں ہے۔۔۔۔ یا کافی ہے؟"

"نہیں۔۔۔۔ یہ کافی نہیں ہے۔۔۔۔ مگر یہ بات موت سے بچانے کے لئے کافی ہے اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"میرے دل میں دوسروں کا بھی خیال رہتا ہے....." پھر یکلخت اسے خیال آیا کہ وہ کیا کہہ گئی ہے۔ اس نے احساس فخر کی تلافی کرنا چاہی۔

"میرا دل بھی"۔۔۔۔ وہ بولی۔ "مگر مجھے لگتا ہے کہ میں ساری عمر بہروپ بھرتی رہی ہوں۔ کیا تم کسی ایسی چیز کا روپ اختیار کر سکتے ہو جس کا حقیقی وجود نہ ہو۔"

"میرا خیال ہے۔ یہ بات ہم نے ابھی تک نہیں سیکھی" اس نے لڑکی کا ہاتھ ایک مرتبہ پھر چھو کر دیکھا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"صبح جب ہماری آنکھ کھلے گی تو میں تمہیں ہیلو کہوں گا۔ میں کہوں گا میں تم سے محبت

کرتا ہوں نورما اور تم کہو گی....."

"میں کہوں گی میں تم سے محبت کرتی ہوں جونی"

"اور میں دفتر چلا جاؤں گا۔"

"اگر سڑکیں اس قابل ہوئیں تو میں تمہیں کار میں دفتر تک چھوڑنے کے لئے جاؤں گی اور جب دفتر ختم ہو جائے گا....." وہ یکلخت خاموش ہو گئی۔ وہ بڑی شدت سے اسے یہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ واقعی کل کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ مگر اس کی زبان پر جو الفاظ آئے وہ مختلف تھے۔

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"حقیقت یہی ہے---- ہاں---- حقیقت یہی ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس طرح بہروپ بھرنا بہت مشکل ہے جونی" پھر لڑکی نے اس کی طرف کروٹ بدل کر شرماتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے کہ ہم سو جائیں کیا تم ایک بہروپ اور بھرو گے بشرطیکہ اس سے تمہیں تکلیف نہ ہو۔ کیا تم مجھے بوسہ دو گے' مجھے شب بخیر کہہ سکو گے۔ اور مجھے کیتھرین کہہ کر پکار سکو گے---- کیتھی نہیں کیتھرین۔ پھر میں جو تم چاہو گے وہ بہروپ بھر لوں گی---- اور تمہیں....."

اس نے اسے سینے سے لگا کر پیار کر لیا۔ اس مختصر سے بوسے کے ردعمل پر اسے حیرت ہوئی۔ اپنے بازوؤں میں اسے لڑکی کا جسم جانا پہچانا محسوس ہوا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ مانوسیت نورما کے پیکر کی تھی۔ جو وہاں موجود نہیں تھی یا اس اجنبی کی جو وہاں موجود تھی اس کے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان آ گیا۔ اس نے ایسے طوفان میں گھرے ہوئے ایک زمانہ گزار دیا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے دیوار بن گئی۔

"شکریہ کیتھرین" اس نے لڑکی سے کہا۔ "اور ایک بات اور جو ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی ہے---- شاید یہ ضروری ہے کیتھرین کہ پہلے تم اپنے آپ سے تھوڑا سا پیار کرو۔"

لڑکی نے اس کے بالوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسے لڑکی کی پشت پر اپنا ہاتھ بہت ضروری امر نظر آیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی ہاتھ کے لمس کو کیسا محسوس کر رہی ہو گی۔

"بہروپ بھرو۔ کیتھرین" اس نے نہایت آہستگی سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "شب بخیر کیتھرین۔" اس نے کہا----

غیر ملکی ادب

اس کا گاؤں

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا' صبح سویرے ورزش' اس کے بعد ٹھنڈے پانی میں غسل اور پھر ترکی تولئے سے اپنے جسم کو جو اب فربہ ہو گیا تھا اتنا رگڑنا کہ سرخ ہو جائے اور پھر آرام کرسی میں نیم دراز ہو کر ناشتے سے پہلے کل کے اخبارات پر ایک نگاہ!

وہ بھی ایک ایسی ہی صبح تھی۔ ورزش' غسل' تولئے سے جسم کی مالش اور پھر اخبارات! وہ ناشتے کے لئے اٹھنے ہی والا تھا کہ مقامی اخبار کے آخری صفحے پر سیاہ حاشیے میں گھرے ہوئے ایک اعلان نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"پارٹی اور ڈیمیانوسک کے تمام سوویت ادارے رنج و ملال کے ساتھ ڈاکٹر کینا آیوٹونونا کو ولیوبا کی بے وقت موت کا اعلان کرتے ہیں تجہیز و تکفین کی رسومات....."

اس نے اس تعزیتی اعلان کی طرف توجہ نہ دی ہوتی اگر مرحومہ کے نام کے ساتھ خاندانی نام موجود نہ ہوتا۔ اس کا خاندانی نام کودلیوف تھا یہ بات بھی نہیں تھی کہ یہ نام کسی اعتبار سے غیر معمولی یا غیر مانوس ہو۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تو اسے خیال آیا کہ یہ صرف نام کی مماثلت کی ہی بات نہیں ہے بلکہ اس احساس میں خود کینا بھی شامل ہے جو کالج کے زمانے میں اس کے ساتھ رہی تھی اور جس سے اسے محبت تھی!

یہ کوئی تیس برس ادھر کی بات ہے۔ وقت' فاصلوں کی طرح ہر چیز کو دھندلا دیتا ہے۔ کینا کے لئے اس کا عشق اور جرم دونوں ہی باتیں آہستہ آہستہ ماند پڑ چکی تھی۔ لیکن اب وہ دنیا سے رخصت ہو چکی تھی تو یادیں طوفان کی طرح بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ جیسے کوئی چیز دھند سے نمودار ہوتی ہے۔ کینا کا چہرہ اس کے سامنے ابھرتا چلا آیا۔ ایک ہنستی کھیلتی لڑکی' ٹیونک پہنے جیسے کو مسومول کے تمام اراکین پہنا کرتے تھے بال لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے' دبلی پتلی کمزور گردن.....

"میں ایک یتیم خانے سے آئی ہوں---- اور تم؟" اس نے پوچھا تھا۔

"میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"بڑے خوش نصیب ہو۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ جنگ میں مارے گئے تھے۔ اور مجھے اپنی ماں بھی اچھی طرح یاد نہیں ہیں۔"

اس کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے تھے اور جب وہ ہاتھ ملاتی تھی تو اس کا پورا ہاتھ اس کی گرفت میں غائب ہو جاتا تھا۔

"سچ مچ مجھے تم پر رشک آتا ہے" وہ کہتی۔ "ایک ڈاکٹر کے ہاتھ قابل بھروسہ اور مضبوط ہونے چاہئیں مگر یہ....." وہ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اس کے سامنے پھیلا دیتی۔ کودلیوف دیکھتا اور حیرت کرتا۔ بالکل بچوں کے سے ہاتھ تھے۔ اس کا قد بھی چھوٹا تھا۔ وہ اس کے شانوں تک آتی تھی۔ حالانکہ اس کا قد بھی بڑا نہیں تھا۔

اضطراب کے عالم میں کودلیوف اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اسے خیال آیا کہ ماضی کے بارے میں سوچتے رہنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ تین دہائیں گزر چکی ہیں۔ اس نے اپنی زندگی گزار دی۔ وہ بھی اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب ماضی کا یہ سائے کس لئے؟ ان سے اب کیا حاصل؟

اکتوبر آ گیا تھا مگر موسم خشک تھا اور آسمان صاف تھا' سورج کی ایک ترچھی کرن دیوار پر پڑ رہی تھی جس سے دیوار پر لگی ہوئی تصویر کے کانسی کے بھاری فریم کا ایک گوشہ روشن ہو گیا تھا اور تصویر کا یہ روشن گوشہ---- اس جنگل کا سرا جس میں سے نیلے آسمان کا ایک ٹکڑا بھی نظر آ رہا تھا۔ اسے ایک عجیب و غریب انداز سے ماضی کی یاد دلاتا نظر آیا۔ اسے وہ دن یاد آنے لگے جب وہ اور کسینا ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔

"گوگا۔"

اس کی بیوی مطالعے کے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ اس نے جاپانی سلک کوٹ پہنا ہوا تھا جس پر اڑتے ہوئے پرندوں' دلدل' گھاس اور آدمیوں کی چھوٹی چھوٹی شبیہیں چھپی ہوئی تھیں۔

"ناشتہ تیار ہوئے زمانہ گذر گیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے پیار سے تنبیہ کی تھی۔

"میں ناشتہ نہیں کروں گا۔" کودلیوف نے بیوی کے نامناسب "گوگا" اور کوٹ پر اڑتے ہوئے پرندوں سے جھنجلا کر ترش روئی سے کہا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے حیرت سے شانے اچکاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ پھر جیسے وہ

معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئی ہو اس نے سوال کیا "کیا بوردف رقم ادا نہیں کرے گا۔"

اس کی زندگی میں آجکل یہی ایک مسئلہ تھا۔ وہ ادھار دینے کے قائل نہیں تھے مگر انہوں نے بعض وجوہ کی بناء پر اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب اسے یہ خیال پریشان کئے ہوئے تھا کہ بدنصیب بوردف ایک ہزار روبل کا قرض لوٹا بھی سکے گا یا نہیں۔۔

"خدا کے واسطے!" کودلیوف نے کہا۔ "کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی کہ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی کبھی خوش ہوتا ہوں اور کبھی غمزدہ کیا مجھے ایک گھنٹہ بھی ایسا میسر نہیں آ سکتا جسے میں اپنا کہہ سکوں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس کی بیوی نے آواز بلند کرنے اور اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔ "تم جتنی دیر چاہو تنہا رہ سکتے ہو۔ تمہیں یہ تسلیم کر لینا چاہئے تھا کہ تم مجھ سے کبھی کے اکتا چکے ہو۔ تمہاری عمر میں لوگوں کے دماغ چل جاتے ہیں اور وہ اپنے گھربار کو چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔۔۔۔ تم بھی یہی کرو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جب وہ آخری الفاظ ادا کر رہی تھی تو اس کی آواز لرز رہی تھی پھر وہ اپنی بھری بھری چھاتیوں کو اپنی چھوٹی گرہ دار انگلیوں سے بھینچتی ہوئی کمرہ سے باہر نکل گئی۔

"اوہ پیاری۔۔۔۔ اوہ پیاری" وہ سر کی پشت کو دونوں ہاتھوں سے سختی سے بھینچتے ہوئے کراہا۔۔۔۔

انسانی حماقت اور بے سرو سامانی پر غصے کا دورہ جب گذر گیا تو اس نے اعلان کو دوبارہ پڑھا۔

ڈیمیا نوسک..... اس نے زیر لب دہرایا اور اسے یاد آیا کہ یہ وہ قصبہ تھا جہاں ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد اس کی اور کیسنا کی تقرری ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ساری زندگی وہیں گزار دی تھی کودلیوف نے سوچا اور ایک مرتبہ پھر اسے احساس جرم نے گھیر لیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے کم از کم اسے رخصت کرنے کے لئے تو ضرور جانا ہی چاہئے۔....."

"میں جا رہا ہوں مجھے ایک رفیق کو رخصت کرنا ہے۔" کودلیوف نے اپنی بیوی سے کہا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ "رفیق" سے اس کی مراد کیا ہے اور "رخصت" وہ کن معنوں میں استعمال کر رہا ہے مگر اس کی بیوی نے احتجاجاً" اپنے ہاتھ بلند کرتے ہوئے اسے روک دیا اور کہا۔ "اسے رخصت کرنے کی ضرورت نہیں، تم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ جا سکتے ہو

مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

بجلی کی گاڑی خالی کھیتوں سے' جنگلوں سے جنہیں خزاں کے ہاتھوں نے گیروی لباس پہنا دیا تھا اور دیہاتوں سے جو بارش میں دھندلا گئے تھے گزرتی چلی گئی۔ صبح سے آسمان صاف تھا مگر اب ہر طرف بادل چھائے ہوئے تھے اور قطار اندر قطار حرکت کر رہے تھے۔ سب سے نیچے چھدرے اور دھوئیں ایسے بادل تھے' اور ان کے اوپر زیادہ گہرے اور سیاہ رنگ کے کناروں والے تھے اور ان کے بھی اوپر پورا آسمان یخ بادلوں سے گھرا ہوا تھا جن کے اس پار دیکھنا ممکن نہ تھا---- فضا پژمردہ اور اکتا دینے والی تھی اور یہ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ کہیں دور بلندی پر بادلوں کے اس پار سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ وہ جدھر بھی نگاہیں اٹھاتا وہی اداس اور پژمردگی کی چادر پھیلی نظر آتی۔ سیاہ جلی ہوئی سی شاخوں والے برہنہ درخت تیزی سے گزرتے چلے جاتے اور گرے ہوئے پتوں سے زمین کا فرش پیلا نظر آنے لگا تھا۔

وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور ماضی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اس نے اس لائن پر کیسنا کے ساتھ بھی سفر کیا تھا۔ گاڑی رینگ رہی تھی اور ہر اسٹیشن پر اس طرح رک جاتی تھی۔ جیسے آگے جانے کا ارادہ ہی نہ ہو۔ ڈبہ آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا' لوگ دروازوں اور خالی جگہوں میں بھی کھڑے ہوئے تھے۔ مگر ان دونوں کی قسمت نے یاوری کی تھی انہیں لیٹنے کی جگہ مل گئی تھی اور وہ سفر کے دوران والہانہ انداز میں ایک دوسرے کو چومتے رہے تھے۔

"مجھے تم سے پیار ہے---- بے انتہا پیار!" کیسنا نے سرگوشی میں کہا تھا۔ اس نے اس کے سانس کی حدت اپنے گالوں پر محسوس کی۔ اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھوں' کانپتی پلکوں اور جذبات سے تنے ہوئے ابروؤں کو دیکھا اور خوش ہوا کہ یہ سب کچھ اس کے لئے ہیں' وہ خوش تھا کہ وہ دونوں ڈاکٹر تھے اور خدا جانے کہاں جا رہے تھے۔ وہاں انہیں ایک ساتھ رہنا ہو گا اور وہ دونوں ایک دوسرے کے رفیق ہوں گے۔ وہ بھی خزاں کا زمانہ تھا مگر ایسی پژمردگی نہیں تھی۔ وقت ان کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا' ان کے سامنے ابدیت پھیلی ہوئی تھی ازکراں تاکراں۔'

بجلی کی گاڑی کی سیٹی گونجتی رہی۔ ہر اسٹیشن پر لوگ اترتے اور چڑھتے رہے اور ڈبے میں مسافروں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہی۔

کودیلوف اس طرح سمٹ کر بیٹھ گیا جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ ڈیمیانوسک ابھی کتنی دور ہے؟" اس نے پاس بیٹھے ہوئے مسافر سے جس کی ناک لمبی تھی اور جس نے بدنما جیکٹ پہنا ہوا تھا پوچھا۔

پڑوسی مسافر نے اس کے لباس کا غور سے جائزہ لیتے ہوئے ناگواری سے کہا---- "کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں نہ بتا سکوں۔ تیسرے اسٹیشن پر اتر جانا۔"

کودیلوف کو حیرت ہوئی۔ گویا سارے سفر میں صرف دو گھنٹے صرف ہوئے ہوں۔ لیکن اس وقت گاڑی تقریباً سارا دن دینگتی رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک اسٹیشن پر کھولتا پانی لینے کے لئے اترا تھا اور دوسرے اسٹیشن پر اس نے ابلے ہوئے آلو خریدے تھے۔ کسینا نے ہنستے ہوئے ساری چیزیں کھڑکی میں سے لے لی تھیں اور اس کے بعد ان کا سفر جاری رہا تھا اور وہ ایک دوسرے سے پیوست ہوئے خاموش بیٹھے رہے تھے۔

ڈیمیانوسک میں وہ بوڑھے آدمی کے ساتھ گاڑی سے اتر آیا۔

"کیا آپ مجھے شہر کے ہسپتال کا راستہ بتا دیں گے؟" اس نے پوچھا۔

بوڑھے نے پھر اسے سنجیدہ اور ناہمواں نگاہوں سے دیکھا اور اسی سردمہری سے جواب دیا۔

"کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں نہ بتاؤں' یا کوئی ہے؟ سیدھے چلے جاؤ' پر پوکرو وسکایا گلی میں مڑ جاؤ۔ وہاں کسی سے پوچھ لینا۔ کوئی بھی تمہیں ہسپتال تک پہنچا دے گا۔" وہ ٹھہر گیا اور پھر اطمینان سے بولا---- "ملال ہمیں ہماری حدود میں رکھتا ہے....."

کودیلوف جس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ بوڑھا اتنا بدمزاج کیوں ہے کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ڈیمیانوسک اتنا بدل گیا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ کچھ سڑکیں جن پر گاڑی کے پہیوں کے گہرے نشان تھے' دلدلیں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سب ہی غائب ہو چکے تھے۔ اب شہر میں پتھر کے بنے ہوئے دو منزلہ مکان اور خوبصورتی سے سجائی ہوئی دوکانیں اسٹیشن سے شروع ہو کر ہر طرف پھیلی نظر آتی تھیں اور کیونکہ کودیلوف کو کوئی مانوس شے نظر نہیں آتی تھی شاید اس لئے ڈیمیانوسک نے اس پر خوشی یا رنج کا کوئی تاثر مرتب نہ ہونے دیا۔ بس یہ ایک احساس ضرور تھا کہ یہ وہی شہر تھا۔

گرے ہوئے پتے راستوں پر اڑ رہے تھے اور دروازوں' باڑوں اور احاطوں کے کونوں

میں جمع ہو رہے تھے۔ پہلی جماعت کے بچے اپنی نئی وردیوں میں بڑے بڑے .بستوں کو گلے میں لٹکائے' اسکول سے باہر آ رہے تھے۔ گھریلو خواتین خریداری کے بعد بھاری بھاری تھیلے اٹھائے تیزی سے گھروں کی طرف قدم اٹھا رہی تھیں۔ کودلیوف کو یہاں کوئی جانی پہچانی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ پھر اچانک گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں اور ایک موڑ سے ٹرام نمودار ہوا اور گھڑگھڑاتا ہوا گذر گیا۔ اس کے نوجوانی کے ایام دوڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھ آئے۔ ایسے ہی ٹرام میں وہ کتنی ہی مرتبہ کیسنا کے ساتھ اپنے انسٹی ٹیوٹ گیا تھا وہ دونوں ٹرام کے کھلے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے ٹھٹھر گئے تھے۔ ٹرام دیکھ کر اس پر اداسی کا شدید حملہ ہوا تھا جسے وہ نظرانداز ہی کر سکتا نہ اس سے پیچھا ہی چھڑا سکتا تھا۔

پوکرو دسکایا گلی کافی چوڑی اور لمبی نکلی۔ کودلیوف اس کے آخری سرے تک چلا گیا' پھر راستہ پوچھتا ہوا کئی گلیوں سے گذرا اور آخر ہسپتال کے لوہے کے پھاٹک کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ تجہیز و تکفین کی رسومات کہاں ادا کی جا رہی ہیں۔ سامنے ہی ایک نوٹس لگا ہوا تھا۔

پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اسے تعزیتی موسیقی سنائی دینے لگی اور یہ سوچ کر اس کا دل بوجھل ہونے لگا کہ یہ موسیقی کیسنا کے لئے ہے۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ وہ کلب میں نہ جائے جہاں یہ رسومات ادا کی جا رہی تھیں۔ اس آخری ملاقات کا آخر مقصد کیا تھا؟ اسے رخصت کہنے کے لئے۔ مگر اب اسے ہر چیز یا کسی بات کی ضرورت نہیں تھی---- اور خود وہ؟ وہ کیوں پریشان تھا؟ وہ چوڑے اور گھسے ہوئے زینے پر قدم بڑھا رہا تھا۔ جیسے وہ کھڑی پہاڑی چڑھائی پر چڑھ رہا ہو۔ اس نے آخری قدم اٹھایا اور دروازے پر پہنچ گیا جہاں سے وہ جھکے ہوئے شانوں' ننگے سروں اور ان سے آگے دھندلی روشنی میں سبز پتوں اور خزاں سے بچھے رہنے والے پودوں سے چھپا ہوا' سرخ پھولدار کپڑے میں لپٹا ہوا چھوٹا سا جنازہ بڑی اونچی میز پر رکھا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

فوجی بینڈ چوپن کی تعزیتی دھن بجا رہا تھا۔ رنج و ملال کی بوجھل فضا میں موسیقی نے اس دکھ کو اور گہرا کر دیا جو اس کے کھو جانے کے سبب سے اس کے سینے پر پتھر کی طرح رکھا تھا۔ بے شمار آنکھیں اشکبار تھیں۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے کودلیوف نے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا جس کے ساتھ کبھی اس نے زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔

اب بھی کفن کی چادر کے نیچے وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ ننھی منی سی ہے۔ اس کے سینے پر

بندھے ہوئے ہاتھ صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کا سر اور سرد مہر چہرہ آج بھی اسے بہت دور اور اپنی پہنچ سے باہر نظر آیا۔ اس نے اسے پہچان کر اپنا سر جھکا دیا۔

خاموشی چھا گئی پھر بوڑھاپے کے ضعف میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ایک خمیدہ کمر بوڑھا جنازے کے پاس کھڑا ہوا تھا اس کا سر دائیں شانے پر جھکا ہوا تھا اور گردن کی کھال ایسی تنی ہوئی تھی جیسے کسی نے اسے کھینچ دیا ہو۔

"ڈیمیانوسک میں اب امن و امان ہے۔" اس نے کسینا کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن آپ رات کو باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ حالات بہت خراب تھے۔ جیسا کہ آپ سب کو معلوم ہے اشتمالیت کا کام جاری تھا..... کولک پریشان کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ پر گولی چلائی---- کسینا نے وہ گولیاں یہاں سے اور یہاں سے نکالی تھیں۔ "اس نے اپنے سینے اور گردن کی طرف اشارہ کیا۔ "اور مجھے دے دیں کہ میں انہیں نشانی کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھوں۔" بوڑھے نے مٹھی کھولی تاکہ ہر شخص ان پچکی ہوئی انگلیوں کو دیکھ لے۔

کودلیوف کو یاد آیا کہ ان دنوں حالات ایسے ہی تھے مگر اس نے اس جگہ کو دوسری وجوہ کی بناء پر خیرباد کہا تھا۔ وہ اس بستی کو برداشت نہیں کر سکا تھا اور بددلی کے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں تل جٹوں، کھٹملوں، جانوروں کی بدبو اور لکڑی کے مکانوں میں پوتڑوں کی عفونت اور اس جہالت کو جو ڈاکٹر کے مقابلے میں کسی مقامی عطائی کے بتائے ہوئے ٹوٹکوں کو زیادہ معتبر سمجھتی ہو، قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یہ سوچ کر ہی متلی آنے لگتی تھی کہ اسے کس طرح ایک شب تور کے اوپر گرم چیتھڑوں میں سونا اور ایک بڑے برتن میں دوسروں کے ساتھ شریک ہو کر کھانا کھانا پڑا تھا۔ نہیں! یہ دیہاتی زندگی اس کی برداشت سے باہر تھی!

"میں نے غلیظ جھونپڑیوں میں رہنے کے لئے تو ڈاکٹری نہیں پڑھی ہے۔" اس نے غصے میں کسینا سے کہا تھا۔

"مگر تم سے توقع کی جاتی ہے کہ تم اپنے آپ کو کومسومول ثابت کرو گے۔"

اس نے اس کی بات سنی ہی نہیں! اسے گھر جانا تھا، ہر قیمت پر گھر جانا تھا۔ شہر میں جہاں ہر چیز صاف ستھری تھی جہاں بجلی تھی، اور ان کا ایک فلیٹ تھا---- ابھی وہ اپنے والدین کے ساتھ رہ سکتے تھے پھر وہ اپنے لئے علیحدہ فلیٹ تلاش کر سکتے تھے۔ وہ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ کر باندھ رہا تھا۔

"تم کس بات کا انتظار کر رہی ہو۔" اس نے کسینا سے چیخ کر کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے آتشبار نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"میرا خیال ہے تم یہیں مرکھپ جانا چاہتی ہو۔ ٹھیک ہے' تم یہیں ٹھہرو۔" ان دنوں وہ جوان تھا اور مزاج میں تندی تھی۔

"یہیں رہو۔" اس نے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ دوڑتی ہوئی اس کے پیچھے آئے گی اور اسے روک لے گی۔

مگر وہ اس کے پیچھے نہیں بھاگی۔ اس نے اسے روکا بھی نہیں۔ اس نے ساری زندگی وہیں گزار دی۔ کیسنا نے اسے تین خط لکھے تھے پہلے خط میں اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس سے کہا تھا کہ وہ واپس آ جائے۔ اس نے یہ بھی تذکرہ کیا تھا کہ اس کے دن دشواریوں میں گزر رہے ہیں۔

"سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلی آؤ۔" اس نے کیسنا کو مختصر سا جواب دیا تھا اور اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ وہ ضرور آ جائے گی۔ اس نے بار بار لکھا' ایک سال تک انتظار بھی کیا لیکن وہ واپس نہیں آئی اور اس طرح سے وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔

بوڑھے نے اپنی گفتگو ختم کر دی تھی۔ پھر تعزیتی موسیقی شروع ہوئی۔ کودلیوف کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اس میں سر اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ ابھی بوڑھے نے جو کچھ کہا تھا اس کے پیش نظر وہ سوچ رہا تھا کہ ہر نگاہ اس پر مرکوز ہو گئی ہو گی' وہ ڈر رہا تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد ایک عورت رومال سے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے بتانا شروع کیا کہ کیسنا نے جو اس وقت خود ایک نازک سی لڑکی تھی کس طرح اس کی جان بچائی تھی۔ اس تذکرے میں تسلسل کا فقدان تھا مگر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے بچے کی پیدائش کے دوران سخت تکلیف اٹھانی پڑی تھی اور کیسنا ساری رات اس کے پاس موجود رہی تھی اور صبح ہوتے اس کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی تھی۔

عورت کے بعد ایک فوجی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے محاذ پر کیسنا کی خدمات کا تذکرہ کیا اور اس سے ظاہر ہوا کہ وہ فوج میں سرجن رہ چکی تھی۔ پھر ایک نو عمر لڑکی کی باری آئی جس کی زندگی کیسنا نے بچائی تھی اور اس واقعے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔

ایک بار پھر موسیقی کا آغاز ہوا۔ جنازے کے قریب کھڑے لوگوں میں حرکت شروع

ہوئی۔ پھر لوگ جنازے کو اٹھا کر چل دیئے۔ عورتوں نے کتبے اٹھائے ریشمی پردوں پر کسینا کے ساتھیوں کی طرف سے' یا ان لوگوں کی طرف سے جن کی اس نے مدد کی تھی خراج عقیدت کے کلمات لکھے ہوئے تھے ایسے ہی کچھ پردے اسکول کے بچوں نے بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ کودلیوف نے تلاش کیا مگر اسے کسینا کے خاندان والوں یا رشتے داروں کی طرف سے ایسا کوئی پردہ نظر نہ آیا۔ اس بات پر یقین کرنے کے لئے اس کا دل آمادہ نہیں تھا۔ وہ راستے میں ایک طرف سمٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ تمام گزرنے والے پردوں پر لکھی تحریر کو وہ اچھی طرح دیکھ سکے مگر اسے ایسا کوئی پردہ نظر نہ آیا جو اس کے عزیزوں کی طرف سے ہو۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے ساری زندگی تنہا گزار دی۔ پھر اسے کسی ادارے کی طرف سے ایک پردہ نظر آیا۔ "عزیز ترین ہستی رفیق کودلیو' دیا'....." اور اس وقت اس پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ کسینا نے آخر دم تک اس کا نام اپنے نام کا جز بنائے رکھا۔ اس نے کسی دوسرے کو قبول نہیں کیا---- کودلیوف کے سینے میں درد کی لہر اٹھی اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔

ایک مرتبہ پھر اس یادوں کی یلغار ہو گئی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پھر کانپتی ہوئی پلکیں اور حیرت سے تنے ہوئے ابرو آ گئے' ایک مرتبہ پھر اسے اس کے سانس کی حدت اپنے گالوں پر محسوس ہونے لگی---- "میں تم سے پیار کرتی ہوں----" وہ کہیں دور سے اسے پکار رہی تھی۔

"زندگی یہ راستہ کیسے اختیار کر لیتی ہے۔" کودلیوف کو حیرت تھی۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لڑی رواں تھی مگر اسے ان کا احساس تک نہیں تھا۔

کودلیوف اس طرح قدم اٹھاتا ہوا جیسے وہ کسی طلسم میں گرفتار ہو' ہسپتال کے صحن میں آ گیا۔ اس نے لوگوں کی سرگوشیاں ہی سنی نہ ان کی طرف توجہ دی۔ لوگ جنازہ لئے باہر نکل گئے اور وہ وہاں کھڑا رہ گیا وہ ہسپتال کے صحن میں تنہا تھا اور بہت دیر تک تنہا ہی کھڑا رہا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ہسپتال کے باہر آ گیا۔

قصبے پر پژمردگی کے بوجھل بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا سوکھے پتوں کو پیروں تلے روند رہی تھی' درخت تھر تھر کانپ رہے تھے' جیسے وہ ٹھٹھرے جا رہے ہوں۔

تخلیقی عمل میں تجربہ کی اہمیت

تخلیقی عمل میں تجربہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تجربہ فن کو تازگی اور توانائی عطا کرتا ہے۔ دوسری اصناف شاعری کی طرح اردو شاعری میں بھی ہمیشہ نت نئے تجربات کو آزمایا گیا۔ کبھی ان تجربات سے زبان لو بیان کی نئی راہیں کھلیں کبھی ہمارے معاشرہ کی روایت اور مزاج نے ان تجربات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اردو شاعری میں ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب سانیٹ کو مقبول اور نسبتاً جدید تر صنف ادب سمجھا جاتا اور ایک فیشن کے طور پر اپنایا جاتا تھا۔ اس دور میں بہت سے شاعروں نے سانیٹ کہے اور ان میں کچھ یقیناً اچھی شاعری کے زمرے میں بھی آ سکتے ہوں گے مگر مجموعی طور پر ہمارے مشرقی مزاج نے مغرب کی اس صنف ادب کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور آج سانیٹ کا محض ایک قصہ پارینہ کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

ہر نئے تجربے کی کنکری، وقتی طور پر ہی سہی فن کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہے رد و قبول کے نئے نئے زاویے تلاش کئے جاتے ہیں۔ یہی زندگی کی علامت ہے۔ پرانی اقدار کو محترم جاننے والے نئے تجربات کی خوبیوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ جب کہ جدت و جدیدیت کے دعوے داروں تجربہ کی زلف گرہ گیر میں اس طرح اسیر ہوئے ہیں کہ وہ اس تجربہ کے کمزور پہلوؤں کو بھی خوبیاں قرار دے کر قابل ستائش قرار دیتے ہیں۔

نثری نظم کی آمد سے بھی ہمارے یہاں ایک فکری ہنگامہ برپا ہوا۔ نثری نظم کیوں اور کیوں نہیں؟ دونوں طرف سے دلائل کی گرم بازاری رہی۔ اب نثری نظم پر بحث کے بجائے ہمارے بہت سے شاعروں نے سنجیدگی سے نثری نظمیں کہنا اور شائع کرانا شروع کر دیا ہے۔ نثری نظموں کے کئی مجموعے بھی سامنے آ چکے ہیں اس سلسلہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ نثری نظم کے سلسلہ میں سہل پسندی کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے وہ غلط ثابت ہو گیا ہے۔ نثری نظم کو ان شاعروں نے بھی سنجیدگی سے اختیار کیا ہے جو پابند شاعری کرتے رہے

ہیں۔ یا جنہوں نے اچھے غزل گو شاعر کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ گویا نثری نظم ردیف، قافیہ، اوزان اور بحور وغیرہ سے فرار کی راہ نہیں ہے۔ بلکہ اردو شاعری میں ایک نئے تجربہ کی بنیاد ہے۔ مگر تجربہ بذات خود کوئی مقصد نہیں ہوتا بلکہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نثری نظم کے ذریعہ ہم کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

غزل کے بعد نظم، اور نظم کے بعد نظم میں پابند اور آزاد کا تجربہ اس لئے کیا گیا کہ شاعر کو اپنے بیان کے لئے کچھ اور وسعت کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ نثری نظم کے سلسلہ میں بھی یہ بات درست ہو سکتی ہے۔ آزاد نظم کی آمد کے بعد نصف صدی گزر چکی ہے۔ اس نصف صدی میں دنیا نے بہت سی کروٹیں لی ہیں۔ اور زندگی کی پیچیدگیوں میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ اس روشنی میں اگر آج شاعر اپنے بیان کے لئے "کچھ اور وسعت" کا طلب گار ہو تو کسی کو حیرت نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ شاعر کو اپنے کلام سے بھی یہ ثابت کرنا ہو گا کہ اسے سچ مچ کچھ اور وسعت کی ضرورت تھی۔ یعنی وہ وجوہات یا جو خیال نثری نظم میں پیش کر رہا ہے۔ وہ فی الحقیقت ایسا ہے جو پابند نظم کے قالب میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر ہم محض وقتی فیشن کی پیروی نہیں کر رہے ہیں تو اسالیب اظہار کی دولت سے مالا مال ہے۔ نثری نظم کا واحد جواز یہی ہو سکتا ہے۔ نثری نظم کے شاعروں کو اس بات کا احساس بھی ہے کہ اگر وہ نثری نظم کہہ رہے ہیں تو اپنے کلام سے بھی یہ ثابت کریں کہ نثری نظم ان کی ضرورت بن گئی تھی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ اس احساس نے ان شاعروں کے یہاں ایک پیچیدہ الجھن کا روپ اختیار کر لیا ہے۔ جو شاعری میں طرح طرح کے مسائل کو جنم دے رہی ہے۔ ان مسائل میں سب سے بڑا ابلاغ کا مسئلہ ہے۔

نثری نظم کے شاعر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ نثری نظم ان کی ضرورت بن گئی تھی، تجرید اور علامتوں کا سہارا لے کر اپنے بیان کو اتنا پیچیدہ دشوار اور بوجھل بنا دیتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ان نظموں کا قاری سر کھجاتا رہ جاتا ہے۔ یا پھر اس بحث میں الجھ جاتا ہے کہ شاعر نے گھوڑے کو کس چیز کا سمبل بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ گفتگو شاعری کو بہتر طور پر سمجھنے کے نیک ارادہ سے شروع ہوتی ہے۔ مگر عموماً جب ختم ہوتی ہے یا ختم کی جاتی ہے۔ تو اس طرح کہ گفتگو کرنے والے فضا میں جلتے ہوئے گوشت بو کی خوشبو محسوس کرتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ، شاعری کا اصل مقصد یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک لمحہ کے لئے یہ سوچ لیا جائے تو

کوئی ہرج نہیں ہے کہ نثری نظم کے نام پر جو فکری ہنگامہ آرائی کی گئی اس کا مقصد کیا تھا۔ اور ایک ایسی صنف کے شاعر کو جو ہمارے قومی مزاج سے ہم آہنگ بھی ہے۔ مقبول بنانے کے لئے جو اقدامات کئے گئے ان کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

غزل ہماری مقبول ترین صنف شاعری ہے۔ ہر دور میں غزل نے اپنے عہد کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے' کبھی اس پیرائے میں بات کرنا دشوار ہوا تو شاعروں نے نظم کا سہارا لیا۔ لیکن اس میں آہنگ اور موسیقیت کا پورا لحاظ رکھا جو مشرق کے مزاج کا خاصہ ہے۔ فیض نے لب و رخسار کے مانوس استعاروں کے ذریعہ اس دور کے پیچیدہ ترین مسئلوں کو پیش کیا اور کبھی انہیں' خواہ غزل کہہ رہے ہوں یا نظم اظہار کی تنگ دامانی کا احساس نہ ہوا۔ عجز بیان کا تعلق' صنف ادب سے زیادہ' شاعر کی اپنی ذاتی صلاحیتوں سے ہوتا ہے۔ ایک بڑا شاعر بڑی بات کو مشکل ترین صنف سخن میں بھی پانی کر کے بیان کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس کم صلاحیت والے شاعر کو غزل جیسی جانی پہچانی صنف شاعری میں بھی اپنی بات کرنا دشوار ہوتا ہے۔ بات کرنے کے لئے کوئی بات ہی نہ ہو تو غزل نظم یا نثری نظم شاعر کے کس کام آئے گی۔ ہم جس شاعری کو بڑی شاعری قرار دیتے ہیں تو اس بنیاد پر کہ اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ تو میرے دل میں تھا۔

اس کے برعکس ابھی تک جو نثری نظمیں لکھی گئی ہیں انہیں پڑھ کر ایک اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظمیں ہماری نہیں ہیں اور ان کا نہ ہماری طرز معاشرت سے کوئی تعلق ہے اور نہ ان کو ہمارے مسائل سے کوئی دلچسپی ہے۔ یہ سب کی سب بدیشی لوگوں کی باتیں ہیں جو بدیشی استعاروں اور علامتوں میں ہمارے سامنے پیش کی جا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ لنڈے بازار سے خریدا ہوا تھری پیس سوٹ چاہے وہ کتنے ہی عمدہ کپڑے کا بنا ہوا ہو اور اسے کتنے ہی مشاق ٹیلر ماسٹر نے سیا ہوا' ہمارے اپنے لباس سے زیادہ ہمارے لئے مانوس اور محترم نہیں ہو سکتا۔ کیا ضروری ہے کہ ہم نئے تجربات کے لئے لنڈے بازار کی راہ اختیار کریں۔ ہم اپنے لباس میں بھی تو اپنی صناعی سے اختراعات کر سکتے ہیں۔ مگر ایسا کرنے کے لئے پہلے ہمیں اپنی اشیاء اور اپنے آپ سے محبت کرنا سیکھنا پڑے گا۔

چہار خواب ایک غلط چال

قمر جمیل کے شعری مجموعہ کا نام چہار خواب ہے۔ اس سے قبل ایک اور شعری مجموعہ جس میں قمر جمیل کا کلام شامل تھا خواب نما کے نام سے شائع ہوا تھا۔ چہار خواب میں چار ایسی نظمیں ہیں جن کے ناموں میں لفظ خواب شامل ہے۔

چہار خواب
دجلہ کے خواب
شہید پرندے کا خواب
سرو کے ایک درخت کا خواب

اس کے علاوہ ان کی نظموں میں رات' خواب اور خواب گیں فضا کا ذکر مسلسل اور تکرار کے ساتھ ملتا ہے گویا..... خواب ان کی سائیکی کا ایک نمایاں اور کلیدی پہلو ہے۔ قمر جمیل کے اس میلان کے نفسی تجزیہ کے لئے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے مگر یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ان کی شاعری میں خواب ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا جن معنوں میں بعض لکھنے والے اس وقت استعمال کرتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ میری آنکھیں آنے والی دنیا کے خواب دیکھ رہی ہیں قمر جمیل کے یہاں خواب بیداری اور خرد مندی کی ضد کے طور پر آیا ہے۔

چہار خواب نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ حصہ نظم کو اپنی آسانی یا بہتر تفہیم کی خاطر ہم مزید تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی پابند نظمیں' آزاد نظمیں اور نثری نظمیں۔

چہار خواب کا آغاز پابند نظموں سے ہوتا ہے اس حصے میں چہار خواب' دجلہ کے خواب' ایک منظر' میری محبت چاہتی ہے' آخری سلام اور ایک قدرے طویل نظم "نیل کا سیلاب" شامل ہیں۔ اس حصے کی بیشتر نظموں کو پڑھ کر ابن انشاء کی نظمیں یاد آتی ہیں غالباً اس وجہ سے کہ ان نظموں اور چاند نگر میں شامل نظموں میں اسلوب و بیان کی ایک واضح

مماثلت موجود ہے۔

ان پابند نظموں کا موضوع ہمارا ماضی مرحوم ہے اور ماضی کو دیکھنے اور بیان کرنے کے دو طریقے ہوتے ہیں پہلا یہ کہ ہم ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا تجزیہ کریں اور اس سے حاصل شدہ نتائج کی روشنی میں اپنے حال اور مستقبل کے راستے کا تعین کریں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم ماضی کی عظمتوں کے گن گائیں اور اپنے اندر سربلندی اور سرفرازی کا ایک جھوٹا احساس بیدار کر کے عظمت کی نیند میں غلطاں ہو جائیں قمر جمیل کی یہ نظمیں ایک ایسا ہی الف لیلوی اور سحرکار ماحول پیدا کرتی ہیں۔

نیل کا سیلاب کے ابتدائی چند اشعار ہیں۔ ؎

یہ محل یہ نقیب یہ خدام
اور یہ شمعدان یہ گلفام
سائے کی طرح شمعدان کے ساتھ
ایستادہ و دست بستہ غلام
نیلگوں پیرہن میں خواجہ سرا
پردہ در پہ ارغوانی جام
نقش دیوار مانی و بہزاد
پابہ زنجیر رستم و بہرام

اور یہ نظم اسی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک سحر خیز ماحول ہے اور اس سحر خیز ماحول کا شاعرانہ بیان ہے مگر اس نظم کو پڑھتے ہوئے قاری کا ذہن سوچتا ہے کہ آگے چل کر یہ نظم فکر کا کوئی نیا موڑ کاٹے گی۔ اور دربار شاہی کی اس ظاہری خوبصورتی اور چترکاری کے پس منظر میں۔ کوئی نہ کوئی ایسی حقیقت سامنے آئے گی جس سے زندگی کی معنویت اور مقصدیت میں اضافہ ہو گا مگر ایسا نہیں ہوتا نظم اپنی یکساں چال سے چلتی رہتی ہے۔ اور اس کے اختتامی اشعار ہیں۔ ؎

جنگجو بستیوں میں شہروں میں!
کوہساروں میں خیمہ زن جیسے
اڑ رہے ہیں ہواؤں میں پرچم

ناگ لہرا رہے ہوں پھن جیسے
کوہ و صحرا میں زلزلے بے چین
آسمانوں میں اہر من بے تاب
تخت میزان سیف ظل اللہ
اور دریائے نیل کا سیلاب

خواب اور خوا بگیں ماحول قمر جمیل کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور اسی خصوصیت کے باوصف نیل کا سیلاب ان کی ایک ایسی نمایاں نظم ہے جس کا بنیادی تاثر "پدرم سلطان بود" ہے۔

مگر نیلام گھر کے طارق عزیز کے الفاظ میں قمر جمیل کی وجہ شہرت "نثری نظم" ہے چنانچہ کسی بھی قاری کا سب سے پہلے ان کی نثری نظموں کی طرف متوجہ ہو جانا ایک فطری عمل ہو گا۔

چہار خواب میں نثری نظموں کا حصہ جس نظم سے شروع ہوتا ہے اس کا عنوان ہے "جنگلی لڑکیوں کے نام" یہ عنوان پڑھتے ہی کسی اجنبی اور غیر مانوس چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ذرا سا غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جنگلی لڑکیوں پر ہمارا ذہن ٹھٹکا تھا۔ اس خیال کے پیش نظر قمر جمیل کی نظموں پر نظر ڈالنی شروع کی تو ایسے بہت سے الفاظ تراکیب و استعارے سامنے آئے۔ میں چند مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا۔

نیگرو گھاس پر پھل کھا رہے ہیں۔
غیر انسانی سائیکلوں' البانی آسمانوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔
خانہ بدوش لڑکی' جپسی گرل
زیتون کا درخت' سپر مارکیٹ
میری ماں جنت میں خدا کا گیت گا رہی ہے۔
خان اعظم کا سایہ دیواروں پر دوڑتا ہے۔
مسولینی کی بانہوں میں اٹالین لڑکیاں حبشی کو گھورتی ہیں۔

کیا یہ تمام لائنیں یا لائنوں کے جز جو اوپر بیان کئے گئے اظہار کی ضرورت تھے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کوئی شاعر اپنے لوگوں اور اپنے ماحول سے کٹ کر کسی دور دیس کے ایسے مناظر اور ماحول کو اپنی شاعری کا حصہ بنا لینا چاہتا ہے۔ جن تک اس کی یا اس کے قاری کی

رسائی ناممکن ہو بلکہ خود شاعر بھی وہاں تک غیر ملکی شاعری یا ان کے تراجم کے وسیلے سے پہنچا ہو۔

قمر جمیل کی شاعری میں ایسے الفاظ تراکیب اور استعاروں کی کمی نہیں ہے جنہیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے غیر ملکی شاعری کا خاصہ مطالعہ کیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وہ غیر ملکی شاعری ان کی ذات کا حصہ نہیں بن سکی ہے بلکہ غیر منہضم حصے جوں کے توں ان کی فکر کے بطن سے واپس چلے آ رہے ہیں۔

اردو میں نثری شاعری کا المیہ یہ ہے کہ اسے اپنے جواز کی خاطر یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ جن خیالات یا کیفیات کے اظہار کے لئے نثری نظم کے وسیلے کو استعمال کیا گیا ہے ان کو کسی پابند صورت میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ پیچیدگی' الجھاؤ اور دور کی کوڑی لانا نثری نظم کا بنیادی جوہر قرار پایا۔ قمر جمیل نثری نظم کے بہت بڑے چیمپئن رہے ہیں۔ انہوں نے نثری نظم کو کم اور نثری نظم سے تعلق رکھنے والی کبھی کبھی بامقصد اور اکثر اوقات لایعنی بحث کو فروغ دینے میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ قمر جمیل کے اس کردار کو روشنی میں چہار خواب میں شامل نثری نظموں کو اشتیاق اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہئے تھا۔ اور ہونا یہ چاہئے تھا کہ اس مجموعہ میں شامل نثری نظمیں فکر و بیان کے اس بلند مقام پر فائز دکھائی دیتیں جس سے نثری نظم ایک صنف سخن کے طور پر اپنا معیار قائم کر لیتی مگر ایسا ہوا نہیں۔ بات سمجھ میں آئے تو اس کے حسن و قبح پر بات ہو سکتی ہے مگر کسی بھی لایعنی تحریر کے بارے میں خواہ اسے نثری نظم ہی کہہ کر کیوں نہ پیش کیا جائے آپ زیادہ دیر تک گفتگو نہیں کر سکتے میں حوالے کے طور پر صرف دو مختصر نظموں کا ذکر کروں گا۔ پہلی نظم ہے گھوڑے۔۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم
ٹاہلی کے باغوں میں اس طرح
کھلے ہوئے ہیں جیسے
ایک ٹہنی پہ دو گلاب

گھوڑا ایک چوپایہ ہے وہ حسن تناسب اور توانائی کی علامت اور دوستی اور وفا شعاری کا استعارہ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ درست مگر آپ اس نظم کی کس طرح تفہیم کریں گے؟

دوسری نظم ہے "چڑیاں اس کی بہترین مثال ہے"

علاقائی تنگ نظری سے

بچنا چاہئے۔

چڑیاں اس کی بہترین مثال ہیں۔

اول تو چڑیوں کے علاقائی تنگ نظری سے بچنے کی بابت جو کچھ کہا گیا ہے وہ اتنا زیادہ درست نہیں ہے کہ بعض چڑیاں بھی بڑی شدت سے علاقائی تنگ نظری پر کاربند ہوتی ہیں مگر اس جملہ معترضہ سے قطع نظر یہ ایک ایسی نظم ہے جس میں ذرا سی لفظی تبدیلی کر دی جائے تو ہر چند کہ مضمون قطعی طور پر تبدیل ہو جاتا ہے مگر اس کی صداقت اپنی جگہ اتنی ہی مسلم رہتی ہے مثلاً یہ نظم یوں بھی تو ہو سکتی ہے۔ ؎

گروہی تنگ نظری میں

پھنسنا چاہئے۔

چڑیاں اس کی بہترین مثال ہیں۔

قمر جمیل نثری نظم کے حوالے سے جتنے بلند بانگ دعوے کرتے رہے تھے ان کی روشنی میں اگر ان کے مجموعہ کلام میں شامل نثری نظموں کو دیکھا جائے تو بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہوٹلوں اور احباب کی محفلوں میں بیٹھ کر وہ نثری نظم' اس کی ماہیت' جواز اور امکانات پر کُن ہے اچھی گفتگو کر لیتے ہیں مگر اچھی نظم کہنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

چہار خواب کے مطالعہ سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قمر جمیل تو بیچارے سیدھے سادے غزل کے شاعر ہیں۔ غزل ہی وہ صنف سخن ہے جہاں ان کے تخلیقی جوہر' وہ جتنے بھی ہیں کھل کر سامنے آتے ہیں اس مجموعے میں ایسی کئی غزلیں ہیں۔ جن کو اس دور میں کہی جانے والی اچھی غزلوں کا ہمسر قرار دیا جا سکتا ہے مگر بات یہ ہے کہ غزلوں پر صرف قمر جمیل ہی کی تو اجارہ داری نہیں ہے پاکستان میں اچھی غزل کہنے والے اتنے شاعر موجود ہیں کہ صرف ان کے نام گنوانے کے لئے ہی کئی صفحات درکار ہوں گے اتنے بہت سے غزل کہنے والوں میں قمر جمیل کس مقام پر ٹھہرتے ہیں بنیادی سوال یہ ہے اور خاص طور پر اسی پس منظر میں کہ جذبے اور تجربے کی صداقت یا حسن بیان کی ندرت کے اعتبار سے اس عہد میں بھی متعدد غزل گو شاعر اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ہزارہا بکھرے ہوئے اشعار کے درمیان بھی شیر افضل جعفری کا شعر سب سے الگ اپنی ایک جداگانہ پہچان رکھتا ہے اور جذبے اور تجربے کی صداقت کے اظہار میں ثروت حسین اور پروین شاکر کی غزل کا شعر قمر

جمیل کا ہمسر نہیں ان سے بہت آگے دکھائی دیتا ہے۔

قمر جمیل کو ادب کے زینے کی نچلی سیڑھیوں پر بیٹھنا پسند نہیں تھا چنانچہ انہوں نے اپنے مطالعے اور زیرکی کے زور پر مختلف نوعیت کے لایعنی بحثوں کی بساط بچھائی تاکہ ذہن کی پوری فضا ہی گرد آلود ہو جائے۔ انہوں نے طرح طرح کے شعبدے دکھائے اور وقتی طور پر لوگوں کو متوجہ بھی کیا اور متحیر بھی کیا مگر اس کھیل میں..... بالاخر وہ ایک غلط چال چل گئے۔ "چہار خواب" ان کی غلط چال ہے۔ اس غلط چال کے چلتے ہی ان کی وہ بازی جسے شاید وہ ابھی کچھ دیر اور چلا سکتے تھے یقینی طور پر مات ہو گئی۔

ساحر کی شاعری---ایک رخ

ساحر لدھیانوی کی شاعری کو اگر ایک لفظ میں سمیٹا جائے تو وہ احتجاج کے نام سے موسوم کی جا سکتی ہے اور احتجاج بھی ایسا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہمہ گیر بھی ہے اور ہمہ جہت بھی! کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ساحر نے معاشی ناہمواری سے پیدا ہونے والے مسائل کو ہی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ یہ خاصی گمراہ کن رائے ہے۔ ساحر نے انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی ہر نوع کے خلاف احتجاج کیا ہے اس میں غالب عنصر بلاشبہ معاشی ناہمواری کا ہے کیونکہ اس کے خیال میں تمام برائیوں کا سرچشمہ ہی ایک برائی ہے۔

ساحر لدھیانوی کے شعری سفر کا آغاز ہماری تاریخ کے اس موڑ سے ہوتا ہے جہاں ہمارا معاشرہ دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں سے گزرتا ہوا شکست و ریخت کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں ایک جہان کہنہ دم توڑ رہا تھا اور ایک نئی دنیا کا رخ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اس نئی دنیا کی تعمیر کے فکری محاذ پر جو لوگ ہراول دستے میں شامل تھے۔ ساحر لدھیانوی کا نام بلاشبہ ان میں ایک محترم نام ہے۔

ساحر آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے اس دستے میں شامل تھے جس نے برصغیر کے خوابیدہ معاشرے کو بیدار کر کے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ آزادی کا مقصد اور مفہوم محض بدیسی حکمرانوں کے جبر و استعداد سے چھٹکارا حاصل کر لینا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی فضا کا قیام بھی ہوتا ہے جہاں طائر فکر کی پرواز میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ساحر کے نزدیک آزادی کی نعمتوں سے اس وقت تک فیضیاب نہیں ہوا جا سکتا جب تک یہ آزادی زندگی کے تمام شعبوں میں رچ بس نہ گئی ہو اور جب اس کا احساس ہمارے جسد قومی میں خون کی طرح گردش نہ کرتا رہتا ہو ایسی مکمل آزادی کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سیاسی تہی دستی سے چھٹکارے کے ساتھ ساتھ قدیم رسم و رواج اور کہنہ روایات کی جکڑ بندیوں سے بھی نجات حاصل کی جائے۔ بدیسی آقاؤں سے آزادی حاصل کرنا ایک دشوار عمل تھا مگر اس سے بھی دشوار تر عمل خود اپنے اوہام اور معاشرے کی فرسودہ روایات سے آزادی حاصل کرنا تھا۔

ساحر نے آزادی وطن کے ساتھ ساتھ استحصال سے پاک معاشرے کی تشکیل کی جدوجہد بھی اپنے اوپر فرض کر لی اور زندگی بھر اس مقصد کے لئے لڑتا رہا۔

ساحر لدھیانوی کو ایک ایسی متجسس نگاہ ملی تھی جو اشیاء کو ان کی ظاہری شکل و صورت میں قبول نہیں کرتی تھی۔ وہ چہروں پر پڑے ہوئے زر کار اور رنگیں نقابوں کے پیچھے چھپے ہوئے خدوخال کی تلاش میں رہتا تھا اور جب دھکتے ہوئے پردوں کے پیچھے سسکتی ہوئی انسانیت کے زخموں کو دیکھتا ہے تو کوئی مصلحت اسے بلند آہنگ احتجاج سے نہیں روک سکتی تھی۔ نرس کی زد پر اگر خود اس کی اپنی ذات بھی آ جاتی تھی تو وہ رعائت سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس نے ایک جاگیردار کے گھر میں جنم لیا تھا۔ وہ جاگیردار باپ کا واحد وارث تھا مگر اپنی نظم "جاگیردار" میں وہ اس طبقے کا انتہائی حقارت کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے۔ ؎

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعت ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

اسی طرح تاج محل دنیا کے لئے محبت کی حسین یادگار ہے ٹیگور نے اسے عشق کی آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو قرار دیا ہے مگر ساحر لدھیانوی نے جب تاج محل پر نظم کہی تو اس عظیم اور خوبصورت عمارت کی بنیاد میں دفن محروم روحوں کا نوحہ بن گئی۔ ؎

میری محبوب انہیں بھی تو محبت ہو گی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل

ساحر کی شاعری میں ایک ایسا ہی بلند آہنگ احتجاج اس ناانصافی، جبر اور ظلم کے خلاف بھی ہے جو ہندوستانی معاشرے میں صدیوں سے عورت کے خلاف روا رکھا گیا ہے۔

ساحر کی شاعری اس اعتبار سے ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ ولی دکنی سے موجودہ عہد تک پوری اردو شاعری میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی جہاں عورت کی مظلومی اور محرومی کو اس قدر درد مندی سے شعری قالب میں ڈھالا گیا ہو کہ وہ ایک علیحدہ باب کی صورت

اختیار کر جائے۔

عورت کے حسن و جمال کے قصیدے تو بے شمار تحریر کئے گئے۔ اس کے ہجر و وصال کی داستانوں کے لئے دفتر کے دفتر سیاہ کر دیئے گئے مگر یہ خاصی دلچسپ اور حیرت انگیز بات ہے کہ محبوب کے لئے آسمان سے تارے توڑ کر لانے کا دعویٰ کرنے والوں نے کبھی ان کی ذات کی پہنائیوں جھانک کر ان کی روح کے زخموں کو دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ ایسی صورت میں ان کو ان زخموں پر ہمدردی اور غمگساری کا پھاہا رکھنے کی توفیق تو بھلا کیا ہوتی۔

ساحر نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی تھی وہ ایک جاگیرداری معاشرہ تھا اس میں عورت کے حقوق کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ عورت ماں' بہن اور بیوی ہر روپ میں مجبور اور مظلوم تھی۔ اس معاشرے میں ہندو تہذیب کے اثرات نمایاں تھے اور یہ وہ تہذیب تھی جس میں زندگی بھر داسی بن کر مرد کی خدمت کرنا اور شوہر کے مرجانے کے بعد اس کے ساتھ چتا میں مرنا عورت کا مقدر تھا۔ یہ معاشرتی روایات ایک طرف اور دوسری طرف ساحر کا ایک جاگیردار کے گھر میں پیدا ہونا۔ مگر ساحر کا جاگیردار کے گھر میں پروان چڑھنا کچھ ایسا ہی ثابت ہوا جیسے موسیٰ کا فرعون کے گھر میں پرورش پانا۔ جاگیرداری کا زہر ساحر کی فکری زندگی کے لئے تریاق بن گیا۔

ساحر کے جاگیردار باپ نے گیارہ شادیاں کیں تھیں مگر جاگیر کے وارث سے محروم تھا۔ ساحر اس جاگیر کا واحد وارث تھا اس کے باوجود اس کی ماں اور اس کے باپ کے درمیان اختلافات ہو گئے۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ طلاق ہوئی تو ساحر کی سرپرستی اور اس پر اپنا حق ملکیت جتانے کے لئے جاگیردار باپ عدالت میں چلا گیا مگر ساحر نے کمسنی کے باوجود ایک انقلابی فیصلہ کیا۔ اس نے باپ کے گھر کے عیش و آرام کو ٹھوکر مار کر ماں کی تنگدستی اور بدحالی کو گلے لگا لیا۔ باپ اس سے ناراض ہو گیا اور اس کی تعلیم کے اخراجات کے لئے بھی ماں کو محنت مزدوری کرنی پڑی۔ غالباً یہی وہ پس منظر ہے جس نے ساحر کے دل پر عورت کی عظمت کے لازوال نقش کندہ کر دیئے۔ اس نے اپنی ماں کے احسانات کا صلہ اس طرح چکانا چاہا کہ وہ زندگی بھر دنیا کو عورت کی عظمت کا درس دیتا رہا۔ اس کی آنکھ زندگی بھر عورت کی مظلومیت اور بیکسی پر اشکبار رہی۔ وہ چاہتا تھا کہ معاشرے میں عورت کو اس کا جائز مقام ملے اور اس کو گھر کے اندر محبت اور گھر سے باہر احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائے۔

عشق میں انسان خود غرضی کی سطح تک اتر آتا ہے محبوب کی مجبوریاں بھی اسے

ڈھکوسلے دکھائی دیتی ہیں مگر ساحر نے عشق میں بھی عورت کی مظلومیت اور بیچارگی کا پاس رکھا اور جب اس نے دیکھا کہ اس عورت کی راہ میں جسے وہ اپنی زندگی کا رفیق بنانا چاہتا ہے۔ کچھ ایسی دشواریاں ہیں جن کو دور کرنا اس کے بس میں نہیں ہے تو وہ اپنا غم بھول کر اس کی غمگساری کرنے لگا۔ ؎

مرا تو کچھ بھی نہیں ہے میں رو کے جی لوں گا
مگر خدا کے لئے تم اسیر غم نہ---- رہو
ہوا ہی کیا جو زمانے نے تم کو چھین لیا
یہاں پہ کون ہوا ہے کسی کا سوچو تو
مجھے قسم ہے مری دکھ بھری جوانی کی
میں خوش ہوں میری محبت کے پھول ٹھکرا دو
(کسی کو اداس دیکھ کر)

ایک دوسری نظم میں وہ اپنی محبوب کو اس طرح دلاسہ دیتا ہے۔ ؎

تو میری جان مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہانگیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ میں زنجیر نہیں

چکلے معاشرے کے بدنما داغ ہیں۔ ان کے بارے میں یوں تو بیشتر لکھنے والوں نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ مگر ساحر کی نظم میں جو کاٹ ہے۔ اس کے لہجے میں جو جھنجھلاہٹ ہے اس سے ساحر کے دل میں اس طبقے کے لئے چھپی ہوئی ہمدردی کے ساتھ ساتھ عورت کی تذلیل پر شدید کرب و بے چینی اور احساس شرمندگی کا بھی بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ ؎

تعفن سے پر نیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں

ساحر کی شاعری میں عورت کے دکھوں کے مختلف رنگ جدا جدا بھی نظر آتے ہیں اور ان رنگوں سے بنی ہوئی ایک مکمل تصویر بھی! ساحر کی شاعری میں اس نظم کو مکمل تصویر کی حیثیت حاصل ہے۔

عورت نے جنم دیا مردوں کو مردوں نے اسے بازار دیا
جب جی چاہا مسلا کچلا جب جی چاہا بازار دیا
جن سینوں نے ان کو دودھ دیا ان سینوں کا بیوپار کیا
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا اس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن پر آئے کونپل بن کر اس تن کو ذلیل و خوار کیا
عورت نے جنم دیا مردوں کو.....
عورت سنسار کی قسمت ہے پھر بھی تقدیر کی بیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بدقسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو.....